خلیل احمد حامدی

ترکی — قدیم وجدید

(رودادِ سفر)

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔ ڈھاکہ

ترکی — قدیم و جدید

(رُوداد سفر)

خلیل احمد حامدی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور (مغربی پاکستان)

طابع اخلاق حسین، ڈائرکٹر
ناشر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور
مطبع ایورگرین پریس - لاہور

اشاعت

اوّل مارچ ۱۹۷۲ء ۱,۰۰۰

قیمت ـــــــ -/۸ روپے

فہرست عنوانات

دیارِ سلاجقہ و رومی

انقرہ کو واپسی

فہرست تصاویر

بسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم

یہ کتاب-----

ترکی کے متعلق ہمارے یہاں بہت کم لٹریچر موجود ہے۔ خاص طور پر جدید ترکی کے بارے میں تو ہماری معلومات تقریباً صفر ہیں۔ صدیوں سے ترکی سے جو ہمارے برادرانہ تعلقات ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ہم اس عظیم ملک کے متعلق، جو کبھی عالمِ اسلام کی قیادت کے منصب پر فائز تھا زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں ہم نے ترک بھائیوں سے جس والہانہ محبت کا ثبوت دیا تھا، وہ صفحاتِ تاریخ پر پوری طرح ثبت ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ترک بھائیوں نے جو ہماری مدد کی ہے اُسے ہم کبھی بُھلا نہیں سکتے۔ پھر میثاق استنبول کے ذریعہ پاکستان اور ترکی میں جو گہرے اور برادرانہ روابط قائم ہیں ان کی بنا پر بھی ہمیں اپنے اس حلیف اور برادر ملک کے بارے میں پوری طرح باخبر ہونا چاہیئے۔

ہماری ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ ترک بھائیوں کے بارے میں ایک ایسی کتاب شائع کریں جو مستند بھی ہو اور جدید ترین معلومات سے لبریز ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ دیرینہ خواہش اب پوری ہوگئی ہے۔

۱۹۶۸ء کے اواخر میں ہمارے محترم دوست خلیل احمد حامدی صاحب ترکی تشریف لے گئے اور اپنے اس تاریخی سفر کی رُوداد کو صفحاتِ قرطاس پر منتقل کردیا۔

کہنے کو تو یہ صرف ایک سفرنامہ ہے لیکن دراصل یہ جدید و قدیم ترکی کی ایک مختصر تاریخ

ہے جس میں خلافت عثمانی کے خاتمہ کے اسباب وعوامل کا نہایت تلاش و تحقیق سے جائزہ لیا گیا ہے اور جدید ترکی کی تعمیر میں جو محرکات وعوامل شامل تھے ان کو نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس وقت ترکی میں اسلامی اور غیر اسلامی افکار واذہان کے درمیان جو کشمکش جاری ہے اس کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خلافت اسلامیہ کے آخری مرکز میں، جس پر کبھی سارے عالم اسلام کی نظریں جمی ہوئی تھیں، احیائے اسلام کی تحریک جن خطوط پر استوار ہو رہی ہے ان کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

پھر جن اہم مقامات پر آپ تشریف لے گئے وہاں کی تاریخی حیثیت پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح یہ سفرنامہ ایک اہم تاریخی اور معلوماتی دستاویز بن گیا ہے۔ جو حضرات عالم اسلام سے عموماً اور ترکی سے خصوصاً دلچسپی رکھتے ہیں اور وہاں کے حالات و تحریکات سے پوری طرح باخبر رہنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ کتاب بیش بہا معلومات فراہم کرے گی۔

اہم تاریخی مقامات کی نادر تصاویر نے اس کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف عصری معلومات بہم پہنچانے میں ممد و معاون ہو گی بلکہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے ایک اہم رہنما کتاب بھی ثابت ہو گی۔

اس کتاب کو ہم اپنے روایتی معیار پر شائع کر رہے ہیں، اُمید ہے کہ قارئین اس کو پسند فرمائیں گے۔

لاہور ۱۰ر شعبان ۱۳۹۱ھ
مطابق ۹ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

اخلاق حسین
ڈائرکٹر، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

سفر ترکی کی رُوداد

۱۲ر نومبر ۱۹۶۸ء تا ۷ ،۲ر دسمبر ۱۹۶۸ء


نقشہ ترکی
سوویت یونین
بحیرہ آزوف
کریمیا
رومانیا
یوگوسلاویا
بلغاریہ
بحر اسود
سوویت یونین
سوویت یونین
یونان
بحر ایجین
انقرہ
سیواس
قونیہ
قیصری
ایران
عراق
شام
قبرص
بحر متوسط ابیض

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقصدِ سفر

سلجوقیوں اور عثمانیوں کی تاریخ اسلامی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے۔ ایشیائے کوچک میں جب سلاجقۂ روم[1] کے بعد عثمانیوں نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی تو اسلام کا کاروانِ حق نہ صرف ایشیا اور افریقہ کے اندر جادہ پیما ہوا بلکہ یورپ کی وادیوں میں بھی اُس نے قدم رکھے اور ویانا کی فصیلوں تک اُس کے جرسوں کی صدا بلند ہوئی۔ راقم الحروف نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے) کی رفاقت میں عربوں کو تو بارہا دیکھا ہے اور عربوں کی موجودہ تاریخ کا مفصّل مطالعہ کیا ہے، مگر سلاطینِ آلِ عثمان کے گہوارہ کو دیکھنے کا ابھی تک

---

[1] عثمانی سلاطین سے پہلے ایشیائے کوچک پر سلجوقیوں کا ایک خاندان حکمران رہا ہے جو سلاجقۂ روم کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کا زمانۂ حکومت ۱۰۷۷ء سے لے کر ۱۳۰۸ء تک رہا ہے۔ یعنی پانچویں صدی ہجری کے رُبع آخر سے لے کر ساتویں صدی ہجری کے اختتام تک۔ ان کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی اور وہ سلاجقہ کے بعد بیسویں صدی عیسوی تک کوسِ حکمرانی بجاتے رہے۔

موقع نہ مِل سکا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ اور تہذیب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی معاشرتی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے اور اُس کے آثار و دیار کو دیکھا جائے۔ عربوں کو چونکہ ہم نے خوب دیکھا ہے اور ہر علاقے کے عربوں کے قومی مزاج اور جداگانہ اجتماعی رنگ ڈھنگ کا مشاہدہ کیا ہے اس وجہ سے اُن کی تاریخ اور ان کے مسائل کے بہت سے ایسے گوشے جو محض غائبانہ واقفیت کی بنا پر واضح نہیں ہو سکتے تھے ہمارے لیے اُن کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ عثمانیوں[۱] اور

---

[۱] ترکوں کے بجائے "عثمانیوں" کی اصطلاح دانستہ استعمال کر رہا ہوں۔ ترک دوستوں نے مجھے بتایا کہ اس وقت اہلِ دین اور لادین عنصر کے اندر جو کشمکش برپا ہے اُس کی وجہ سے بعض اصطلاحات میں بھی امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔ لادین عنصر ترک ملت اور ترک مفادات کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اہلِ دین عنصر مسلم ملت یا عثمانی قوم کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ عثمانی کی نسبت بھی دراصل ترکوں کی مورثِ اعلیٰ عثمان کی طرف ہے جو اَرطغرل کا بیٹا تھا۔ یہ اَرطغرل بھی سلاجقہ ہی کے ابنائے عم میں سے تھا اور ترکانِ غز (جن کا اصل وطن ماوراء النہر کے اُس پار تھا) کی طرف منسوب تھا۔ اس کا قبیلہ ماوراء النہر سے ہجرت کر کے ایشیائے کوچک کے شمال مغرب میں آباد ہو گیا۔ رومی سلاجقہ نے جو اُس وقت یہاں کے حکمران تھے، اَرطغرل کی جوانمردی، شجاعت اور جفاکشی کی بنا پر اسے چند علاقے جاگیر میں دے دیئے۔ اور جب سلاجقہ کے اندر ضعف اور زوال کے آثار اُبھرنے لگے تو اُس نے بڑھ کر سلطنت کی زمام سنبھال لی۔ اَرطغرل کے بعد اس کے بیٹے عثمان نے صحیح معنوں میں اس سلطنت کا تشخص قائم کیا۔ چنانچہ یہ سلطنت بعد میں اُسی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئی۔ عثمان خود بڑا مجاہد اور خدا پرست

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

عربوں کی تاریخ کا دھارا کم از کم ۵ سو سال تک مشترک رُخ پر بہتا رہا ہے۔ سلطان سلیمان قانونی (۱۵۳۴ء) کے فتح بغداد سے لے کر سلطان عبدالحمید ثانی (۱۹۰۹ء) کی معزولی تک دونوں قوموں کی تاریخ ایک ہی قالب میں ڈھلتی رہی ہے۔ اِس لیے عربوں کی تاریخ کا ہمہ پہلو جائزہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک عثمانیوں کی تاریخ، ان کی تہذیب اور ان کے آثار و دیار سے مکمل براہِ راست واقفیت نہ ہو۔ علاوہ بریں ترکی قوم بجائے خود بھی اسلامی دنیا کی ایک نہایت اہم قوم ہے جس کا بناؤ اور بگاڑ پوری دنیا کے مسلمانوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس بنا پر بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اس قوم کو قریب سے دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس وقت اس کے اندر کیا رجحانات کار فرما ہیں۔ اسی احساس کے تحت مدت سے یہ خواہش تھی کہ ترکی کا سفر کیا جائے اور عثمانی ترکوں کے مراکز اور تہذیبی باقیات کو دیکھا جائے۔ یہ جذبہ بیکتا رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اِس سال رمضان المبارک کے اندر اِسے بروئے کار لانے کا موقع فراہم کر دیا۔

سعودی عرب میں چند روز

۱۲ نومبر ۶۸ء کو راقم الحروف ایک صحافی وفد کے ہمراہ، جسے سعودی عرب کی

(بقیہ حاشیہ ص۱۸ سے) انسان تھا۔ اُس نے اس سلطنت کی بنیادیں جہاد فی سبیل اللہ اور اشاعت اسلام کے اصولوں پر قائم کیں۔ چنانچہ تاریخ نے اُسے غازی عثمان کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ لقب درحقیقت اُسے اپنے عہد کے شیخ الصوفیہ کی طرف سے اہل اللہ کے ایک بہت بڑے اجتماع میں دیا گیا تھا۔

وزارتِ اطلاعات نے دعوت دی تھی، جدّہ روانہ ہوُا اور ۱۲ر سے ۲۴ر نومبر تک اس وفد نے جدّہ، مکہ معظمہ، مدینہ منوّرہ، طائف اور ریاض کا دَورہ کیا۔ اس سفر میں عمرہ اور زیارتِ مدینہ منوّرہ کے ساتھ ساتھ ہم نے بعض سعودی اداروں کو بھی دیکھا۔ اس کے بعد وفد کے دوسرے ممبر کا، تو پاکستان واپس ہو گئے اور مَیں چند روز مزید سعودی عرب میں گزارنے کے بعد ۱۴ر دسمبر ۷۸ء کو ریاض سے بیرُت کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے اس سفر کی اصل منزل لندن تھا۔ مَیں مولانا مودودی کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ رابطۂ عالمِ اسلامی کے جنرل سیکرٹری شیخ محمّد صرور الصّبان، امیر عبداللہ بن عبدالرحمان (جو شاہ فیصل کے چچا ہیں) اور بعض دوسرے ذمّہ دار سعودی دوستوں کی خواہش تھی کہ مولانا محترم اگر ہمّت پائیں تو پاکستان واپس جاتے ہوئے حجاز رُکیں اور عمرہ اور زیارت سے مشرّف ہوں۔ بلکہ سعودی عرب کی وزارتِ تعلیم کی طرف سے بھی یہ دعوت تھی کہ مولانا محترم ریاض یونیورسٹی میں کم از کم ایک تقریر ضرور کریں۔ وزارتِ تعلیم کے ڈائرکٹر کے الفاظ یہ تھے کہ "الاستاذ یوفر الکلام لیصرفہ فی الریاض" (مولانا محترم گفتگو بچا کر رکھیں تاکہ اُسے ریاض میں صَرف کریں)۔ میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ مَیں ان حضرات کی خواہش کو مولانا محترم کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ اِسی دعوت نامہ کو لے کر مَیں ریاض سے ترکی اور پھر وہاں سے لندن جانا چاہتا تھا مگر کچھ ایسی رُکاوٹیں راستے میں حائل ہو گئیں کہ مَیں لندن پہنچ کر مولانا محترم کی خدمت میں اُن کی روانگی سے قبل یہ دعوت بالمشافہ پیش نہ کر سکا اور ترکی ہی میرے سفر کی آخری منزل ثابت ہوُا۔

بیروت میں مختصر قیام

۵ اردسمبر کی رات بیروت میں گزاری۔ سردی سخت تھی مگر خوشگوار۔ مفتی اعظم فلسطین محمد امین الحسینی صاحب نے بیروت میں اپنا مہمان ٹھہرالیا۔ مفتی صاحب خود تو بیروت شہر کے ایک کنارے سے محلہ قُرن الشباک میں رہتے ہیں مگر انھوں نے میرے قیام کے لیے خود ہی بیروت کے ہوٹل "لوکاندا امریکہ الکبرٰی" کو تجویز کیا۔ میرے پیشِ نظر بیروت کا "العربی" ہوٹل تھا۔ مگر مفتی صاحب نے کہا کہ لوکاندا امریکہ زیادہ صاف ستھرا ہے۔ "صاف ستھرا" سے مراد کمروں اور بستروں کی صفائی نہیں بلکہ اخلاقی صفائی ہے۔ بیروت کے ہوٹل اخلاقی صفائی سے بالعموم محروم ہیں۔ صرف ہوٹل ہی کیا پورا شہر اخلاقی فساد میں مبتلا ہے۔ مولانا محترم فرمایا کرتے ہیں کہ "بیروت مرحاض البلاد العربیۃ" (بیروت عرب ممالک کا بیت الخلاء ہے)۔ مولانا محترم کی یہ مثال بالکل برحق ہے۔ ہمارے عرب دوست اس مثال کو اکثر دُہرایا کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ امام[1] اوزاعی کا یہ شہر جو طبعی جمال اور جغرافیائی حُسن کی نعمت سے مالا مال ہے، اخلاقی پستی میں بُری طرح گر چکا ہے۔ بلکہ اُس کی

---

[1] امام اوزاعی رحمہ اللہ جو امام اہل الشام کہلاتے تھے بیروت میں مدفون ہیں۔ آپؒ کی قبر مبارک ساحلِ سمندر پر ہے اور عین اُن مراکز کی بغل میں ہے جہاں مرد وعورت ننگے نہلتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا نام امام اوزاعیؒ ہے اور عیاشی اور بدکاری کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ سُن کر بڑا دُکھ ہوا کہ یہ علاقہ امام موصوف کے نام سے منسوب ہے۔

اخلاقی غلاظت کے چھینٹے دُور دُور تک پہنچ رہے ہیں اور ارد گرد کے تمام عرب ممالک اُن سے ملوّث ہو رہے ہیں۔ ترکوں اور عربوں کی نسلی جنگ میں بھی اس شہر نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا، اور موجودہ عرب اسرائیل جنگ کی تہ میں بھی بیروت کے مفاسد کا گہرا دخل ہے۔

مفتیٔ اعظم فلسطین عربوں کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں۔ مولانا محترم سے موصوف کو انتہائی محبت ہے۔ ہر محفل میں مولانا کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور نوجوانوں کو مولانا کی تصنیفات کے مطالعہ کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ ۶۴ء کی بات ہے کہ خاکسار بیروت میں تھا۔ مفتی صاحب نے خاکسار کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ میرے ساتھ شام کی جماعت اخوان المسلمون کے سربراہ اُستاذ عِصام عطار بھی مدعو تھے۔ مفتی صاحب نے اس موقع پر بتایا کہ مولانا محترم سے پہلی مرتبہ اُن کی ملاقات ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن میں ہوئی تھی۔ مفتی صاحب مصر کے نامور لیڈر مرحوم محمد علی علوبہ پاشا کے ہمراہ ہندوستان کا دَورہ کر رہے تھے۔ جب حیدر آباد گئے تو لوگوں نے بتایا کہ ایک نوجوان جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہے بڑے مؤثر اور نرالے انداز میں اسلام کی دعوت پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب کو مولانا محترم سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور باقاعدہ ایک خصوصی دعوت کے ذریعہ اس ملاقات کا اہتمام ہوا۔ مفتی صاحب اپنی اس پرانی ملاقات سے بڑے خوش تھے۔ بتانے لگے کہ مولانا کے اندر ایامِ جوانی میں جس عزیمت اور پختگیٔ کردار کی جھلک دیکھی تھی آج بھی جب اُن کو دیکھتا ہوں تو پختگیٔ کردار اور استقامتِ فکر و نظر کا کوہ پیکر نمونہ آنکھوں کے سامنے جھلک جاتا ہے۔ ہمارے ترک دوست صالح اُوزجان نے بتایا کہ مفتی

صاحب سے جب کبھی میری ملاقات ہوتی ہے تو وہ مجھے یہی نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ ترکی میں دعوتِ اسلامی کا صحیح خطوط پر کام کرنے کے لیے مولانا مودودی سے تربیت حاصل کرو۔ مفتی صاحب کے سیکرٹری خلیل علیا صاحب نے ایک قیمتی قلم میرے سپرد کیا اور کہا کہ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میری آرزو تھی کہ مَیں لندن جا کر مولانا محترم کی عیادت کرتا مگر بعض وجوہ کی بنا پر یہ موقع نہ مل سکا۔ مَیں مفتی صاحب کا سلام بھی مولانا محترم کی خدمت میں پیش کروں اور یہ قلم بھی اُن کی طرف سے مولانا کی خدمت میں ہدیہ کروں۔

آستانۂ خلافت میں

"آستانۂ خلافت" میں

۱۵ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو ۱۱ بجے SAS کے جہاز سے بیروت سے استنبول روانہ ہوا۔ سوا گھنٹے کی پرواز کے بعد میں استنبول کے ایرپورٹ پر تھا۔ بیروت میں جس انقباض اور الم سے دوچار تھا عجب بات ہے کہ استنبول کے ایرپورٹ پر قدم رکھتے ہی طبیعت میں تبدیلی آگئی۔ اب انقباض کے بجائے انبساط محسوس ہو رہا تھا اور الم مبدّل بہ راحت تھا۔ اس بات پر دل انتہائی خوش تھا کہ میرے قدم اُس سرزمین پر ٹِک رہے ہیں جو آٹھ سو سال تک اسلامی سلطنت کا مرکز رہی ہے اور جس کی عظمت و جلال اور شکوہ و ہیبت نے اُسے "آستانہ" کا لقب دے رکھا تھا۔ جسے آج ہم ترکی کہتے ہیں یہ عثمانی خلافت کے دَور میں دولتِ عثمانیہ کہلاتا تھا۔ اس کے دو بڑے حصّے ہیں ایک اناطولیہ جسے ہمارے ہاں انگریزی کے اثر سے اناطولیہ کہا جاتا ہے (یہ ترکی کا ایشیائی حصّہ ہے۔ اور دوسرا رومیلی یا تھریس جو ترکی کا یورپی حصّہ ہے۔ ترکی عثمانی خلافت کے متعدد ایشیائی اور یورپی صوبوں میں سے ایک صوبہ تھا۔ اب ترکی سے مراد صرف اناطولیہ اور رومیلی ہے۔ ایک زمانے میں یہ سلطنت چالیس ہزار مربع میل سے زیادہ رقبہ پر حاوی تھی۔ دنیا کے مالدار

ترین اور خوبصورت ترین علاقے اس کے زیرِ اثر تھے۔ ارطغرل کی اولاد نے تین صدیوں کے اندر اندر اسے یورپ اور ایشیا کی عظیم طاقت بنا کر رکھ دیا تھا۔ مگر عثمانی خلافت کے زوال کے بعد اب صرف اناطولیہ اور رومیل کا مختصر علاقہ ہی عثمانیوں کی عظمت کی بچی کھچی یادگار کے طور پر قوم پرست ترکوں کے ہاتھ میں باقی رہ گئی ہے۔

استنبول شہر دو حصّوں میں ہے۔ اس کا ایک حصّہ ایشیا میں ہے اور دوسرا یورپ میں۔ اناضولو کا لفظ اس شہر میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ استنبول کی سڑکوں پر جگہ جگہ ایسے بورڈ آویزاں ہیں جن پر اناضولو لکھا ہوا ملے گا۔ اناضولو ہوٹل اناضولو بنک۔ یہ یونانی لفظ ہے۔

پاکستانیوں سے ترکوں کی محبت

استنبول ایرپورٹ پر ترک ملازمین نے میرے ساتھ انتہائی محبت و عقیدت کا برتاؤ کیا۔ یہ دیکھتے ہی کہ میں پاکستانی ہوں، ہر شخص میری طرف لپکا۔ چونکہ ترکی اور پاکستان میں مابین ویزا کی پابندی اُٹھا دی گئی ہے اس لیے جہاز کے تمام مسافروں کے اندر میں واحد شخص تھا جسے "پاسپورٹ کنٹرول" کے سامنے لائن میں کھڑا ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ کنٹرول افسر نے مجھے دیکھتے ہی اشارہ کیا کہ میں بلا جھجک اندر چلا جاؤں۔ اس خصوصی امتیاز پر میرے دوسرے تمام رفقائے جہاز جن میں شامی، لبنانی، مصری، انگریز اور جرمن تھے مجھے بغور گھورنے لگے۔ غالبًا وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کاش اُن سے بھی ویزا کا تقاضا نہ ہوتا۔ پاکستان اور ترکی کے درمیان ویزا ۱۹۵۸ء میں ختم کر دیا گیا تھا۔ جس طرح ان دونوں ملکوں کے درمیان ویزا کی پابندیاں ختم کر کے

خیر سگالی کے بہترین جذبات کو تقویت پہنچائی گئی ہے کیا اچھا ہو کہ دوسرے مسلمان ممالک بھی اسے اپنے لیے مثال بنائیں۔ کسٹم والوں نے تو اور بھی کمال کر دکھایا۔ شامیوں اور مصریوں کے سامان کی چیکنگ اِس قدر شدید ہوئی کہ ایک ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ بکسوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا گیا۔ عورتوں کے ہاتھوں میں جو پرس تھے اُن تک کو کھولا گیا۔ مگر مجھ پاکستانی کو یہ فخر حاصل ہے کہ نہ صرف میرا سامان نہیں کھولا گیا، بلکہ قلیوں تک نے محبت سے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور موٹر تک میرا سامان منتقل کرنے پر مجھ سے ایک ترکی لیرا تک لینا گوارا نہ کیا۔ کسٹم کا ایک افسر کچھ نہ کچھ عوامی عربی (دارجہ) جانتا تھا، غالباً ماردین کے علاقے کا ہوگا۔ مجھ سے عربوں کے روایتی انداز میں کہنے لگا: عساک ما تعنیت فی الطائرۃ (امید ہے آپ کو جہاز میں کوئی تکلیف نہ ہوئی ہوگی)۔ میں نے کہا الحمد للہ سفر آرام وہ گزرا۔ کہنے لگا "پاکستان میں اسلام بہت ہے۔" میں نے کہا پاکستان بنا ہی اسلام کے لیے ہے۔ اِس پر وہ اپنے کندھوں کو ہلا کر کہنے لگا کہ میں نے پاکستان کا بڑا شیخ دیکھا ہے۔ وہ یہاں سے گزرا تھا اور اُس نے نماز پڑھائی تھی۔ خاکسار نے عرض کیا کہ میں اُسی شیخ کا شاگرد اور سیکرٹری ہوں۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ میرا سامان موٹر میں رکھ دیا گیا، ورنہ دل چاہتا تھا کہ اُس سے مزید باتیں ہوں۔ وہ بھی اپنے کام سے بے نیاز ہو کر مزید تبادلۂ خیال کرنا چاہتا تھا مگر اتنی سی گفتگو پر اکتفاء کرنی پڑی۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ مولانا محترم نے لندن جاتے وقت استنبول کے ہوائی اڈے پر جو نماز پڑھائی تھی ہوائی اڈے کے ملازمین پر اُس کے اچھے اثرات پڑے ہیں۔ استنبول کے دوستوں نے بھی مجھے بتایا کہ ہوائی اڈہ پر اس انداز میں

پہلے کبھی باجماعت نماز نہیں ادا کی گئی۔ اس نماز کا نہ صرف ایر پورٹ پر چرچا ہوا بلکہ کئی روز تک یہ واقعہ عوامی حلقوں میں نقلِ محفل بنا رہا۔ ترکی کے اسلامی اخبار اتحاد نے مولانا کے استقبال کی مفصل خبر شائع کر دی، اور ساتھ ہی مولانا محترم کی ایک ایسی تصویر چھاپ دی، جس میں مولانا محترم نماز کے بعد بیٹھے ہوئے دُعا مانگ رہے ہیں۔ اتحاد کی اس رپورٹنگ نے ترکی بھر میں اِس خبر کو پھیلا دیا اور اہلِ دین کے لیے خوشی کا سامان فراہم کر دیا۔ اتحاد استنبول سے نکلتا ہے اور ۶۰ ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے۔

استنبول میں پہلی رات

میں استنبول یکایک پہنچ گیا تھا۔ استنبول یا انقرہ کے کسی دوست کو اپنی آمد کی پیشگی اطلاع نہ دے سکا تھا۔ استنبول کے محلّہ بایزید میں عمر ہوٹل کے اندر میں نے قیام کر لیا۔ یہ ہوٹل استنبول یونیورسٹی کے عقبی دروازے کے سامنے ہے۔ پہلا دن زبان کی اجنبیت کی وجہ سے تنہائی کی حالت میں گزرا۔ روزنامہ بگن کے ایڈیٹر محمد شوکت صاحب کو ہوٹل سے دو تین مرتبہ فون کیا مگر وہ نہ مل سکے۔

رات کو نماز تراویح کے لیے قریب کی جامع مسجد میں گیا۔ یہ مسجد سلطان بایزید کے نام سے موسوم ہے اور استنبول یونیورسٹی کے صدر دروازے کے بالکل سامنے ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ بالعموم اسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے صدر دروازہ پر قرآن کریم کی یہ آیت جلی حروف میں کندہ ہے کہ: "لَا يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ" جامع بایزید نہایت وسیع و عریض مسجد ہے اور ہزارہا نمازیوں کے لیے اس میں گنجائش ہے۔ نماز تراویح



جامع سلطان احمد کا اندرونی حصّہ ۔ استنبول

میں میرے اندازے کے مطابق دس ہزار کے قریب نمازی موجود تھے۔ عورتوں کی تعداد بھی دو ڈھائی سو سے کم نہ ہو گی۔ عورتوں کے لیے مسجد میں ایک الگ جگہ مخصوص ہے جسے ترک گوشۂ خانم کہتے ہیں۔

دو عربی آشنا دوستوں سے تعارف

نماز تراویح کے بعد ہوٹل میں واپس آرہا تھا کہ راستے میں اتفاقاً ایک ترک نوجوان سے تعارف ہو گیا۔ مَیں نے راستے میں ایک دکان سے سحری کے لیے پھل خریدے اور جب دام دینے لگا تو اس نوجوان نے جو میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا دکاندار سے کہا کہ دام مَیں دوں گا، اس پاکستانی سے دام نہ لینا۔ چنانچہ دام اُس نے ہی ادا کیے۔ بعد میں اس نوجوان سے جب بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان کا نام عبدالقادر سیزگین ہے۔ استنبول کے مدرسہ امام و خطیب کے فارغ شدہ ہیں اور اب استنبول یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں پڑھتے ہیں اور آخری سال میں ہیں۔ مولانا محترم کی وہ تمام کتابیں جو اب تک ترکی میں ترجمہ ہو چکی ہیں پڑھ چکے ہیں۔ عربی زبان پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں مگر بولنے پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے۔ عبدالقادر سیزگین کی وساطت سے استنبول کے احباب سے ملنے کا موقع نکل آیا۔ عبدالقادر سیزگین میری بات تو خوب سمجھ لیتا تھا مگر بے چارہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر قادر نہ تھا۔ اُس کا چہرہ بتاتا تھا کہ جذبات سے بھرپور ہے۔ رات دیر تک میرے پاس ہوٹل میں بیٹھا رہا اور اپنی شکستہ عربی سے میری تنہائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسرے روز علی الصبح ایک اچھے عربی دان دوست کو ساتھ لے آیا۔ یہ صاحب بھی ہمارے

پُرانے آشنا نکلے۔ ان کا نام محمد شاہین ہے۔ جامع لالالی کے خطیب ہیں۔ اسلامی مجلہ ہلال کے ادارۂ تحریر میں شامل ہیں۔ عربی زبان خوب جانتے ہیں اور ہلال کے اندر مولانا محترم کے جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر انہوں نے ہی عربی سے تُرکی میں ترجمہ کیے ہیں۔

عربی زبان کی سخت جانی

عبد القادر سیز گین کی سرگرمی اور تعاون کی بدولت عمر ہوٹل میں دوستوں کی آمد شروع ہو گئی۔ استنبول کے مدرسۂ امام و خطیب کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک کثیر تعداد بھی آ گئی۔ پروفیسر عُزیر، نائف آفندی اور شیخ یوسف اور کئی دوسرے دوست جمع ہو گئے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک مولانا محترم کا ترکی لٹریچر پڑھ چکا ہے اور صرف اسلامی اخوت کی بنیاد پر ہی اظہارِ محبت نہیں کر رہا ہے بلکہ تحریکی جذبہ کی ہم آہنگی بھی اس محبت میں شامل ہے۔ تُرکی آنے سے پہلے جس بات کا ہر وقت خدشہ لاحق رہتا تھا وہ زبان کا مسئلہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ترکی میں عربی بولنے والے شاذ و نادر ہوں گے۔ کیونکہ مصطفیٰ کمال اور اُس کے ناعاقبت اندیش ساتھیوں نے عربی زبان اور عربی رسم الخط کو ترکی کے اندر ختم کرنے کے لیے جس تشدّد اور سفاکیت کا مظاہرہ کیا ہے اُس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسرائیل بھی عربی کے بجائے عبرانی زبان کو رائج کر رہا ہے، مگر تشدّد کے بجائے دوسرے کارگر ہتھکنڈوں کے ذریعے۔ ترکی میں اس تشدّد اور سفاکیت کے باوجود اور عربی کے لیے ہر طرح کے دروازے بند کر دینے کے علی الرغم آج عربی بولنے والوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ اِسے

عربی کی سخت جانی اور اسلام کا معجزہ قرار دے لیں یا طورانی جماعت کی غلط اندیشی۔

دو سوال

دن بھر عمر ہوٹل میں رہا۔ احباب تشریف لاتے رہے۔ ہر شخص کی زبان سے سب سے پہلے جو سوال نکلتا تھا وہ یہ تھا کہ "حضرت مودودی کی صحت کیسی ہے؟" یہ وہ سوال تھا کہ اِس سفر میں مَیں جہاں کہیں بھی گیا ہوں سب سے پہلے اس سوال کا جواب دینا ہوتا تھا۔ مولانا محترم کے سفر لندن اور پھر اپریشنوں کی خبر دنیا میں اِس قدر پھیلی ہے کہ ہر شخص کی نگاہیں مولانا محترم پر لگی ہوئی تھیں اور وہ مولانا محترم کی صحت کی خبر سننے کے لیے بے تاب تھا۔ مولانا محترم جب علاج کے لیے لندن روانہ ہوئے تو ہمیں ایک ثقہ عرب دوست نے بتایا کہ پاکستان کے بعض سرکاری حلقوں کی طرف سے عربوں کے اندر یہ پروپگنڈا کیا جارہا ہے کہ مولانا برطانیہ میں علاج کی غرض سے نہیں گئے بلکہ دوسرے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے گئے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے افترا پردازی کرنے والوں کو اِس مرتبہ بھی اُسی طرح رُوسیاہ اور خائب وخاسر کیا جسطرح وہ پہلے ایسے لوگوں کو رُسوا کرتا رہا ہے۔ مَیں جب دوستوں کو مولانا محترم کی صحت کی بشارت دیتا تو وہ بڑے شادماں ہوتے اور اللہ کا شکر بجا لاتے۔ ترکی کے اخبارات میں بھی مولانا محترم کے اپریشنوں کی خبریں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں اور استنبول سے اَدَنہ تک کے لوگ صورتِ احوال سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ رہے ہیں۔

دوسرا مجھ سے سوال بار بار یہ کیا گیا کہ مولانا محترم ترکی کب تشریف لا رہے

ہیں۔ راقم الحروف اس سوال کا قطعی جواب دینے سے معذور تھا۔ اس لیے کہ اس امر کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مولانا محترم پاکستان جاتے ہوئے راستے میں ترکی یا کسی اور مقام پر ٹھیرنے کی ہمت رکھتے ہیں یا نہیں۔ بہر حال ترکی میں یہ خبر عام تھی کہ مولانا محترم ترکی ٹھیریں گے اور ایک کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ لوگ اس خبر پر بے حد مسرور تھے اور انتظار کے ایام گن رہے تھے۔ میں ترکی میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا۔ ہر شخص مجھ سے مولانا محترم کے ترکی میں پہنچنے کی تاریخ پوچھنے لگا۔

امام وخطیب ہائی اسکول میں افطاری

مدرسہ امام وخطیب کے پرنسپل کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ آج شام میری افطاری کی دعوت مدرسہ میں ہے۔ سارا دن ہوٹل میں گزرا۔ شام کو عبد القادر سیزگن کی معیت میں مدرسہ امام وخطیب گیا۔ یہ مدرسہ استنبول کی مشہور مسجد جامع محمد الفاتح کے قریب ہے۔ مدرسہ کے دروازے پر مدرسہ کے پرنسپل اور اساتذۂ کرام نے میرا استقبال کیا۔ اساتذہ سے الگ الگ تعارف کرایا گیا۔ اساتذہ کے اندر عربی جاننے والوں کی ایک تعداد تو موجود تھی ہی، ایک ایسے استاذ بھی ملے جو اُردو زبان بھی نہایت اعلیٰ بولتے ہیں۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا آپ اصلاً ترک ہیں یا ہندوستانی؟ بتانے لگے میں خالصتہً ترک ہوں۔ البتہ مجھے اردو سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس غرض کے لیے میں لکھنؤ گیا اور وہاں تین سال تک رہا ہوں، اور لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کی ڈگری حاصل کی ہے۔ انہوں نے اپنا نام یوسف صالح قرجہ بتایا۔ یہ اس وقت امام وخطیب ہائی اسکول میں استاذ ہیں۔ ۴۰ سال کے بھرپور اور صحت مند نوجوان ہیں۔ ایک

غیر ملکی مسلمان کا اِس قدر شوق سے اُردو سیکھنا اور پھر اس سے دین کی خدمت کا کام لینا بہت قابلِ قدر بات ہے۔ آج تک مجھے کوئی ایسا عرب نہیں ملا جس نے باقاعدہ اُردو زبان کو اس ذوق و شوق سے سیکھا ہو اور اسے دعوتِ دین کا ذریعہ بنایا ہو۔ عرب اس فضیلت سے محروم ہیں۔ البتہ انہیں انگریزی سیکھنے اور بولنے کا بے حد شوق ہے۔ سعودی عرب کے اندر تو نوجوانوں کو انگریزی سیکھنے کا اِس قدر جنون لاحق ہوتا جا رہا ہے کہ خود اپنی عربی سے اب انہیں نفرت سی ہونے لگی ہے۔

امام و خطیب ہائی اسکول کی اجتماعی افطاریاں

مدرسہ امام و خطیب کے اندر افطاری کا وسیع دسترخوان بچھا ہُوا تھا۔ پرنسپل صاحب نے بتایا کہ پورے رمضان میں یہ دسترخوان بچھا رہا ہے۔ پرنسپل جو ایک سابق فوجی جرنیل ہیں اور بہترین منتظم ہیں، نے بتایا کہ اِن افطاریوں کا پس منظر یہ ہے کہ یہ افطاریاں اسکول یا طلبہ کے حساب میں نہیں ہوتیں بلکہ شہر کے صاحبِ ثروت حضرات میں سے کوئی نہ کوئی شخص ایک افطاری اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ وہ خود بھی اس میں شریک ہوتا ہے اور شہر کے دیگر معززین کو بھی شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ اِس طرح نہ صرف یہ افطاری ایک روحانی اجتماع کی صورت اختیار کر جاتی ہے بلکہ طلبہ اور اساتذہ کو شہر کے اچھے اچھے لوگوں سے ملنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ آج کی افطاری کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اس میں دو ہزار کی حاضری ہے۔ ایک ہزار ۳ سو طلبہ ہیں اور ۵۰ اساتذہ۔ کچھ اسکول کے دوسرے متعلقہ حضرات ہیں، مثلاً ڈاکٹر اور ناظمین

شعبہ جات وغیرہ۔ اور باقی معززینِ شہر ہیں۔ معززینِ شہر میں اسمبلی کے ارکان، یونیورسٹی کے پروفیسر، تجّار اور وکلار شامل ہیں۔ علمار کی ایک جماعت بھی موجود ہے۔ (ترکی کے معمّر شیخ الاسلام (شیخ الاسلامی کا عہدہ مصطفیٰ کمال نے ختم کر دیا تھا۔ اس لیے ان کا یہ لقب سرکاری نہیں ہے۔ بلکہ اپنے قدیم منصب کی بنا پر یہ اس لقب سے پکارے جاتے ہیں) بھی موجود ہیں جو عثمانی دَور کے آخری ایام میں اس منصب پر فائز تھے اور مصطفےٰ کمال اور عصمت انونو کے دَور میں بھی اپنی عوامی مقبولیت اور علم و فضل کی وجہ سے قابلِ احترام سمجھے جاتے رہے ہیں اور ان سے تعرض کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔ جن صاحب کی طرف سے افطاری کی دعوت دی گئی ہے پرنسپل صاحب نے اُن سے خصوصی تعارف کرایا۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ وہ استنبول کے بہت اُونچے تاجروں میں سے ہیں۔ استنبول میں اُن کا ایک اعلیٰ درجے کا ریسٹورنٹ ہے جو اصحابِ ذوق کا مرجع ہے انہوں نے مدرسہ امام وخطیب کے طلبہ و اساتذہ اور شہر کے ائمہ اور مفتیوں کے لیے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ ان میں سے کوئی اگر ان کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائے یا چائے پیے تو اُس سے پچیس فی صد کم دام لیے جائیں گے۔ اہلِ دین سے ترکوں کو جو محبت ہے یہ اُس کا ایک معمولی سا ثبوت ہے۔

افطاری میں میرے بائیں جانب "شیخ الاسلام" عمر نصوحی صاحب تشریف فرما تھے۔ کافی ضعیف العمر ہیں۔ دھیمے انداز میں بات کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اب حضرت مودودی کا کیا حال ہے۔ خاکسار نے عرض کیا کہ اُن کا دوسرا اپریشن بھی ہو گیا ہے جو بفضلِ خدا کامیاب رہا ہے، اور اب وہ چند روز تک پاکستان لوٹنے

والے ہیں۔" شیخ الاسلام" فرمانے لگے اللہ تعالیٰ حضرت کو کامل صحت اور طویل زندگی عطا فرمائے۔ مجھے اُن سے بڑی محبت ہے۔ اُن کی کتابیں ہمارے نوجوانوں کے اندر دین کی صحیح اسپرٹ پیدا کر رہی ہیں۔ میری تمنا ہے کہ وہ لندن سے واپسی پر یہاں چند روز کے لیے تشریف لائیں۔

تقریریں

افطاری کے بعد مختصر تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے بھی تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ پرنسپل صاحب نے یوسف صالح قرجہ کو ترجمانی کے لیے کہا۔ محفل میں باقاعدہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام تھا۔ نشستوں کی ترتیب میں بڑے سلیقہ کا ثبوت دیا گیا تھا۔ ۲ ہزار کی تعداد کے لیے میزوں اور کرسیوں کا کھلا انتظام تھا۔ یوسف صالح قرجہ نے بتایا کہ میری تقریر کا موضوع ہے: "جماعت اسلامی پاکستان کا تعارف"۔ میں نے جب اِس موضوع کے بارے میں کچھ تردّد کا اظہار کیا تو قرجہ صاحب کہنے لگے کہ اِس وقت تمام دوستوں کی یہی خواہش ہے۔ یہاں جتنی حاضری آپ دیکھ رہے ہیں یہ لوگ مولانا مودودی کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اُن کی کتابیں پڑھ چکے ہیں اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہو گی کہ آپ مولانا مودُودی کی جماعت کا مختصراً تعارف انہیں کرا دیں۔ چنانچہ حاضرین کے اصرار پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ شیخ الاسلام صاحب نے بھی تھپکی دی کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور بیان کروں۔

میرے سامنے جو حاضرین موجود تھے انہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ امام و خطیب اسکول کے نام سے طلبہ اور اساتذہ کا جو تصوّر میں نے قائم کر رکھا ہے وہ صحیح نہیں

ہے۔ میرا خیال تھا کہ اِن مدارس میں اُسی نوعیت کے اماموں اور خطیبوں کی کھیپ تیار ہو رہی ہے جو ہند و پاکستان کے اکثر دینی مدارس میں تیار ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ یہاں تازہ دم، صحت مند، زندگی کی توانائیوں سے بھرپور عنصر جمع ہے۔ ان کے چہرے غمّازی کر رہے ہیں کہ دین سے گہرا عشق ان کو اِس ادارے میں کھینچ لایا ہے۔ چنانچہ مَیں نے اسی احساس کے تحت اُن کے سامنے مختصر سی تقریر کی۔ جس میں مَیں نے پہلے جماعت کی تاریخ اور دعوت اور مقصد و طریقِ کار پر اجمالی سا اشارہ کیا اور پھر مَیں نے ترکوں کی تاریخ اور ترکوں کی عظیم الشّان اِسلامی خدمات کو بیان کیا۔ مَیں نے کہا کہ عثمانی تُرکوں نے یورپ اور ایشیا میں ۸ سو سال تک اِسلام کا جھنڈا لہرایا ہے۔ اب پھر زمانہ اس انتظار میں ہے کہ یہ جری اور بہادر قوم اسلام کا جھنڈا ہاتھ میں لے اور کُفر و الحاد کی تاریکیوں میں اسلام کی شمع روشن کرے۔ آپ کے یہ مدارس جنہیں آپ مدارس ائمہ و خطباء کہتے ہیں یہ غازیانِ اسلام کی تربیت گاہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے چشمے ہیں۔ امید ہے یہی مدارس تُرک قوم کو بیدار کرنے اور اُسے اپنے اصل مشن سے باخبر کرنے کا فرض سرانجام دیں گے۔ ماضی میں اگر فولادی ہتھیاروں کو جہاد کے میدان میں استعمال کیا گیا ہے تو اب اس زمانے میں فکری اور علمی اسلحہ کے بغیر اس جہاد میں کامیابی نہیں ہو سکے گی۔ ہم اُمید رکھتے ہیں کہ آپ میں سے ہر ہر فرد محمد الفاتح بن کر اُٹھے گا اور باطل کی اس یلغار کو جو کفر و الحاد اور یہودیّت و صلیبیّت کے مختلف پردوں میں اسلامی دنیا پہ حملہ آور ہو رہی ہے اُس کا سدِّ باب کرے گا۔

ترک نوجوانوں کا اِسلام سے لگاؤ

مَیں نے مختصراً اپنے خیالاتِ پریشاں پیش کر دیئے۔ فرجہ صاحب نے ترجمانی کی۔ مگر مَیں اس بات پر خاصا حیران رہا کہ میری ان گزارشات کا اسکول کے نوجوانوں نے بڑا خیر مقدم کیا۔ اور اسلام اور اِسلامی جہاد اور اِسلامی عظمت کی بحالی کے الفاظ پر جی بھر کر تالیاں بجائیں۔ پاکستان یا سعودی عرب میں تو اِسلام کا نعرہ لگا دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ مگر ترکی کے نوجوان عنصر کے اندر جس کی پرورش ہی لادینی دستور، لادینی نظامِ حکومت، لادین تہذیب اور لادین حکمرانوں کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اُس کا اِسلام کے نام پر اس قدر اُچھل پڑنا فی الواقع ایک زبردست عجوبہ سے کم نہیں ہے۔ مَیں تو یہ سمجھتا تھا کہ اسلام کا احیاء ترکی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہو رہا ہو گا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ کھُلے بازار میں اِسلام کا نعرۂ حق گونج رہا ہے۔ مسجد سے بھی یہ آواز اٹھ رہی ہے اور مدرسہ سے بھی۔ اور اسے اٹھانے والے بُوڑھے نہیں ہیں، بہترین دم خم رکھنے والے نوجوان ہیں۔

پارلیمنٹ کے ایک رکن کی جوابی تقریر

میری تقریر کے بعد ترکی پارلیمنٹ کے ایک رکن جناب عثمان سراج اُٹھے اور انہوں نے میری گزارشات کی تائید کرتے ہوئے علی الاعلان کہا کہ ہم یہاں احیائے اسلام کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ مَیں نوجوانوں کو ہر محفل میں اس فرض کی جانب متوجہ کر رہا ہوں۔ اور امید ہے ترکی کا نوجوان مستقبل قریب میں اُن تمام امیدوں کو بروئے کار لانے کا اہل ثابت ہو گا جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اجتماع منتشر ہو گیا۔ شیخ عمر نقوجی صاحب نے میری

بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اور ہم پرنسپل صاحب کے کمرے میں چلے گئے۔ وہیں نماز مغرب ادا کی۔ نماز کے بعد شیخ عمر نصُوحی، یوسف صالح قرجہ اور پرنسپل صاحب اور کچھ دوسرے حضرات سے بات چیت ہوتی رہی۔

"شیخ الاسلام" عمر نصُوحی

شیخ عمر نصُوحی کا پورے ملک میں بڑا زبردست احترام پایا جاتا ہے۔ موصوف کئی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ اِن میں سے کچھ چھپ چکی ہیں اور اکثر غیر مطبوعہ ہیں۔ تفسیر اور مفسّرین کی تاریخ پر بھی کئی جلدوں میں ان کی ایک تصنیف ہے جسے ترکی کے محکمہ امور مذہبی نے شائع کیا ہے۔ اِسلامی فقہ پر موصوف کو زبردست عبور حاصل ہے۔ اُنھوں نے اُس دَور میں بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ہے جب یہ شغل جاری رکھنے والوں کے سر قلم کرتے رہے اور دین کو پکڑ کر رکھنا آگ کا انگارہ مٹھی میں لینے کے مترادف تھا۔

ترکی میں لادینیّت کی تاریخ

مَیں نے یہ موقع غنیمت سمجھ کر شیخ عمر نصُوحی سے اُس دَور کے حالات سُننے کی خواہش ظاہر کی جب تُرک قوم کو دین سے بیگانہ کرنے کی مہم چل رہی تھی۔ کیونکہ شیخ عمر نصُوحی نہ صرف یہ کہ اس دَور کے عینی شاہد ہیں بلکہ خود ان حالات کو بھگت چکے ہیں۔ شیخ نصُوحی پچھلے حالات کو چھیڑنا پسند نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اِس پر مسرّت کا اظہار کیا کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے دین پر جو طوفان خیز آزمائشیں ٹوٹیں اور پُورا ملک ایک شبِ تاریک میں تبدیل ہو گیا، وہ اب ختم ہو رہی ہیں اور قبل اس کے کہ وہ اِس دنیا سے رُخصت ہوں اپنی اُنہی آنکھوں

سے نوجوانوں کے اندر دین کی عام بیداری کے ایمان افروز منظر دیکھ رہے ہیں۔
شیخ نے بتایا کہ ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک جو ملک اِسلام کا
گہوارہ رہا، بلکہ اسلام کا محافظ رہا، اُسے صرف آٹھ سال کے اندر اِسلام سے
بیگانہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۲۴ء سے تبدیلی کا یہ سِلسلہ شروع ہوا اور
۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ موضوع نازک تھا، سب کے دلوں کے تار ہِل گئے۔
مجلس میں ایک اور صاحبِ علم بیٹھے تھے۔ انہوں نے تاریخی ترتیب کی حکایت
سے بتایا کہ سلطان محمد وحید الدین آخری عثمانی سلطان تھے، مگر وہ انگریزوں
کے ساتھ ساز باز کرکے اُن کے جہاز پر راہِ فرار اختیار کر گئے۔ چنانچہ اس کے
بعد انقرہ کی مجلس نے سلطنت ختم کرکے عبد المجید خاں ثانی کو صرف خلیفہ یعنی
صرف مذہبی امور کا سربراہ مقرر کر دیا اور ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو باقاعدہ جمہوریہ کا
اعلان کیا گیا اور مصطفٰے کمال نے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو
بالآخر نیشنل اسمبلی نے نام نہاد خلافت پر بھی خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ اور خلیفہ صاحب
کو ملک سے نکل جانے کا حکم مل گیا۔ اسمبلی نے اسی اجلاس میں وزارتِ شریعت
اور وزارتِ اوقاف کو بھی منسوخ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد شرعی عدالتیں ختم کرکے
انہیں سول عدالتوں کے اندر ضم کر دیا گیا۔ اس کے بعد مصطفٰے کمال نے دوسرا
بھرپور قدم اٹھایا اور تمام دینی مدارس اور دینی اداروں کو بند کر دیا اور ایک
بے اختیار اور نیم مُردہ سا مذہبی ادارہ "محکمۂ امورِ مذہبی" کے نام سے کھول
دیا۔ بلکہ حکومت نے دینی تعلیم کے معاملے میں یہاں تک تشدد برتا کہ پرائمری
اسکولوں کے اندر چھوٹے چھوٹے بچوں کو یہ سکھانا شروع کر دیا کہ ہماری

پس ماندگی کا اصل سبب دین ہے۔ ترکوں کو جتنے مصائب و حوادث کا سامنا کرنا پڑا ہے ان سب کا ذمہ دار دین ہے۔ حکومت نے باقاعدہ سابقہ ترکی دستور کے اندر سے یہ فقرہ حذف کر دیا کہ "ریاست کا مذہب اسلام ہوگا"۔ اِس تبدیلی کے بعد تمام اسلامی قوانین منسوخ کر دیئے۔ اِسلامی شریعت کو یہ لوگ "شریعت عتیقت" کہتے تھے یعنی بوسیدہ قانون۔ اِسلامی قوانین کے بجائے ان لوگوں نے سوئٹزرلینڈ کا سِول لا اور اٹلی کا فوجداری قانون عوام النّاس کی روایات و عادات کا لحاظ کیے بغیر ٹھونس دیا۔ شروع شروع میں تو خود جج ان نئے اور نامانوس قوانین کی وجہ سے سخت ذہنی اور فکری پراگندگی میں مبتلا ہو گئے اور عدالتوں کے اندر کئی کئی سال تک مقدمات فیصلہ کے بغیر پڑے رہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس صوفیاء کے تمام سلسلے بھی ممنوع قرار دے دیئے اور عیسائی پادریوں کی طرح علماء کے لیے ایک خاص یونیفارم مقرر کیا یعنی سیاہ جُبّہ اور سفید عمّامہ۔ عوام النّاس کو ہیٹ اور سُوٹ پہننے پر مجبور کیا گیا۔ ایک کروڑ باشندوں کے لیے یکایک اتنی بڑی تعداد میں ہیٹ فراہم کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس غرض کے لیے یورپ بھر سے ہر طرح کا ردّی (Condemned) مال درآمد کیا گیا۔ جمعۃ المبارک کے بجائے اتوار کو چھٹی کا دن قرار دیا گیا۔ حکومت نے مذہبی احساسات کو یہاں تک کچلنے کی کوشش کی کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے اجتماعات بھی اُسے گوارا نہ تھے۔ اُس نے ان اجتماعات کو بھی پہلے خلافِ قانون قرار دے دیا اور پھر اس قانون پر جب بہت اضطراب پیدا ہوا تو اسے تبدیل کر دیا گیا۔ ہجری جنتری کو ختم کر دیا گیا۔ عربی اذان ممنوع قرار دیدی

وراثت کے قانون میں بنیادی تبدیلی کر ڈالی اور مرد و عورت کو وراثت میں برابر کا حصّہ دار بنا دیا گیا۔ وراثت کے اصل حصّہ داروں (ذوی الارحام) کو فروع بنا دیا اور قانونی نظام کے اندر ایسا انتشار پیدا ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔ ترکی کا اسلام سے ہر طرح کا رشتہ کاٹنے کے لیے بالآخر دارالحکومت کو استنبول سے انقرہ منتقل کر دیا گیا کیونکہ استنبول مسجدوں اور مذہبی اداروں کا شہر ہے اور یہاں کے چپے چپے سے عثمانی تہذیب جھلک رہی ہے۔ اس لیے ایک نئی زندگی کا افتتاح کرنے کے لیے یہ شہر موزوں نہ سمجھا گیا۔ انقرہ بالکل ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ اُسے دارالحکومت بنا دیا گیا۔ انقرہ کو دارالحکومت بنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ عوامی تحریکِ آزادی کا مرکز رہ چکا تھا۔ فاتح ترکی افواج کا ہیڈ کوارٹر بھی یہیں تھا۔ اس لیے اگر استنبول کے بجائے انقرہ کو راجدھانی قرار دینے کی وجہ اگر دینی نہ بھی ہو تو سیاسی ضرور ہے۔ مگر ترک دوست دینی وجہ ہی کو اصل محرک قرار دیتے ہیں۔

ترکی کی ماضی قریب کی یہ داستان جب بیان کرنے والا بیان کر رہا تھا تو سب لوگ چُپ چاپ بیٹھے سُن رہے تھے۔ اُن کے چہروں کا بدلتا ہُوا رنگ بتا رہا تھا کہ اِس داستان نے اُن کے پُرانے زخم تازہ کر دیئے ہیں۔ جو صاحب ان واقعات کو دُہرا رہے تھے اُنھوں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس ملک پر سب سے زیادہ آزمائش کی گھڑی وہ تھی جب عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ یہ تبدیلی چونکہ تاریخ، فطرت اور روایات کے سراسر خلاف اور معقولیت کے ہر پہلو سے عاری تھی اِس

لیے نہ صرف عوام کے لیے اس کو قبول کرنا آسان نہ تھا بلکہ خود حکومت کو بھی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے اپنے تمام ذرائع اس تبدیلی پر لگا دیئے اور اُن تمام لوگوں کو جو لاطینی حروف کا علم رکھتے تھے جمع کیا گیا اور انہیں عوام کی تعلیم کے لیے بجبر مامور کیا گیا۔ ۹ر اگست ۱۹۲۸ء کو پہلی مرتبہ انقرہ کے اندر لاطینی حروف کے رواج کا اعلان کیا گیا اور اس اعلان کے ساتھ وہ تمام مطبوعہ کتابیں جو عربی زبان میں موجود تھیں انہیں جمع کر کے مصر، ایران اور دوسرے ممالک کو برآمد کر دیا گیا۔ چھاپہ خانہ والوں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ عربی حروف کی پلیٹیں چھاپہ خانوں میں نہیں رکھ سکتے۔ کالجوں کے نصاب میں سے عربی اور فارسی زبانیں نکال دی گئیں کیونکہ اب اُن کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ ترکی زبان کے اندر سے عربی اور فارسی کے الفاظ کو چُن چُن کر نکالا گیا اور اُن کے بجائے ترکی زبان کے عامی الفاظ کو شامل کیا گیا یا فرانسیسی الفاظ کو اختیار کیا گیا۔

۱۹۴۵ء میں ترکی کا دستور لاطینی زبان میں شائع ہوا۔

لادینیت کے نفاذ کا ردِّ عمل

موصوف نے جب اپنی یہ داستان مکمل کر لی تو میں نے دریافت کیا کہ یہ واقعات تو ہمیں کسی نہ کسی حد تک معلوم ہیں، لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مسلم عوام کا اس وقت ردِّ عمل کیا تھا اور ملتِ عثمانی نے ان تبدیلیوں کو کس طرح ہضم کر لیا؟ خاص طور پر عائلی قوانین کو کس حد تک عملاً قبول کیا گیا؟ وہ بتانے لگے کہ شروع شروع میں تو عوام کے اندر ان تبدیلیوں کے خلاف سخت بے چینی اور غم و غصّہ کا اظہار کیا گیا، مگر چونکہ مصطفیٰ کمال نے بلقان کی جنگوں کے اندر بعض اچھے کارنامے سرانجام

دیئے تھے اس لیے لوگ اس کے بارے میں غلط فہمی میں رہے۔ مسٹر نائف درمیان میں وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ دراصل اس تمام خرابی کی ذمہ داری فوزی چقماق پاشا کی گردن پر ہے۔ فوزی پاشا کو معلوم ہو چکا تھا کہ "غازی" نے اب اپنا راستہ بدل لیا ہے، مگر اس کے باوجود وہ خاموش رہے۔ اوّل الذکر صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ کُردوں نے اس لادینی نظام کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ ۱۳ فروری ۱۹۲۵ء کو ایک کُرد رہنما شیخ سعید نے، جو سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ تھے، تینوں مشرقی صوبوں کے اندر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اِن تینوں صوبوں میں اکثریت کُردوں کی ہے۔ شیخ نے کُردوں کی دینی غیرت و حمیت کو بھڑکا دیا اور باقاعدہ اعلانِ جہاد بلند کر دیا۔ کُردوں نے خلافت کی بحالی کا مطالبہ کھڑا کر دیا اور خلافت کے منصب کے لیے عبدالحمید ثانی کے بیٹے سلیم کا نام پیش کیا۔ مذکورہ تینوں صوبوں کو اپنے زیرِ اثر لانے کے بعد شیخ سعید دیار بکر کی طرف بڑھے اور آمد پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن کُرد سلسلۂ جنگ کو جاری نہ رکھ سکے اور بالآخر انہیں شکست کھانی پڑی۔ دراصل مصطفیٰ کمال نے ترکی کے اندر وسیع پیمانے پر یہ بات پھیلا دی کہ "ترکی کو اس وقت شدید خطرہ لاحق ہے۔ ترکی کے دشمن انگریز، کُردوں کی پُشت پناہی کر رہے ہیں اور مال اور ہتھیاروں سے برابر ان کی مدد کر رہے ہیں۔" مصطفیٰ کمال کے اِس جھوٹے پروپگنڈے نے ناواقف عوام پر بڑا اثر کیا اور وہ کُردوں کی بغاوت ختم کرنے کے لیے مصطفیٰ کمال کے ہمنوا ہو گئے۔ کیونکہ ایک طرف ان کے سامنے مصطفیٰ کمال کی غیر اسلامی اصلاحات تھیں اور دوسری طرف خود وطن کی آزادی اور سالمیت کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ دو مہینے بھی نہ گزرے کہ

مصطفیٰ کمال نے ترک عوام کی مدد سے کُردوں کے خلاف سخت کارروائی کی اور اُن کی بغاوت کو فرو کر دیا۔ کُردستان کے اندر اِس قدر قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا کہ پُورا علاقہ آگ اور خون میں نہانے لگا۔ "باغیوں" سے انتقام لینے کے لیے عدالتیں قائم کی گئیں جنہیں "آزادی کی عدالتیں" کہا گیا۔ بڑے بڑے کُرد سرداروں کو ان عدالتوں کی طرف سے پھانسی، جلاوطنی اور قید کی سزائیں دی گئیں۔ کُرد عوام کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ صرف دیارِ بکر کے اندر جن قبائلی سرداروں کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا اُن کی تعداد چالیس تھی۔ شیخ سعید کو، جو قائدِ انقلاب تھے، سب سے آخر میں پھانسی دی گئی۔

تشدّد کا دَور دَورہ

نائف آفندی نے اس بیان پر مزید اضافہ یہ کیا کہ کُردوں کے علاوہ اناضول کے دوسرے علاقوں میں بھی متعدد افراد نے "غازی" کی اصلاحات کے خلاف اقدامات کیے۔ مگر اُس وقت تشدّد کا اس قدر شدید دَور دَورہ تھا کہ ہر شخص پِس کر رہ گیا۔ فوجی جرنیلوں کی ایک ایسی ٹیم مصطفےٰ کمال کے ساتھ تعاون کر رہی تھی جو تُرک باشندوں کے ساتھ اجنبی فاتح فوج سے بھی بدتر سلوک کرتی تھی اور خاص طور پر مسلمان تُرک اُس کی نگاہ میں حد درجہ مبغوض تھا۔ کُردوں کی مسلح بغاوت کو ختم کرنے کے بعد اِن لوگوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ انہوں نے اب اپنے سیاسی حریفوں سے نمٹنا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۱ء میں اُن عناصر نے جو مصطفیٰ کمال کے لادینی اور تجدّد پسندانہ افکار کے خلاف تھے، ایک جماعت کی تشکیل کی تھی جسے پہلے "جماعت دوم" کا نام دیا گیا اور بعد میں یہ "حزبِ احرار" اور "حزبِ جمہوری

ترکی" کے ناموں سے مشہور ہوئی ۔ یہ حزب مصطفیٰ کمال کی ری پبلکن پارٹی کی مخالف تھی ۔ اس کے اندر تین طرح کے عناصر شریک تھے ۔ کچھ خالص سیاسی لوگ ، دوسرے دینی حلقے ، اور تیسرے " نوجوان ترکی " پارٹی کے لیڈر ۔ مصطفیٰ کمال کے بعض سابق حامی بھی ، جو اب اُس کے خلاف تھے ، اِس میں شامل ہو گئے تھے ۔ اس طرح سے " جماعت دوم " نے اچھی خاصی طاقت حاصل کر لی تھی ۔ مگر کُردوں کی بغاوت کو بہانہ بنا کر مصطفیٰ کمال نے اِس پارٹی کو توڑنے کا حکم جاری کر دیا اور اس پر یہ الزام دھرا کہ کُردوں کی بغاوت کے اندر اِس پارٹی کا ہاتھ ہے ، یہ وطن دشمن اور غداروں کا گروہ ہے ، اور اس کا وجود ملک اور قوم کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے ۔ چنانچہ اِس اعلان کے بعد مصطفیٰ کمال نے شہروں اور بستیوں کے اندر " آزادی کی عدالتیں " قائم کر دیں ۔ ایک ایک مخالف شخص کو ان عدالتوں کے اندر گھسیٹا گیا اور اُسے سزا دی گئی ۔ مسٹر نائف نے بھرّائی ہوئی آواز کے ساتھ بتایا کہ اُس وقت پُورے ملک کے اندر دیوِ استبداد رقص کر رہا تھا ۔ جس شخص پر بھی یہ شُبہ گزر جاتا کہ یہ " اصلاحات " کا مخالف ہے اُسے یا تو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا یا اُسے سخت تعذیب کا نشانہ بنایا جاتا ، یا ملک سے باہر نکال دیا جاتا ۔ " غازی " کا جوشِ انتقام کہیں تھمتا نظر نہ آتا تھا ۔ یُوں اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے یہ شخص ترک ملت کا فرد نہیں ہے بلکہ کوئی غیر ملکی فاتح ہے ۔ کیونکہ تشدد کا یہ انداز تو تاتاریوں نے بھی اس سرزمین کے اندر روا نہیں رکھا تھا جب وہ سلجوقیوں کے آخری عہد میں یہاں حملہ آور ہوئے تھے ۔ عوام سے انتقام لینے کے بعد " غازی " نے اپوزیشن کے لیڈروں کی طرف رُخ کیا ۔ اپوزیشن کے لیڈروں سے میری مراد " حزب دوم "

کے رہنما ہیں۔ اُن پر یہ فردِ جرم یہ عائد کی کہ اِن لیڈروں نے اُس کے قتل کی سازش کی ہے جو بروقت افشاء ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان سب لیڈروں کو بھی جن میں کئی سیاسی اور دینی پیشوا اور بڑی بڑی قابلِ احترام ہستیاں تھیں، "آزادی کی عدالتوں" میں پیش کر دیا گیا۔ دوسری صف کے تمام لوگوں کو چوراہوں میں پھانسیاں دی گئیں۔ صرف صفِ اوّل کے چار افراد کو معافی دی گئی اور باقی سب دار و رسن کے حوالے کیے گئے۔ مسٹر نائف نے اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا کہ عین اس وقت جب مخالفین کو شہر کے چوراہوں پر پھانسیاں دی جا رہی تھیں، "غازی" کے محل میں جو "شان کیا" کے اندر واقع ہے، رقص و سرود اور جام و مے کا دَور چل رہا تھا۔ "غازی" خوش تھا کہ اُس نے اپنا راستہ پوری طرح صاف کر لیا ہے۔

عائلی اصلاحات کا حشر

نائف آفندی اور دوسرے دوستوں کی اِس مفصل اور دلچسپ گفتگو نے ترکی کی تاریخ حاضر کے نہایت اہم پہلو اجاگر کر دیئے اور راقم الحروف اس لحاظ سے مطمئن تھا کہ یہ معلومات خود ترکی کی سرزمین کے اندر ترکی قوم کے اُن افراد سے دستیاب ہو رہی ہیں جو اِن واقعات کے عینی شاہد ہیں یا اپنے بزرگوں کی زبان سے اِن واقعات کو سُن چکے ہیں۔ میرے سوال کا دوسرا حصّہ یہ تھا کہ عائلی قوانین کو کس حد تک اس ملک کے اندر نافذ کیا گیا اور کیا فی الواقع ترکی کے مسلم معاشرے نے ان قوانین کی پابندی کی ہے؟ شیخ عمر نصُوحی، جواب اُٹھنے کے لیے کروٹ بدل رہے تھے، اور انہوں نے اپنا ہیٹ بھی سر پر رکھ لیا

تھا، اِس کا مختصر جواب دیتے ہوئے فرمانے لگے:

"ترکی کا موجودہ عائلی قانون دراصل سوئٹزرلینڈ کے سِول لا سے ماخوذ ہے۔ بلکہ اُس کا مکمّل چربہ ہے۔ مسیحی معاشرے کے قانون کو ترکی کے مسلم معاشرے میں اندھا دُھند نافذ کر دیا گیا۔ اب اسے "ٹرکش سِول لا" کہا جاتا ہے۔ اِس قانون نے وراثت کے تمام اِسلامی احکام اور شخصی قوانین کو بدل ڈالا اور تعدّدِ ازواج کو بلا قید و شرط ممنوع قرار دے دیا۔ یہ قانون ۱۹۲۵ء میں مجلّہ احکام کو منسوخ کر دینے کے بعد جاری کیا گیا۔ اب اسے ۴۳ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے مگر یہ کہنا کہ یہ قانون کامیاب ہُوا ہے یا کسی حد تک بھی کامیاب ہُوا ہے مشکل ہے۔ ہم نے ترکی کے مختلف طبقوں کی زبان سے مسلسل یہ شکایتیں سُنی ہیں کہ یہ قانون مالی، اخلاقی اور نفسیاتی ہر لحاظ سے معاشرے پر بارِ گراں بن رہا ہے اور ترکی کی اجتماعی اور نظریاتی زندگی کے ساتھ بُری طرح متصادم ہے۔ اس نے ترکی کی شہری زندگی کے اندر بداخلاقی، آوارگی اور جنسی آزادی کو جنم دیا ہے۔"

"قانونی" شادیاں اور "شرعی" شادیاں

شیخ عمر نصُوحی نے اپنے حافظے پر بوجھ ڈالا اور اس سلسلے میں اُس دَور کی بعض دلچسپ معلومات بیان کیں جب کہ اس قانون کے نفاذ کے لیے حکومت کے پورے ذرائع حرکت کر رہے تھے اور جبر و استبداد ملک پر حکمرانی کر رہا تھا۔ ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک دس سال کے نتائج پر موصوف روشنی

ڈالتے ہوئے بتانے لگے :

”ان دس سالوں کے اندر ۵ لاکھ ایسی شادیاں ہوئیں جو اس قانون کے خلاف تھیں۔ لوگ شریعتِ اسلامی کے مطابق نکاح منعقد کر لیتے تھے اور اُسے حکومت سے مخفی رکھتے تھے۔ بالآخر جب حکومت کے علم میں ان خلاف ورزیوں کی مسلسل اطلاعات آنے لگیں تو حکومت کی طرف سے ایک ضمنی قانون جاری کیا گیا جس کی رُو سے ایسی غیر قانونی شادیوں کو ”قانونی قرار دے دیا گیا اور انہیں باقاعدہ رجسٹرڈ کر دیا گیا اور خلاف ورزی کرنے والوں کو تمام سرکاری فیسیں معاف کر دی گئیں۔ ۱۹۳۵ء ہی میں اِس نوعیت کا ایک اور ”قانونِ معافی“ صادر ہوا۔ ان تفصیلات کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مذکورہ دس سالوں کے اندر جو خفیہ شادیاں ہوئیں۔ وہ اُن شادیوں سے دوگنی تھیں جو اِن سالوں کے اندر ترکی کے مختلف اضلاع میں سرکاری رجسٹروں میں درج کی گئیں۔ کیونکہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اِس عرصہ میں رجسٹرڈ شادیوں کی تعداد تین لاکھ چھ ہزار کے قریب تھیں جب کہ خفیہ شادیوں کی تعداد ۵ لاکھ کے قریب تھی۔“

نئے عائلی قوانین کا انجام

عائلی قانون کا یہ انجام میرے لیے حیرت انگیز تو تھا مگر ناقابلِ فہم نہیں تھا۔ اس لیے کہ خود پاکستان کے اندر اس قانون نے جو معاشرتی کشمکش پیدا کر رکھی ہے وہ لوگوں کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اس سے فرار کے لیے نئے نئے راستے

نکالیں۔ پاکستانی قوم جو عرصۂ دراز تک غلامی کی زندگی بسر کرتی رہی ہے اور جس کی وجہ سے اُس کے اندر وہ بہت سی خصوصیتیں معدوم ہو گئی ہیں جو آزاد قوم کے شایانِ شان ہیں۔ اُس کے لیے بھی غیر اسلامی عائلی قانون گوارا کرنا مشکل ہو رہا ہے کجا کہ تُرک قوم، جو غلامی کی لعنت سے پاک رہی ہے اور جس کے پاس عائلی قوانین کا نہایت ترقی یافتہ نظام مجلّۂ احکام عدلیہ کی شکل میں موجود تھا۔ مَیں نے شیخ نقشوجی سے درخواست کی کہ وہ اِس موضوع پر مزید روشنی ڈالیں۔ بلکہ مَیں نے اِس موضوع کے بارے میں اپنی شدید دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کے عائلی قوانین کا خلاصہ بھی پیش کیا، اور انہیں یہ لطیفہ بھی سُنایا کہ شروع شروع میں جب یہ قانون نافذ کیا گیا تو ایک یونین کونسل کے چیئرمین نے ایک شخص کو یہ وارننگ دی تھی کہ اُس نے پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اپنی دُوسری شادی ایامِ عدت گزارنے سے پہلے کیوں کر لی ہے۔ شیخ اِس پر خوب ہنسے اور فرمانے لگے کہ ایسے لطائف کی ہمارے ہاں بھی کمی نہیں رہی۔ مگر درحقیقت تُرک عوام نے نئے عائلی قوانین کو دل سے ہرگز قبول نہیں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اِن قوانین کے اجراء کے بعد عوام کے اندر ایک اصطلاح چل پڑی جسے عربی میں "تنخائل" کہتے ہیں، یعنی "دوست گری"۔ یہ اصطلاح خفیہ طور پر شہروں سے نکلی اور قصبوں اور دیہات تک پھیل گئی۔ دوسرے معنوں میں یہ "خفیہ اصطلاح" ایک سے زائد شادی کے لیے جواز کا فتویٰ تھی۔ اور ہو سکتا ہے کہ اِسے رواج دینے میں بعض علماء کا ہاتھ ہو۔ اس اصطلاح کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی شخص اسلامی طریقے کے مطابق دوسری شادی کر لیتا ہے اور قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے

وہ دوسری بیوی کو باقاعدہ "بیوی" کہنے کے بجائے "دوست" (Girl Friend) کہہ دیتا ہے تو قانون اس پر راضی ہو جاتا ہے اور شرعاً نکاح پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ اُس کا نکاح درست اور مطابقِ شریعت ہے۔ چنانچہ لوگ اپنے اپنے علاقوں میں حسبِ ضرورت دوسری شادیاں رچاتے اور جب قانون کی باز پرس ہوتی تو کہ دیتے کہ دوسری عورت میری دوست ہے۔ قانون اِس تاویل کے آگے دم بخود ہو جاتا۔ کیونکہ نئے قانون کی رُو سے دوسری "شادی" ممنوع تھی، "دوست گری" ممنوع نہ تھی۔ "قانونی بیوی" اور "شرعی بیوی" کا یہ فرق صرف ظاہری تھا۔ ورنہ حقوق و فرائض میں دونوں یکساں ہوتی تھیں بلکہ اکثر علاقوں میں یہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ شرعی بیویوں کی اولاد کو یا تو لوگ پوشیدہ رکھتے اور اسے سرکاری کاغذات میں درج نہ کرواتے اور یا قانونی بیوی کے کھاتہ میں درج کروا دیتے۔ ۱۹۳۵ء میں جب پانچ لاکھ غیر قانونی جوڑوں کو قانونی جوڑے تسلیم کر لینے کا قانون صادر ہوا تو اس قانون پر بحث کے دوران یہ بھی بتایا گیا کہ "ان ۵ لاکھ جوڑوں کے ساتھ ۱۰ لاکھ خفیہ بچے بھی موجود ہیں۔" شیخ نصُوحی نے کہا کہ ترکی معاشرے کے اندر جن اُلجھنوں کو سوئٹزرلینڈ کے سِول لانے جنم دیا ہے یہ اُس کی صرف ایک مثال ہے۔ یہ قانون خود سوئٹزرلینڈ میں ناکام ہو چکا ہے۔ اور سوئٹزرلینڈ کا معاشرہ اس کی بدولت تمام مغربی معاشرے سے زیادہ بدتر حالت میں ہے۔ وہاں ہر سو جوڑوں میں سے ۲۵ سے زائد جوڑوں کا انجام طلاق پر ہوتا رہا ہے، اور اب تو یہ نسبت مزید بڑھ چکی ہے۔ مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں کے عقلی دیوالیہ پن کا حال یہ تھا کہ اسلام کے بہترین عائلی قانون

کو منسوخ کر کے اُن لوگوں نے سوئٹزرلینڈ کا یہ ناکام قانون لاکر ترکی قوم پر مسلّط کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ شیخ عمر نصُوحی کے الفاظ میں ترک ملت نے مصطفیٰ کمال کی عائلی اصلاحات کو ہرگز قبول نہیں کیا، اور خاص طور پر ترکی کی دیہی آبادی میں تو اِن اصلاحات کے خلاف آج تک شدید غم و غصّہ پایا جاتا ہے[1]۔ شیخ عجلت میں تھے۔ اور نمازِ تراویح کا وقفہ بھی کم تھا اس لیے یہ مجلس برخاست ہوگئی اور کل کی افطاری کے لیے پرنسپل صاحب کی طرف سے دوبارہ دعوت پیش کی گئی۔ مجلس کے اندر کمال دائے نامی ایک تاجر بھی موجود تھے جن کا اپنا کتب خانہ اور پریس ہے۔ گفتگو کے دوران تو وہ چپ چاپ بیٹھے رہے مگر جب ہم اُٹھنے لگے تو یہ یوسف صالح ترجمہ صاحب سے کہنے لگے کہ میں خلیل حامدی سے نشر و اشاعت کے موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ شیخ عمر نصُوحی تو تشریف لے گئے اور پرنسپل صاحب بھی اپنے بعض معاملات میں مشغول ہو گئے، مگر دوسرے دوست دوبارہ بیٹھ گئے۔

اِسلامی لٹریچر کی طباعت و اشاعت

اسماعیل دائے صاحب نے بتایا کہ یغمور پریس کے نام سے اُن کے پاس اچھا چھاپہ خانہ ہے۔ کتابوں کی ایک دکان بھی ہے۔ ان کا مقصد اِسلامی فکر کا

---

[1] ترکی کے ایک اور اسلام پسند وکیل سے بھی ترکی کے دَورِ عثمانی کے قانونی اور عدالتی نظام اور لادینی دَور کی اصلاحات کے موضوع پر گفتگو ہوئی جسے ہم آگے چل کر نقل کریں گے۔

فروغ اور اسلامی لٹریچر کی اشاعت ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ وہ مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی کی کتابیں ترکی زبان میں وسیع پیمانے پر شائع کریں اور پھیلائیں۔ مَیں نے اُن سے دریافت کیا کہ مولانا مودودی کی جو کتابیں اب تک ترکی میں چھپ چکی ہیں اُن کی اشاعت اور ترویج کا کیا حال ہے ؟ یوسف صالح قرجہ کی وساطت سے انہوں نے بتایا کہ مولانا مودودی ترکی کے تعلیم یافتہ طبقہ میں کافی متعارف ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ میں وہ خاصے مقبول ہیں۔ طلبہ کا اِسلام پسند عنصر بڑے شوق اور اہتمام سے مولانا کی کتابیں پڑھتا ہے۔ ان کتابوں کی مقبولیت میں حالات کے تغیّر سے روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ بازار کی مانگ کا لحاظ کرتے ہوئے اِن کتابوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلایا جائے۔ طباعت اور ظاہری حُسن کا معیار بھی بلند سے بلند تر ہو اور قیمت بھی مناسب ہو۔ اسماعیل دائے صاحب نے پُورے عزم و شیفتگی کے ساتھ کہا کہ مَیں اِن شرائط کے ساتھ کما حقہٗ مولانا مودودی کے لٹریچر سے بازار کو بے نیاز کر سکتا ہوں۔ مزید براں میری آرزو ہے کہ مولانا مودودی کے افکار کو اس ملک کے اندر پھیلانے کی مجھے سعادت نصیب ہو۔ ۴۰، ۵۰ برس کے اس وجیہ و شکیل تاجر کے یہ الفاظ بڑے خلوص اور قلبی نظافت کی غمازی کر رہے تھے اور میرا دل یہ سوچ رہا تھا کہ جس ملک سے اِسلامی مطبوعات کو چُن چُن کر نکالا گیا تھا، اسلامی کتب خانوں کو تالے لگا دیئے گئے تھے اور اِسلامی فکر و نظر کے حامل لٹریچر کے گاہکوں کو جیل خانوں کی ہوا کھلائی گئی تھی، وہ ملک اپنی اسلامیت سے پھر بھی بیگانہ نہ ہو سکا اور رُبع صدی کے اندر اندر اُس نے باہر سے زبردستی

در آمد کردہ نظریات و خیالات کو مکھی کی طرح اُگلنا شروع کر دیا۔ راقم الحروف نے اسماعیل دائے صاحب کے جذبات کا پورا پورا شکریہ ادا کیا اور اُن سے عرض کیا کہ ترکی کے اندر مولانا مودودی کی کتابوں کے تراجم کی طباعت و اشاعت کا انتظام ترکی ہی کے ایک دوست کو سونپا گیا ہے۔ مَیں اُن تک آپ کی خواہش پہنچا دوں گا اور خود مولانا مودودی مدظلہ العالی کے علم میں بھی لاؤں گا۔ یہ حضرات مناسب فیصلے سے آپ کو مطلع کر دیں گے۔ یوسف صالح قرجہ صاحب نے اسماعیل دائے صاحب کی بھرپور تائید کی۔ بلکہ انہوں نے بتایا کہ مَیں علامہ اقبال مرحوم کی کتاب "بالِ جبریل" کا ترکی میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ کتاب کا اکثر و بیشتر حصّہ مکمل ہو چکا ہے اور یہ ترجمہ بھی اسمٰعیل دائے صاحب ہی شائع کریں گے۔ یوسف صالح قرجہ صاحب کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ موصوف لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضلِ ادب کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ اُردو زبان و ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اور اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود اُردو زبان کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ بالِ جبریل کے ترجمہ کا مسودہ بھی اُن کے پاس ہی تھا۔ انہوں نے بڑے فخر و انبساط کے ساتھ اُسے نکالا اور ساقی نامہ کا ترجمہ سُنانا شروع کر دیا۔ بلکہ انہوں نے خود اصل ساقی نامہ بھی مجھے اُردو میں سُنایا۔ لہجہ اور تلفظ دونوں خوب تھے۔ عربوں کے اندر اردو نوازی کی صرف دو مثالیں ملتی ہیں۔ ایک ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم، جنہوں نے علامہ اقبالؒ کے فارسی اور اُردو کلام کا عربی اشعار میں ترجمہ کیا ہے۔ اور دوسرے یمن کے نامور اسلامی رہنما مرحوم محمود محمد زبیری، جنہوں نے مولانا حالیؒ کی مسدس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ان شاذ مثالوں کے

سواعربوں کے اندر اُردو سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں کی۔ ترکوں کے اندر اُردو کی رغبت بہت دیکھی۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کی برسی

مدرسۂ امام وخطیب سے فارغ ہو کر دوستوں کی معیت میں واپس ہوٹل آیا اور ابھی ہوٹل کے دروازے پر ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ آج مولانا جلال الدین رومیؒ کی برسی ہے اور استنبول کے ایک سینما ہال میں ترکی کی ایک کلچرل ایسوسی ایشن کی طرف سے اس موقعہ پر سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے، مجلس کا آغاز ہونے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے اور مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ میں نے پہلے تو اس پروگرام میں شرکت سے معذرت پیش کر دی، لیکن نائف آفندی، پروفیسر عُزیر اور عبد القادر سیزگین نے بشدّت اصرار کیا کہ میں اس دعوت کو قبول کر لوں اور کچھ نہ کچھ ضرور اظہارِ خیال کروں۔ مجھے اظہارِ خیال سے تو گریز نہیں تھا۔ صرف یہ اُلجھن تھی کہ جس نوعیت کا یہ اجتماع ہو رہا ہے اور جس تنظیم کے اہتمام میں ہو رہا ہے وہ میرے ذوق اور رُجحانِ طبع کے خلاف ہے۔ مگر دوستوں نے کہا کہ اِس اجتماع میں زیادہ تر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شریک ہوں گے اور مجھے پوری آزادی ہو گی کہ میں جو بات چاہوں، کہوں۔ اور تو ہر لحاظ سے دوستوں نے مجھے شرکت پر آمادہ کر لیا مگر ابھی ایک اور رکاوٹ درمیان میں حائل تھی۔ وہ یہ تھی کہ اِس پروگرام کا ایک جُز یہ بھی ہے کہ " درویشانِ حضرت مولانا" بربط و نَے کی دُھنوں پر " رقصِ مولوی " کا مظاہرہ کریں گے۔ خاکسار اس " کلچرل شو" میں شریک ہونے پر دل کو مطمئن نہیں پا رہا تھا۔ مگر بالآخر یہ طے ہُوا کہ جب

یہ "شو" شروع ہو تو ہم اُٹھ آئیں گے۔"

استنبول کے گندیش (Gundes) سینما کے وسیع وعریض حال میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ پورا ہال کھچا کھچ بھر رہا ہے اور مرد و زن کا مخلوط جمِ غفیر موجود ہے۔ اکثریت نوجوان طلبہ اور طالبات کی ہے۔ کالجوں کے اساتذہ بھی شریک ہیں۔ سیاسی جماعتوں سے وابستہ عنصر بھی شریکِ محفل ہے۔ مرد تمام کوٹ اور پتلون سے آراستہ اور عورتیں بلا استثناء اسکرٹ اور منی اسکرٹ میں ملبوس۔ راقم الحروف قدم قدم پر دوستوں کو کوستا رہا کہ کہاں لے کر آگئے۔ اور وہ برابر تسلّی دیتے رہے کہ کلمۂ حق ایسی ہی جگہوں پر بلند ہونا چاہیئے۔

تعلیماتِ رومیؒ کے موضوع پر تقریر

اسٹیج سیکرٹری نے پروگرام کے افتتاح کا اعلان کیا۔ اور اعلان میں یہ بھی بتادیا کہ اس اجتماع میں مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیرِ جماعتِ اسلامی پاکستان کے سیکرٹری بھی تقریر کریں گے۔ اس اعلان پر جب تالیاں بجائی گئیں تو مَیں نے نائف آفندی سے پوچھا کہ حاضرین میں مولانا مودودی کو جاننے والے کتنے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یقیناً ان میں اکثر لوگ مولانا کو جاننے والے ہوں گے۔ الغرض قرآن پاک کی تلاوت کے بغیر ہی پروگرام کی طرح ڈال دی گئی۔ سب سے پہلے استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر آف فلاسفی ڈاکٹر نورالدّین صاحب نے مولانا رومیؒ پر ایک متوسط مقالہ پڑھا۔ ماسوائے چند فارسی اشعار کے راقم الحروف تو کچھ سمجھ نہ سکا۔ البتہ ساتھیوں نے اس کی تعریف کی اور اس کے بعد میری باری آگئی۔ ماحول و اجتماع کی نامناسبت

اور طبیعت کے انقباض کے باوجود میں نے اظہارِ خیال کی جرأت کر ڈالی۔ مترجم کی وساطت سے سب سے پہلے حاضرین کو میں نے پاکستان کے مسلمانوں کا سلام پہنچایا۔ ترک قوم کو پاکستان اور اہلِ پاکستان سے جو عمیق محبت بلکہ گرویدگی کی حد تک عقیدت ہے اُس کا اثر یہ تھا کہ پاکستان کا نام زبان پر آتے ہی حاضرین نے تالیوں سے ہال کو سر پر اٹھا لیا اور دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرا بھی کچھ حوصلہ بڑھ گیا۔ اختصار کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ مولانا جلال الدین رُومیؒ اگرچہ قونیہ کے ایک بزرگ انسان تھے، مگر اُن کی دعوت اور تعلیم سے پورا عالمِ اسلامی آگاہ ہے۔ پاکستان کا ہر پڑھا لکھا شخص اُن کی عقیدت کا دم بھرتا ہے۔ ان کی کتاب مثنوی دینی مدارس کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ مولانا رُومیؒ کا مشن گوشہ نشین قوم تیار کرنا نہیں تھا بلکہ انہوں نے ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کے عہدِ زوال میں آنکھ کھولی تھی اور ایک نبض شناس طبیب کی طرح انہوں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ تاتاریوں کی یلغار کے سامنے سلجوقیوں کی پسپائی کا سبب یہ ہے کہ قوم کے اندر جہاد کی رُوح مضمحل ہو چکی ہے اور اخلاقی امراض اور دنیا پرستی کی وبا نے ملّتِ اسلامی کو کھوکھلا بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ مولانا روم نے ملّت کو جہاد پر اُکسایا اور علماء کو سرزنش کی کہ علم کو اکتسابِ دنیا کا ذریعہ بنانے کے بجائے اُسے دین کے تقاضے پورے کرنے پر صرف کرنا چاہیئے۔ لفظ "جہاد" کا حاضرین نے خوب خیر مقدم کیا اور طویل تالیوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ جذبۂ جہاد ترک قوم کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے جو نہ پہلے کسی کے نکالنے سے نکلا ہے اور نہ آئندہ نکل سکتا ہے۔

مولانا رومیؒ کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے مَیں نے بتایا کہ اگر ہم حضرت رومیؒ کی دعوت و تعلیم کو چند حرفوں میں بیان کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ: مولاناؒ نے انسان کو توجہ دلائی کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے اور اس کائنات میں اُس کا مرتبہ و مقام کیا ہے؟ انسان نے جب کبھی اس اہم نکتے کو سمجھنے میں غفلت کی ہے تو وہ لازماً دو خرابیوں میں سے ایک نہ ایک خرابی میں مبتلا ہوُا ہے۔ وہ انحطاط کی جانب لڑھکا ہے اور یا اُس نے استکبار کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اور ان دونوں صورتوں میں اُس نے اپنی تباہی کا سامان بھی فراہم کیا ہے اور دنیا کی تباہی کا موجب بھی بنا ہے۔

اوّل الذکر شکل میں انسان اپنے اصل مرتبہ و مقام سے نیچے گرتا ہے۔ اور دنیا کے اندر اپنا صحیح منصب سمجھنے میں غلطی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے خالقِ حقیقی کی بندگی کے بجائے وہ ہر دوسری مخلوق کو خالق ٹھیرانے لگتا ہے۔ کبھی آگ کو خدا مانتا ہے، کبھی حجر و شجر کے آگے سر بسجود ہوتا ہے اور کبھی اپنے ہی جیسے انسانوں کی خدائی ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ قومی لیڈروں کو خدائی کا درجہ دینے لگتا ہے۔ اُن کے خود ساختہ قوانین کو واجب الاتباع تسلیم کرتا ہے۔ اُن کی مطلق العنانی کے آگے گھٹنے ٹیکتا ہے۔ اُن کے مجسّمے تراش تراش کر ہر اہم مقام پر نصب کرتا ہے۔ چونکہ یہ صورتِ حال امرِ واقع کے منافی ہے اس لیے اس سے دُنیا کے اندر خرابی کی متعدّد صورتیں جنم لیتی ہیں اس طرح ثانی الذکر شکل یعنی استکبار کا راستہ بھی غلط اور خلافِ فطرت

ہے۔ اس شکل میں انسان اپنے اصل مقام کو فراموش کر کے اس وہم کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ خود خدا ہے اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا سودا اُس کے دماغ میں سما جاتا ہے۔ وہ یہ تصوّر کر بیٹھتا ہے کہ اس کائنات کا مَیں ہی مالک ہوں۔ مَیں آقا ہوں اور دوسرے غلام۔ مَیں حاکمِ اعلیٰ ہوں اور دوسرے میری رعایا۔ مَیں جو چاہوں قانون بناؤں اور جسے چاہوں ماروں اور جلاؤں۔ مَیں وہ ہوں کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ۔ یہ راستہ بھی غلط نگاہی اور سودائے خام کی ایک ایجاد ہے۔ اور انسانی زندگی کے لیے سراسر موجبِ لعنت اور باعثِ ذلت ہے۔ جہاں اس زعمِ باطل کا آغاز ہوا، فساد اور ہلاکت خیزی نے سر اُٹھا لیا۔

انسان کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ یہ باور کرے کہ نہ وہ خود خالق ہے، نہ بغیر کسی خالق کے خود پیدا ہو گیا ہے، اور نہ خدا کے سوا کوئی دوسری ہستی یہ حیثیت رکھتی ہے کہ اُسے خالق اور معبود مانا جائے اور اُس کے قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اللہ کے سوا انسان کا کوئی معبود نہیں ہے، اور اُس کے قانون کے سوا کسی قانون کی بالاتری درست نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ جو تعلیم انسان کو بھیجی ہے وہی انسانی زندگی کو اور انسانی تہذیب و تمدّن کو اعتدال پر قائم رکھ سکتی ہے اور دُنیا و آخرت میں انسان کی کامیابی کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ یہ ہے مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کا حاصل۔ اور ہم بڑے خوش قسمت ہوں گے اگر ہم نے ان کی اِس تعلیم کو اپنے لیے حرزِ جان بنا لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حاضرین میرے تمام اشارے سمجھ رہے تھے۔ وہ ایک ایک جملے پر دل کھول کر اپنے ردِّ عمل کا اظہار کر رہے تھے۔ اور خود

راقم الحروف بھی محوِ حیرت تھا کہ لادینی نظامِ تعلیم کے اندر تربیت پانے والے یہ نوجوان اور مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا چلتا پھرتا نمونہ پیش کرنے والے یہ مرد و زن اِس حد تک اسلام کے قریب آ رہے ہیں کہ انسانی حاکمیت پر واضح تنقید اور اللہ کی حاکمیت کی صریح دعوت کو نہ صرف سُننے کے لیے تیار ہو گئے ہیں بلکہ اُس پر بے پناہ تحسین کا اظہار کر رہے ہیں اور معنی خیز طریقے سے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ اب وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ انسان کی خدائی کی بساط لپیٹ جائے گی اور صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی شریعت کا ڈنکا بجے گا۔

ترکوں اور عربوں کا فرق

حاضرین کے اُچھلتے ہوئے جذبات کا اندازہ لگا کر میں نے اپنی بات کا رُخ بدل دیا اور خالص جذباتی رنگ میں عرض کیا: اَے تُرک بھائیو، اَے سلطان محمد الفاتح کے وارثو، حضرت ابو ایوبؓ انصاری کے پڑوسیو، سلطان عبدالحمید ثانی کے جانشینو، محمد صلی اللہ علیہ وسلمؐ کے عاشقو اور قرآن کے علمبردارو! تم نے ماضی میں جو کردار ادا کیا ہے وہ اسلامی تاریخ کے اندر سنہری حروف میں ثبت ہو چکا ہے۔ اب پھر اللہ کا نام لے کر اُٹھو اور عظمتِ رفتہ کو زندہ کر دکھاؤ۔ ویانا کی فصیلیں اور افریقہ و ایشیا کے جبال و صحرا پھر اُسی پرچم کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں جو اسلام کے غلبہ کی علامت تھا۔ تُرکوں کے آخری عہد پر بڑی تنقیدیں کی گئی ہیں۔ لیکن تنقید کرنے والوں سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے اِس کردار کی کوئی مثال پیش کر سکا ہے کہ یہودیوں کی طرف سے اُسے دولت کے انبار پیش کیے گئے اور اُن کے عوض اُس سے صرف یہ مطالبہ

کیا گیا کہ فلسطین کے اندر یہودیوں کو آباد ہونے کی اجازت دے دی جائے، مگر سلطان نے یہ کہہ کر اس دولت کو ٹھکرا دیا کہ بیت المقدس کی سرزمین کی مٹی کی ایک مٹھی بھی میرے لیے تمہارے تمام انبار ہائے سیم وزر سے زیادہ قیمتی ہے۔ فلسطین ہمارے آباؤ اجداد نے خون سے خریدا تھا اور ہم سے بھی خون کے عوض ہی خریدا جا سکتا ہے[1] اس کردار کے مقابلے میں دوسرا کردار یہ نظر آ

---

[1] سلطان عبدالحمید ثانی کے ساتھ دو مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا ہے اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۸۸۰ء میں ایک فرمان جاری کیا تھا جس کی رُو سے سلطان نے دولتِ عثمانیہ میں جس میں فلسطین بھی شامل تھا یہودیوں کی اجتماعی ہجرت کو ممنوع قرار دے دیا۔ اور اسی طرح یہودی زائرین کو فلسطین کے اندر تین ماہ سے زیادہ مدت تک رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں نے مختلف طریقوں سے سلطان عبدالحمید کو اپنے چنگل میں لینے کی کوشش کی۔ بیت المقدس کے سابق گورنر عبداللہ التل اپنی نامور کتاب —— "خطر الصهيونية على الاسلام والمسيحية" میں رقم طراز ہیں:

"۱۹۰۰ء میں ایک یہودی قرہ صو افندی ایک ترک افسر عارف بک کی وساطت سے سلطان عبدالحمید کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور سلطان کو بتایا کہ اُسے صیہونی جمعیت کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ اور اُس کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ سلطان یافا، غزّہ اور بحر مردار کے درمیان واقع اراضی جمعیت صیہونی کو عطا کر دے اور جمعیّت صیہونی اس کے عوض ۵۰ لاکھ سنہری عثمانی پونڈ سرکاری خزانے کو پیش کرنے کے لیے تیار ہے۔ علاوہ ازیں ۲۰ لاکھ پونڈ جمعیت حکومت کو بلا سُود قرض دے گی۔ اس قرض کی واپسی کی مدّت بھی حکومت معین کر سکتی (بقیہ صفحہ ۶۳ پر)

رہا ہے کہ نہ صرف بیت المقدس بلکہ پورا فلسطین یوں یہودیوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ گویا کسی سابقہ احسان کا بدلہ چکانے کے لیے اُسے تحفہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہو۔

(بقیہ صلا ۶۲ سے) ہے "سلطان یہ بات سُن کر سخت غضب ناک ہوا۔ اور اس یہودی کو اپنے دربار سے نکلوا دیا۔" (ص ۳۰۰)

دوسری مرتبہ مشہور صیہونی لیڈر ڈاکٹر ہرتزل نے سلطان کے پاس ایسا ہی پیغام بھجوایا۔ اس مرتبہ بھی سلطان مرحوم نے اس پیغام کا جواب یہ بھجوایا:

"ڈاکٹر ہرتزل کو سمجھا دیا جائے کہ وہ اس معاملے میں کوئی سنجیدہ قدم اٹھانے سے گریز کرے۔ میں فلسطین کی بالشت بھر زمین سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ فلسطین میری شخصی ملکیت نہیں ہے۔ یہ میری قوم کی ملکیت ہے۔ میری قوم نے اس سرزمین کی خاطر مدتوں جہاد کیا ہے۔ اور اسے اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہودیوں کو اپنے لاکھوں پونڈ اپنے ہی پاس رکھنے چاہئیں۔ ہاں، اگر کسی روز میری سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تو اس وقت وہ فلسطین بلا قیمت ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر میرے جیتے جی یہ نہیں ہوگا۔ میرے لیے یہ آسان ہے کہ میرے جسم کی تکا بوٹی کر دی جائے۔ مگر یہ آسان نہیں ہے کہ فلسطین کو میری سلطنت سے کاٹ دیا جائے۔ یہ بات ہرگز ہرگز نہ ہوگی۔ میں کبھی اس بات پر صاد نہیں کر سکتا کہ ہماری زندگی میں ہمارے جسم کے حصے بخرے کر دیئے جائیں۔" (جریدۃ المجتمع، کویت شمارہ ۴، اگست ۱۹۷۰ء۔)

اس کے بعد یہودیوں نے سلطان عبدالحمید مرحوم کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کی تفصیل "القومیۃ والغزو الفکری" کے مصنف محمد جلال کشک کی زبان سے سُنیئے:

"سلطان کے جوابات سے مایوس ہو کر یہودیوں نے ایک خفیہ تنظیم قائم (باقی صلا ۶۴ پر)

میں اس موقع پر برملا اپنے اس خیال کا اظہار کیے دیتا ہوں کہ فلسطین کو عرب ہرگز نہیں آزاد کرا سکیں گے۔ بلکہ انشاء اللہ اسے ترک اور پاکستانی آزاد کرائیں گے۔

سلطان عبدالحمید ثانی کا نام اب ترکوں کے لیے بڑا محبوب نام ہے۔ میں نے جب اُن کا ذکر کیا تو اس پر خوب خوب حاضرین نے داد دی۔ اور یہ نکتہ کہ اب فلسطین کو ترک آزاد کرائیں گے اس قدر گرم جوشی کے اظہار کا مرکز بن گیا کہ طُورانی ترکوں کی وہ تمام کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں جو ترک ملّت کے دلوں میں

(بقیہ صلا۶۴ سے) کی جس کے اکثر ارکان دونمہ یہودی تھے۔ ترک دونمہ ان یہودیوں کو کہتے ہیں جو اسپین میں عیسائیوں کے مظالم سے بھاگ کر عثمانی سلطنت میں آگئے تھے۔ اور سالونیک کے جزیرہ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر بہ باطن یہودیت پر قائم تھے۔ جاوید بک اور انجمن اتّحاد و ترقی کے کئی ممبر اس گروہ کے لوگوں پر مشتمل تھے۔ اس خفیہ تنظیم نے حریت پسند ترکوں سے رابطہ قائم کیا اور انجمن اتّحاد و ترقی میں بھی گُھس گئے۔ اور انور بک اور نیازی جیسے نوجوان ترکوں کے ساتھ اس نے تعاون کیا۔ اور بالآخر یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا کہ ترکانِ احرار نے جب سلطان عبدالحمید کو معزول کیا۔ تو معزولی کا پیغام پہنچانے کے لیے خلیفہ کے پاس جس شخص کو بھیجا وہ قرہ صوافندی تھا۔ یہ سالونیک کے یہودیوں کا پیشوا تھا اور ۱۹۰۰ء میں سلطان اسے اپنے قصر سے دھکے دے کر نکلوا چکا تھا۔ اس طرح یہودیوں نے سلطان مرحوم سے نہایت ذلّت آمیز طریقہ سے اِنتقام لے کر چھوڑا۔"

(ص ۲۱۴)

عربوں کے خلاف نفرت کا بیج بونے کے لیے انہوں نے صرف کی تھیں۔ کیونکہ طورانی قومیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تُرکوں کو عربوں کے کسی مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تُرک اور عرب دو متضاد حقیقتوں کا نام ہے جو ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ مگر اب تُرک نوجوان قبلۂ اوّل، حرم ثالث اور سرزمین انبیاء کے ساتھ گہری وابستگی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور اسے یہودیوں سے آزاد کرانے کے لیے بیتاب ہے۔

میری مختصر تقریر ختم ہوئی تو اس اجتماع کا آخری پروگرام شروع ہو گیا۔ اور "رقصِ مولوی" کا تماشا تو نہ ہوا البتہ مثنوی کو چند نوجوانوں نے بربط و نے کی آواز پر سنایا۔ محفل کے اختتام پر دوستوں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ حاضرین کے ظاہر اور باطن میں کتنا فرق نکلا۔ بظاہر اسلام کی بات ان کے آگے کرنا لاحاصل معلوم ہوتا تھا مگر درحقیقت اِن کے ذہن اسلام کے لیے وا ہو رہے ہیں۔ ہال کے اندر ہمارے پُرانے دوست عیسیٰ یوسف الپتگین بھی مِل گئے۔ موصوف مشرقی ترکستان (جسے اب سِنگ کیانگ کا نام دے دیا گیا ہے) کی حکومت کے چیف سیکرٹری رہ چکے ہیں اور چین کے سُرخ استبداد نے جب ترکستانی مسلمانوں پر مظالم توڑے تو یہ ہجرت کر کے تُرکی میں پناہ گزین ہو گئے۔ ٹوٹی پھوٹی اُردو اور کچھ نہ کچھ انگریزی بول لیتے ہیں۔ اور اب نیشنل سنٹر آف ایسٹرن ترکستان کے پریذیڈنٹ ہیں اور مشرقی ترکستان کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔ مولانا محترم کے ساتھ بڑی محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ مَیں کل ہوٹل میں آ کر تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

سیرِ استنبول

اجتماع سے فارغ ہو کر سب دوستوں کے ہمراہ واپس ہوٹل پہنچ گیا۔
میں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے نائف آفندی سے کہا کہ میری وجہ سے آپ حضرات کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہے میں آپ لوگوں کے نجی مشاغل میں حارج ہو رہا ہوں۔ میری اس ندامت کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ ہم ابھی آپ کو استنبول کی گشت کروانا چاہتے ہیں۔ استنبول کے دن تو بلاشبہ کیف آور ہیں مگر استنبول کی راتیں بھی بڑی رُوح پرور اور نشاط آگیں ہیں۔ اور خصوصاً رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں استنبول کا منظر دیدنی ہے۔ مسجدیں بقعۂ نور بن رہی ہیں۔ ان میں قرآن خوانی کی محفلیں جم رہی ہیں۔ روحانی مناظر کے علاوہ استنبول کے قدرتی مناظر بھی بڑے دِلکش اور دیدہ نواز ہیں۔ احباب کی اس پیش کش کو غنیمت جانا کہ اتفاق سے استنبول کی سیاحت کا یہ موقع میسر آ گیا ہے اور وہ بھی رمضان کے بابرکت اور رُوح پرور مہینے میں۔ مدّتوں سے سُن رہے تھے کہ ترکی کا رمضان بڑا پُر رونق اور کیف بداماں ہوتا ہے۔ اِس بات نے زیارتِ ترکی کی آرزو کو شدید تر کر رکھا تھا اور اب بحسنِ اتفاق یہ آرزو بروئے کار آ رہی ہے۔ اس خاکسار کی حیثیت کیا ہے۔ دوستوں کے یہ جذباتِ اُلفت ومحبّت، اور سعادتوں کی یہ بارش صرف مولانا مودودی مدظلہ العالی سے نسبت کی وجہ سے ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

استنبول میں داخل ہونے سے قبل اس کا مجموعی نقشہ سمجھ لیں تاکہ اس تاریخی شہر کی مرکزی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ ہمیں استنبول کی تفریح گاہوں



جامع سلطان بايزيد ، استنبول

اور ساحلی مقامات سے کوئی تعرّض نہیں ، نہ اس کے چشمے اور خیابان ہمارے لیے وجۂ کشش ہیں ، اور نہ اس کے کوچہ و بازار موضوعِ سخن۔ کہا جاتا ہے استنبول "موطن العجائب" ہے ، "عروس الشرق" ہے ، تحفۂ فطرت ہے۔ حجاز کی شاہراہوں پر یہ فقرے جگہ جگہ پبلسٹی بورڈوں پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ بے شک یہ درست ہے کہ۔ استعماری اقوام اس کے جمالِ طبعی اور سحر طرازی پر ہمیشہ رال ٹپکاتی رہی ہیں۔ عام سیّاح بھی استنبول کی پُر کیف تفریحات اور وہاں کے شُبلل دریچاں اور سمندر کی امواجِ پیچاں کو مرکزِ نگاہ بناتے ہیں۔ خود ترکی کے ادارہ ہائے سیاحت بھی دنیا کو یہی دعوت دیتے ہیں کہ حسین خوابوں کی تعبیر کے لیے استنبول کا مشاہدہ کیا جائے۔ مگر ہماری نگاہِ جستجو جس بات کی ٹوہ میں تھی وہ یہ کہ جو شہر پہلے بازنطینی کلیسا کی راجدھانی تھا اور پھر اُسے اسلامی خلافت کا مرکز بننے کی سعادت ملی اور وہ تقریباً ۵ سو سال تک یورپ ، ایشیا اور افریقہ کا "آستانہ" بنا رہا ، اب وہ اپنی اس پچھلی تاریخ کی کس حد تک نمائندگی کر رہا ہے ؟ خاتمۂ خلافت اور لادینی استبداد کے تسلّط نے اس کے رنگ ڈھنگ میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے۔ اور کیا اب ہم یہ توقع باندھ سکتے ہیں کہ آئندہ پھر کبھی یہ شہر اسلام کا ناقابلِ شکست حصار بن جائے اور کوئی نیا محمد الفاتح اُٹھ کر ملحدانہ تہذیب کی حکمرانی کے بجائے اس پر اسلامی تہذیب کا سکّہ رواں کر دے ؟

استنبول کی جغرافیائی اہمیّت

استنبول کی جغرافیائی ساخت بڑی دلچسپ ہے۔ بنیادی طور پر یہ دو

حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک ایشیائی حصّہ اور دُوسرا یورپی حصّہ۔ ان دونوں حصّوں کو آبنائے باسفورس باہم جُدا کرتی ہے۔ آبنائے باسفورس کا شمالی سرا بحرِ اسود سے ملتا ہے اور جنوبی سرا بحرِ مرمرا سے۔ آبنائے باسفورس کی کُل لمبائی ۲۶ میل ہے اور چوڑائی کسی مقام پر ۵ میل تک پہنچی ہوئی ہے اور کسی مقام پر صرف ایک میل۔ شمال سے جو جہاز بحرِ اسود سے نکل کر آبنائے باسفورس میں داخل ہو گا وہ استنبول کے دونوں حصّوں کے بیچوں بیچ آبنائے باسفورس کو چیرتا ہوا جنوب میں بحرِ مرمرا کے پانی میں اُتر جائے گا اور بحرِ مرمرا کو عبور کرتا ہوا درّۂ دانیال سے نکل کر بحرِ ایجین کے سینہ پر سوار ہو جائے گا۔ بحرِ ایجین سے بحرِ ابیض میں داخل ہونے کے لیے اُسے لازماً درّۂ دانیال سے گزرنا پڑے گا۔ اس طرح بحرِ اسود سے بحرِ ابیض میں جانے کے لیے ہر جہاز کو پہلے آبنائے باسفورس سے گزرنے کی اجازت لینی پڑے گی، کیونکہ اگر استنبول اُسے پروانۂ راہداری نہیں دے گا تو وہ کسی طور آبنائے باسفورس سے نہیں گزر سکتا۔ اور اس کے بعد درّۂ دانیال بھی ایسی تنگ آبنائے ہے کہ حکومت تُرکی با قاعدہ اجازت لیے بغیر وہاں سے بھی عبور محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رُوس کا بحری بیڑا صدیوں سے بحرِ اسود کے ٹھنڈے پانیوں سے نکل کر بحرِ ابیض کے گرم پانیوں میں اشنان کرنے کے لیے غلطاں و پیچاں رہا۔ مگر تُرکوں نے اُسے گزرنے کی کبھی اجازت نہ دی۔ اور اب تُرکی تاریخ میں پہلی مرتبہ عرب و اسرائیل کی جنگ جون ۶۷ء میں روسی بحری بیڑے نے گرم پانیوں کا مزہ چکھا ہے۔ یہ تُرکی حکومت کا بہت بڑا اقدام ہے کہ اُس نے جس بیڑے کو صدیوں تک

یہاں سے گزرنے کی اجازت نہ دی بالآخر اُسے عربوں کے مفاد کی خاطر اپنی تاریخی عداوت اور ناقابلِ تغیر روایت کو تج دینا پڑا۔ اس کی تہ میں صرف اسلامی اخوت کا محرک کام کر رہا ہے۔ ورنہ تُرک قومیت اور عرب قومیت کے درمیان جنگِ عظیم اوّل میں جو تنافر پیدا ہو چکا تھا وہ اس قدر شدید تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتے تھے مگر یہ دونوں قومیتیں باہم مصافحہ نہیں کر سکتی تھیں۔

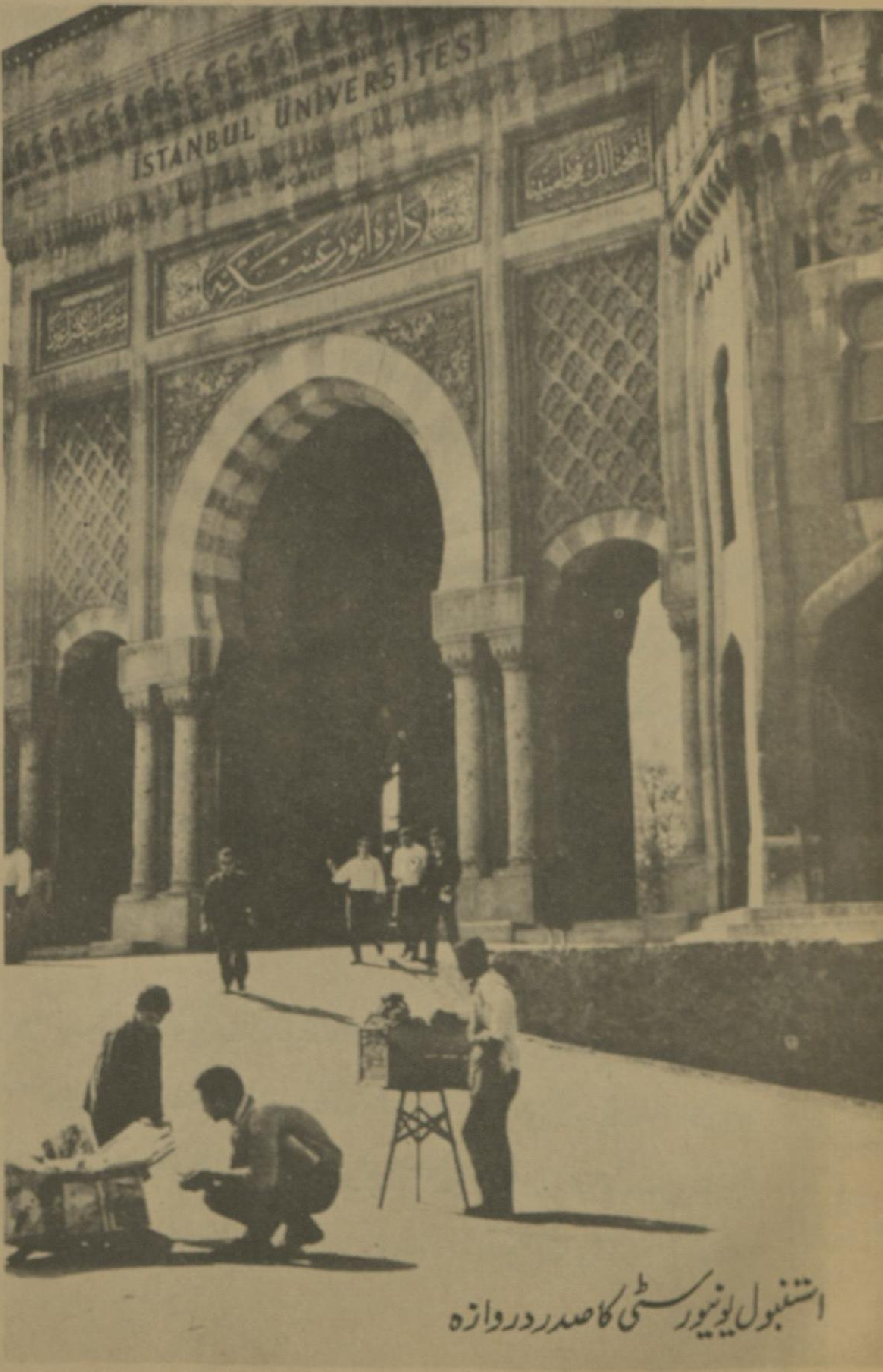
ایشیا اور یورپ کا نقطۂ اتصال

یُوں آبنائے باسفورس بحرِ اسود اور بحرِ ابیض کا درمیانی واسطہ بھی ہے اور ایشیا اور یورپ کے مابین حلقۂ اتصال بھی۔ تُرکی کا جو علاقہ ایشیا میں ہے وہ اناضول یا اناطولیہ کہلاتا ہے اور جو یورپ میں ہے اُسے رومیلی یعنی بلادِ روم بھی کہتے ہیں اور تراقیا (Thrace) بھی۔ تمام دنیا کے شہروں میں استنبول کی یہ نرالی شان ہے کہ اُس کی نصف آبادی ایشیا میں رہتی ہے اور نصف یورپ میں۔ استنبول یورپ اور ایشیا کا جغرافیائی پُل ہی نہیں ہے بلکہ دونوں برِاعظموں کے درمیان تہذیبی، تمدّنی اور تاریخی پُل بھی ہے۔ استنبول کا یورپی حصّہ بھی جنوبی سمت میں دو حصّوں میں بٹ جاتا ہے۔ اِن دونوں حصّوں کے درمیان آبنائے باسفورس کے بطن سے نکلی ہوئی ایک خلیج ۵ میل تک اندر چلی گئی ہے۔ تُرک اِس خلیج کو شاخ زریں (گولڈن ہارن) کا نام دیتے ہیں۔ اس خلیج پر دو پُل قائم ہیں۔ جن سے عام آبادی صبح و شام اِدھر سے اُدھر منتقل ہوتی رہتی ہے اور کسی سے عبور کرنے کا ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ ان میں سے ایک پُل رات کو اُٹھا

دیا جاتا ہے تاکہ جہاز گزر سکیں۔ دُوسرا پُل سلطان عبدالحمید ثانی نے بنوایا تھا۔ اُس نے اسے نہایت کشادہ رکھا۔ اس پر لوگوں نے سُلطان کو غلط اندیش کہا۔ مگر اب آبادی کے ہجوم اور ٹریفک کے اژدحام نے خود یہ ثابت کر دیا ہے کہ سلطان دُور اندیش تھا۔ اگر اتنا کشادہ پُل نہ بنا تا تو وہ موجودہ ٹریفک کا ہرگز متحمل نہ ہوتا۔ یورپی حصّے کے دونوں منطقوں کے الگ الگ نام ہیں۔ ایک کا نام فاتح ہے جو جنوب میں ہے۔ اور محمد الفاتح کے نام منسوب ہے۔ آیا صوفیہ اسی میں واقع ہے۔ اور دوسرے کا نام بیوغلو ہے۔ یہ بھی بہت قدیم نام ہے جو درحقیقت اس منطقے کے ایک بڑے محلّے کا نام تھا۔ اور پُورے منطقے کو بھی اسی نام سے موسوم کر دیا گیا۔ استنبول کے ایشیائی حصّے کو اسکودار یا قاضی کوئی کہتے ہیں۔ دونوں پُرانے تاریخی نام ہیں۔ یہ تینوں حصّے (ایشیائی حصّہ اور یورپی حصّہ کے دونوں منطقے) اب استنبول کہلاتے ہیں۔ ورنہ ماضی میں یورپی حصّہ الگ شہر تھا، اور اُسے قسطنطنیہ کہا جاتا تھا اور ایشیائی حصّہ اسکودار تھا۔ عثمانی سلطان بایزید اوّل یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) نے جب پہلی مرتبہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تو اُس وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا۔ اور جب محمد الفاتح نے ۱۴۵۳ء میں اس شہر کو پُوری طرح زیرِ نگین کیا تو زبانِ خلق نے اُسے احتراماً اسلامبول پکارا۔ یعنی اسلام کی عظمت و کثرت کا نشان۔

استنبول کی تاریخ پر ایک نظر

عثمانی سلاطین کے جو کارنامے تاریخ نے سنہری قلم سے لکھے ہیں ان میں سرِفہرست یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے ۱۴۵۳ء میں بازنطینی سلطنت کے اس



استنبول یونیورسٹی کا صدر دروازہ

مرکز کو فتح کر کے قلمروِ اسلام کا ایک جُز بنا دیا۔ اور پھر یہاں سے یورپ میں اسلام کا داخلہ شروع ہو گیا، اور ویانا کی فصیلوں نے پرچمِ اسلام کو بوسہ دیا۔

قسطنطنیہ کی بنیاد بائزنیطیم (Byzantiunm) کے نام سے ۶۵۸ء قبل مسیح رکھی گئی۔ اس کے بانیٔ اوّل کا نام بیزاس بتایا جاتا ہے جو ان یونانی اقوام کا ایک بادشاہ تھا جو ۶۵۸ء قبل مسیح میں یہاں آکر آباد ہوئی تھیں۔ بادشاہ مارکس اور بلیوس کے عہد میں اس شہر کا نام اُس کے نانا انطونیون کے نام پر رکھ دیا گیا۔ بعد میں انطونیون سے بدل کر نیو روما اس کا نام پڑا۔ اور آخر کار ۳۳۰ء میں رومی بادشاہ قسطنطین نے اس شہر کو رومی سلطنت کا پایۂ تخت بنایا اور اسی کے نام پر اِس شہر کا نام قسطنطنیہ مشہور ہوا۔ بادشاہ قسطنطین نے اس شہر کو روما کے طرز پر تعمیر کرنا چاہا۔ اس کے اردگرد ایک بہت بڑی فصیل کھینچی جس کے بعض حصّے اب تک باقی ہیں۔ استنبول کے ہوائی اڈہ سے جو شخص شہر میں داخل ہوگا اِس فصیل کے شکستہ و منہدم حصّے اُس کا استقبال کریں گے۔ تھیوڈوسیس کے بعد یہ شہر مشرق کی رومی امپائر کا پایۂ تخت بنا، یہاں تک کہ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ۵۳ دنوں کے محاصرہ کے بعد سلطان محمد الفاتح نے اِسے فتح کر لیا اور یہ صلیب کے بجائے ہلال اور تثلیث کے بجائے توحید کا نشان بن گیا۔

اس شہر کے وجود میں آنے کے بعد سلطان محمد الفاتح کے عہد تک انتیس بار اِس کا محاصرہ ہوا۔ لیکن صرف آٹھ مرتبہ حملہ آور فوج اس کے اندر داخل ہو سکی۔ مسلمانوں نے گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا ہے۔ مُسندِ امام احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لتفتحنّ القسطنطنية، فلنعم

الامیر امیرھا ولنعم الجیش جیشھا (تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کروگے، اس شہر کا امیر بھی خوب ہوگا، اور یہ فاتح فوج بھی خوب ہوگی) ۔ نیز بخاری و مسلم اور مسند احمد میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میری امّت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اُسے بخش دیا ہے ۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس پیشین گوئی کے یقین پر اور اس سعادت و مغفرت کی طلب میں بارہا مسلمان مجاہدین نے اس شہر کا رُخ کیا ۔ سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ نے ۴۸ ھ (۶۶۸ء) میں ایک لشکر قسطنطنیہ روانہ کیا ۔ اس میں بہت سے صحابۂ کرام نے شرکت فرمائی ۔ مثلاً حضرت ابو ایّوب انصاری، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمر، حضرت ابنِ زُبیر، حضرت عُبادہ بن صامت، حضرت ابوالدرداء وغیرہ رضی اللہ عنہم ۔ اس کے بعد عہدِ صحابہؓ میں دو مرتبہ اور محاصرا کیا گیا ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانۂ خلافت میں چوتھی مرتبہ مَسْلَمہ نے ، ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا ۔ پانچواں حملہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) میں ہوا ۔ چھٹا مہدی عباسی کے زمانہ میں ۱۶۴ھ (۷۸۰ء) میں ہارون الرشید کے زیرِ قیادت ہوا، اور ساتواں ہارون الرشید کے سپہ سالار عبدالملک نے ۱۸۲ھ (۷۹۸ء) میں کیا ۔ عربوں کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی ۔ پہلے جس عثمانی حکمران نے قسطنطنیہ کی فتح کا عزم کیا وہ سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) ہے ۔ اس سلطان نے دو مرتبہ قسطنطنیہ پر لشکر کشی کی ۔ اس کا پہلا محاصرہ سات ماہ تک قائم رہا اور بالآخر قسطنطنیہ کے حاکم مینوئل کے ساتھ سلطان نے دس سال کے لیے صلح کرکے محاصرہ اُٹھا لیا ۔ اس صلح نامہ میں دوسری متعدد شرائط کے علاوہ سالانہ خراج

کی رقم تیس ہزار طلائی کراؤن مقرر ہوئی۔ نیز مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی جس میں سلطان بایزید نے ترکی قاضی مقرر کیا۔ کلیسائے مشرق کے اس مرکز میں ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کی گئی جو اس شہر کی پہلی مسجد کہلاتی ہے اور موجودہ استنبول یونیورسٹی کے قریب ہے ــــــ یونان میں فتوحات حاصل کرنے کے بعد سلطان بایزید یلدرم نے قسطنطنیہ پر فوراً قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ سلطان قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ تیمور لشکرِ جرار کے ساتھ ایشیائے کوچک میں داخل ہو گیا اور سلطان بایزید کو محاصرہ اُٹھا کر تیمور کے مقابلے پر جانا پڑا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف قسطنطنیہ کی فتح ملتوی ہو گئی بلکہ سلطان بایزید کی شکست سے خود عثمانی سلطنت بھی شدید تباہی سے دوچار ہو گئی۔ اگر تیمور اور بایزید کے درمیان اُس وقت تصادم نہ ہوتا تو قسطنطنیہ ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) ہی میں مسلمانوں کے ہاتھ آجاتا۔ بایزید کی وفات کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ موسیٰ نے یہ مہم پایۂ تکمیل تک پہنچانی چاہی لیکن اپنے بھائی شہزادہ محمد کے ساتھ اس کی نزاع نے فتح قسطنطنیہ کو کھٹائی میں ڈال دیا۔ آخری بار سلطان مراد ثانی نے ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کی فتح کا عزم کیا مگر رومی شہنشاہ نے اظہارِ اطاعت کیا۔ اور سلطان نے اس سے متاثر ہو کر محاصرہ اُٹھا لیا۔ غرض سلطان محمد ثانی، جسے بعد میں محمد الفاتح کہا گیا، سے پہلے مجاہدینِ اسلام گیارہ مرتبہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکے تھے۔ لیکن کامیابی کا سہرا محمد الفاتح کا منتظر تھا۔ صحابۂ کرام کے مقدس خون نے جس مہم کی طرح ڈالی تھی اُس کا تکملہ اِسی نوجوان عثمانی ترک کی تلوار سے صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہونے والا تھا۔ محمد الفاتح نے اِسے عثمانی قلمرو کا دارالحکومت بنایا۔

۴۷۰ سال تک یہ عثمانیوں کا مرکز رہا۔ مگر ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال نے اس کی یہ حیثیت ختم کردی اور اس کے بجائے انقرہ کو ترکی کا صدر مقام قرار دیدیا۔

استنبول سے پہلے عثمانیوں کے مراکز

استنبول کو اپنا مرکز قرار دینے سے پہلے ترکان عثمانی نے ایشیائی ترکی اور یورپ کے علاقوں میں کئی مقامات کو اپنا مرکز قرار دیا۔ یہ تفصیل بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

دولتِ عثمانیہ کے بانی عثمان غازی کے دادا سلیمان شاہ اکثر روایات کے مطابق ۱۲۲۱ء کے لگ بھگ ترکستان (وسط ایشیا) سے ہجرت کرکے اناطولیہ کے مشرقی علاقوں میں آئے۔ مگر منگول درندوں نے یہاں بھی اُدھم مچا رکھا تھا۔ اس لیے ان کے مظالم کے خوف سے واپس ہوگئے۔ راستے ہی میں تھے کہ حلب میں قلعہ جَعبَر کے پاس ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے لڑکوں میں سے ارطغرل دوبارہ مشرقی اناطولیہ رجوع کرگئے اور ارض روم کے قرب وجوار میں اُتر گئے۔ اس وقت یہاں سلجوقی سلطان علاؤالدین کیقباد کی حکومت تھی۔ علاؤالدین کیقباد نے ارطغرل اور ان کے ساتھی مہاجر ترکوں کی بہادری، جذبۂ جہاد، بہترین کردار اور اناطولیہ پر حملہ آور ہونے والے منگولوں اور رومیوں کے مقابلے میں کامیاب جنگیں لڑنے پر ان کی بڑی قدر افزائی کی اور ان خدمات کے صلہ میں انگورہ (انقرہ) کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ چنانچہ ان ترک مہاجروں نے پہلی بار انقرہ کے نواح میں سکونت اختیار کی۔ بعد میں سلجوقی سلطان نے انہیں مغربی اناطولیہ کا ایک قصبہ سوگود بھی انہیں بخش دیا۔ اور سوگود ان ترکوں کا مرکز بن گیا۔ اور ۱۲۲۸ء سے لے کر ۱۳۰۰ء تک سوگود ہی ان کا مرکز رہا۔ ارطغرل کی وفات کے بعد ان


جامع مراد۔ بُرصہ
(عثمانی ترکوں کی پہلی مسجد)

علاقوں کی امارت (جو رومی امپائر کی سرحدوں سے ملتے تھے) ارطغرل کے بیٹے عثمان کے ہاتھ میں آگئی۔ (عثمان کا دورِ حکومت ۱۳۰۱ء تا ۱۳۲۶ء) اس نے چند سال میں رومی علاقوں اور بالخصوص ینی شہر نامی قصبہ پر قبضہ کر لیا اور اُسے اپنا مرکز بنا لیا۔ اور پھر وہ یہیں سے رومی گورنروں پر ترکتازیاں کرتا رہا اور ان کا زور توڑتا رہا۔ مگر بوجوہ اس شہر کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اس لیے عثمان غازی کے بیٹے اُورخان نے ایشیا میں رومیوں کے عظیم الشان مرکز بُرصہ کو اپنی نومولود سلطنت کا مرکز بنا لیا۔ بُرصہ کا پہلا محاصرہ ۱۳۱۴ء میں عثمان غازی کے دور میں ہوا تھا۔ ۱۳۲۶ء میں بُرصہ عثمانیوں کا دارالحکومت بنا۔ بُرصہ انقرہ سے ۷۰ میل دُور مغرب میں واقع ہے۔ سلطان اُورخان کے بیٹے مراد اول کے دور میں پہلی مرتبہ عثمانی ترک یورپ میں داخل ہوئے۔ کیونکہ مراد اوّل نے ۱۳۶۱ء میں چورلو اور دیمہ توقہ پر حملے کیے اور انہیں فتح کر لیا۔ اور اس کے بعد سلطان مراد اول نے بُرصہ چھوڑ کر دیمہ توقہ (جو اب یونان میں واقع ہے) کو اپنی راجدھانی بنا لیا۔ اسی سال یعنی ۱۳۶۱ء میں یورپ کا ایک اور اہم شہر مراد اول کے سپہ سالاروں شاہین بیگ اور حاجی ایل بیگی نے فتح کر لیا۔ اس شہر کا قدیم نام ایڈریانوپل ہے اور آج کل اسے اُدرنہ کہا جاتا ہے۔ (یہ موجودہ یورپی ترکی کا دوسرا بڑا شہر ہے) ۱۳۶۸ء میں مراد اول نے ادرنہ کو دولت عثمانیہ کا پایۂ تخت بنا لیا۔ اس شہر کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ یورپ کو جانے والے تمام راستے یہیں سے ہو کر گزرتے تھے۔ اُدرنہ ۱۴۵۳ء تک عثمانی سلطنت کا پایۂ تخت رہا۔ یہاں تک کہ سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں استنبول کو فتح کر لیا اور دارالحکومت وہاں منتقل کر لیا۔

گویا استنبول عثمانیوں کا چھٹا دارالحکومت ہے۔ ذیل کے گراف کے مطابق عثمانی ترکوں کے مراکز کی تفصیل یہ ہے:

۱	سوگود	۱۲۸۸ء تا ۱۳۰۰ء	ارطغرل کے دور میں	ایشیائی ترکی
۲	ینی شہر	۱۳۰۰ء تا ۱۳۲۶ء	غازی عثمان کے دور میں	ایشیائی ترکی
۳	برصہ	۱۳۲۶ء تا ۱۳۶۱ء	اُورخان کے دور میں	ایشیائی ترکی
۴	دلمیہ توقہ	۱۳۶۱ء تا ۱۳۶۸ء	مراد اول کے دور میں	یورپ
۵	ادرنہ	۱۳۶۸ء تا ۱۴۵۳ء	مراد اول ہی کے دور میں	یورپ
۶	استنبول	۱۴۵۳ء تا ۱۹۲۲ء	محمد الفاتح کے دور میں	یورپ ایشیا

رمضان کا خیر مقدم

پروفیسر عزیز، نائقت آفندی اور شیخ یوسف کے ہمراہ استنبول کی سیر شبانہ کو نکلے۔ موٹر شیخ یوسف کی تھی۔ خود ہی اسے چلا رہے تھے۔ شیخ یوسف بھی بڑے دلچسپ اور زندہ دل آدمی ہیں۔ پاکستان دیکھ چکے ہیں۔ بتانے لگے کہ تبلیغی جماعت کے ہمراہ انہوں نے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں گشت کی ہے۔ پاکستانیوں کے اخلاق اور دین داری کے بڑے مدّاح ہیں۔ دوبارہ پاکستان آنے کا عزم و شوق رکھتے ہیں۔ تجارت پیشہ ہیں۔ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی دونوں کی محبت سے لبریز ہیں۔

رات کا وقت ہے۔ استنبول کی شاہراہیں قمقموں سے جگمگا رہی ہیں۔ سردی اگرچہ شدید ہے مگر بایں ہمہ بازاروں میں بڑی رونق ہے۔ رمضان المبارک کا



جامع علاؤالدین کیقباد - بُرصہ

عشرۂ آخر ہے ۔ خریداری کا عروج ہے ۔ عید کی خوشی اور مسرّت سے ہر شخص جھوم رہا ہے ۔ مسجدوں کے مینار بجلی کے قمقموں سے سج رہے ہیں ۔ ہر مسجد بقعۂ نور ہے ۔ ہر مسجد میں تلاوتِ قرآن پاک ہو رہی ہے ۔ رات کی مسحور کن فضا میں قرآن کا نغمۂ سرمدی دلوں کی دنیا میں عجب بے خودی پیدا کر رہا ہے ۔ ترکوں کی قرآن خوانی ضرب المثل ہے ۔ مصری بھی اس میدان میں کم نہیں مگر مصریوں میں تصنّع اور ترکوں میں بے ساختگی ہے ۔ یہاں مسجد کی تزئین میں ایک نرالی بات دیکھی ۔ ہر مسجد کی پیشانی پر قمقموں کا ہالہ بنا ہوتا ہے جسے مُحَیّا کہتے ہیں ۔ یہ خالص عربی لفظ ہے جس کا معنیٰ ہے چہرہ مُہرہ ۔ ہر مسجد کا اپنا الگ مُحَیّا ہے جو قرآن کی کسی آیت یا حدیث کے کسی ٹکڑے پر مشتمل ہے ۔ مثلاً ینی جامع کا مُحَیّا یہ ہے کہ " بزرگی و برتری صرف اللہ کے لیے ہے ۔ " مسجدوں کی یہ تزئین و تنویر رمضان المبارک کی خوشی کا ایک مظہر ہے ۔

بیوغلو کی حالت

مَیں جس علاقہ میں مقیم ہُوں یہ یورپی حصّہ کا وہ منطقہ ہے جسے فاتح کہتے ہیں ۔ ہم اس منطقہ سے نکل کر غلطہ پُل کے ذریعہ خلیج گولڈن ہارن کو عبور کرنے کے بعد دوسرے منطقہ یعنی بیوغلو میں چلے گئے ۔ فاتح میں مسجدوں کی کثرت ہے اور بیوغلو میں مسجدیں کم ہیں ۔ بیوغلو خوشحال ، تجارت پیشہ اور اہلِ ثروت لوگوں کا منطقہ ہے ۔ اس منطقہ کا سب سے نامور محلہ " تقسیم " ہے ۔ استنبول کا ہلٹن ہوٹل اسی محلّہ میں ہے جو بیروت کے فینیسا اور سان جارج سے بھی بازی لے گیا ہے ۔ جگہ جگہ نشاط گاہیں ہیں ۔ استنبول کے ساحل قدرتی حُسن کو دوبالا کرنے

کا موجب بھی ہیں اور استنبول کی اخلاقی زندگی کی تباہی کا سب سے بڑا محرک بھی۔ باسفورس، مرمرا اور قرن ذہبی کے سواحل پر ۲۳ نہانے کے مرکز ہیں جو سال بھر رنگا رنگ تفریحی سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ اور ۲۰ "صنم کدے" ہیں جو ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی سبز پوش پہاڑیوں کی چوٹی پر قائم ہیں۔ دُنیا بھر کے سیّاح یہاں ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اور سیاحت کے پردے میں عشرت و نشاط کی دل کھول کر داد دی جاتی ہے۔ مشرق کے شہروں میں بیروت اور اسکندریہ کو اسی سیاحت نے تباہ کیا ہے۔ اس میں استنبول بھی پیچھے نہیں ہے۔ بیوغلو میں عورتوں کی گہما گہمی بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ بھی نشاط گاہوں کی کثرت ہے۔ شہری عورتوں کی اکثریت کو منی اسکرٹ میں دیکھا۔ گو سردی بلا کی ہے مگر اسکرٹ اُس سے بھی بڑی بلا بن کر نازل ہو چکا ہے۔ اور اس کی خاطر عورت نے ہر تکلیف گوارا کر لی ہے۔ ستم یہ ہے کہ خود مردوں نے سر سے پاؤں تک گرم لباس پہن رکھا ہے۔ مگر عورت کو فیشن کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ امیر الشعراء شوقی بک نے کہا تھا: خدعوھا بقولھم حسناء (مردوں نے عورت کو خوبصورت کہہ کہہ کر اسے بیوقوف بنا رکھا ہے۔)

یہودی اور دونمہ

بیوغلو کی ساز و سامان سے لبریز دکانوں، بلند و بالا عمارات، کشادہ شاہراہوں، اور ہوٹلوں اور پارکوں کی بہتات اور جگہ جگہ مصطفےٰ کمال کے مجسموں کو دیکھ کر میں نے ساتھیوں سے پُوچھا کہ فاتح کی نسبت بیوغلو میں یہ چکا چوند زیادہ کیوں ہے؟ ناقف آفندی نے میرا یہ سوال اپنے دوسرے رفیقوں تک منتقل کیا۔

پروفیسر عُزیر نے بتایا کہ بیوغلو دراصل تجارتی مرکز بھی ہے اور اونچے سرکاری ملازمین بھی زیادہ تر یہیں رہتے ہیں۔ تجارت پر زیادہ تر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ بنک کاری کا تمام تر نظام اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بڑی بڑی تجارتی نمائش گاہیں جو نظر آرہی ہیں ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ضرور کسی نہ کسی یہودی یا مرتّد کا سرمایہ ہوگا۔ وہ دیکھیے جگمگاتا ہوا بورڈ "عثمانلی بنکاسی" (بنک آف عثمانیہ)۔ یہ یہاں کا سب سے مضبوط بنک ہے اور یہودی سرمائے کار ہین منّت۔ بیوغلو کی آبادی میں یہ دونوں گروہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہودی تو میری سمجھ میں آ گئے۔ مگر یہ "مرتد" کیا ہوتے ہیں؟ پروفیسر عُزیر سے مَیں نے اِس کی وضاحت چاہی کہنے لگے جو لوگ لادینیت کے حامی ہیں، اور پسِ پردہ یہودیوں کے ساتھ میل جول رکھتے ہیں ہم انہیں مرتّد کہتے ہیں۔ نالق آفندی نے بات کاٹ کر اس نکتے پر اپنی طرف سے مزید روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ تُرکی میں ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو یہودی الاصل ہے۔ یہ گروہ اپنی مخصوص اغراض و مصالح کے تحت بظاہر مسلمان ہو گیا۔ اس گروہ کے افراد انجمن اتّحاد و ترقی کے اندر بھی گھس گئے۔ فوج کے اندر بھی انھوں نے کلیدی آسامیوں پر قبضہ کر لیا عثمانی خلافت کے آخری ایام میں باب عالی کے اندر بھی ان کو نفوذ حاصل تھا۔ "ولایاتِ ثلاثہ" اِن کا اصل مرکز تھا۔ ولایاتِ ثلاثہ کا دوسرا نام مقدونیہ ہے اور اس میں تین صوبے شامل ہیں: سلانیک (Selonik)، مُناستر (Monostir) اور قوصوہ (Kosoyd) ترکوں کے اندر قومیت کے جراثیم پھیلانے میں اس گروہ کی کوشش کا بڑا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ تُرک اس گروہ کو دُونما بھی کہتے ہیں۔ مگر اب

دونما کے بجائے مرتد کی اصطلاح رائج ہوگئی ہے۔ نائف آفندی نے اس ضمن میں ترکی کے بعض چوٹی کے لیڈروں کا بھی نام لیا جو اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے یا اس کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ بات پہلے کسی حد تک مخفی تھی مگر اب عام لوگ اس سے واقف ہو گئے ہیں۔ شام اور لبنان کے اندر جن ترک والیوں نے عربوں کے ساتھ تشدد برتا تھا ان کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا اور وہ عربوں کو ترکوں سے متنفر کرنے کے لیے یہ حربے اختیار کرتے تھے۔ مثلاً جمال پاشا جو شام کا آخری ترکی گورنر تھا اور اس نے دمشق کے چوراہے میں شامی لیڈروں کو پھانسیاں دی تھیں، یہ شخص دونمہ تھا۔ ترک مسلمان اس سے آج تک برأت کا اظہار کرتے ہیں۔

مرتد کی یہ تشریح میرے لیے نیا انکشاف تو نہ تھی۔ البتہ اس پہلو سے یہ قابلِ لحاظ تھی کہ اب تک ہم نے باہر بیٹھ کر ترکی کی تاریخ حاضر کا جو مطالعہ کیا ہے اور اس سے جو جو اسباب و نتائج اخذ کیے ہیں وہ صحیح ہیں۔ امیر شکیب ارسلان نے اپنی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" میں دونما کی طرف جا بجا اشارے کیے ہیں، بلکہ مرحوم نے اُسی زمانے میں اِس گروہ کی اصلیت کا پردہ چاک کر دیا تھا جب یہ عربوں اور ترکوں کے درمیان عداوت کے بیج بو رہا تھا۔ اسی طرح مراکش کے ماہنامہ دعوۃ الحق میں بھی چند سال قبل ایک تحقیقی مضمون دونما کی تاریخ پر شائع ہوا تھا۔ اِس مضمون کے لکھنے والے ترکی میں مراکش کے سابق سفیر عبدالقادر القادری ہیں۔ انہوں نے بھی دونما کے اسی کردار کو دلائل کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ اور خود ترک علماء اور اہلِ نظر کے حوالوں سے دونما کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ ترکی



استنبول کا ایک منظر

کے ماضی کو بھی اسی گروہ نے داغ دار کیا ہے اور حال کی تصویر بنانے میں بھی اس کا نمایاں کردار ہے۔ تُرک مسلمان اب دونما سے اس قدر محتاط ہو گئے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہ سلانیک کا رہنے والا ہے تو سب کے کان کھڑے ہو جائیں گے۔

شیخ یوسف جو قائد قافلہ تھے درمیان میں کہیں کہیں اپنی بات کر دیتے۔ مگر اُن کی گفتگو میں ٹیپ کا بند پاکستان اور ہندوستان ہوتے۔ بار بار وہ پاکستان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے۔ راستے میں مجھے یہ بھی بتاتے رہتے کہ یہ فلاں عمارت اور یہ فلاں قلعہ ہے۔ مگر رات اپنی تمام رعنائیوں اور ضو پاشیوں کے باوجود کسی نووارد کو اُن بھیدوں سے آگاہ نہیں کرتی جن سے آگاہ کرنا دن کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ جامع سلطان احمد ہے۔ یہ جامع سلطان سلیم ہے۔ یہ نیلگوں مسجد ہے۔ یہ حصار رومیلی ہے، یہ یہاں کا مشہور قصر توپ کاپی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس وہ مجھے بہت کچھ بتاتے رہے اور بالآخر وہ موٹر کو ایک پہاڑی پر چڑھا کر لے گئے اور کہنے لگے اُتر کر استنبول کا مرکز دیکھیں۔

استنبول کا منظر

استنبول کا منظر عجیب دلفریب اور مسحور کُن ہے۔ سامنے آبنائے باسفورس ہے اور آبنائے کے اُس پار اسکودار، یعنی ایشیائی استنبول۔ دائیں ہاتھ آبنائے باسفورس کے اندر سے ایک خلیج (گولڈن ہارن) نکل رہی ہے جو یورپی استنبول میں داخل ہوتی ہے اور بیوغلو کو فاتح سے جُدا کرتی ہوئی ۵ میل تک اندر چلی جاتی ہے۔ پُشت پر بیوغلو ہے۔ جدھر دیکھیں ساحل ہی ساحل ہے۔ شہر کی

روشنیاں آبنائے باسفورس، گولڈن ہارن اور مرمرہ کے سبز اور نیلگوں پانیوں کے اندر عکس ریز ہو رہی ہیں۔ نیل کے ساحل بھی دیکھے ہیں۔ بیروت کو بھی بحرِ ابیض کے اندر ضَو بار دیکھا ہے۔ مشرق میں ان دونوں مقاموں کی بڑی دُھوم ہے۔ مگر استنبول کا یہ منظر دونوں کو مات کر رہا ہے۔ اہلِ مغرب اسے دنیا کی جنّت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ترک قوم پرست اِسے "وطن کی زینت" اور "تاریخی ثروت" قرار دیتے ہیں۔ مؤرخین کے الفاظ میں یہ تاریخ کا مہد (گہوارہ) بھی ہے اور تاریخ کی لحد (مدفن) بھی۔ خلافتِ عثمانی کے طویل دَور میں ملّت اسلامی کا بالاتفاق یہ فیصلہ رہا کہ استنبول اسلام کی آنکھوں کی ٹھنڈک، مجاہدین کی کچھار اور اہلِ نظر کا آستانہ ہے۔ نائف آفندی نے ایشیائی ساحل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سامنے کی طرف جو قلعہ نظر آرہا ہے یہ محمد الفاتح نے بنایا تھا۔ محمد الفاتح نے جب قسطنطنیہ کی فتح کا ارادہ کیا تو اس کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اُن میں سے ایک یہ قلعہ ہے۔ آبنائے باسفورس کے نیلگوں پانی پر جب نظر ڈالی تو دیکھا کہ متعدد جہاز حرکت میں ہیں اور خاصی چہل پہل ہے۔ ان میں کچھ جہاز تو مقامی ہیں اور یہاں کی عام آبادی کی نقل و حرکت کے لیے مخصوص ہیں۔ اور کچھ غیر ملکی ہیں۔ نائف صاحب اور دوسرے ساتھی جہازوں کی نقل و حرکت کا دیر تک جائزہ لیتے رہے اور آپس میں ترکی زبان میں تبصرے کرتے رہے۔ پھر خود ہی مجھے بھی رازدارانہ طریقے سے بتانے لگے کہ آج کل روس کے جنگی جہاز یہاں سے بالعموم گزرتے رہتے ہیں۔ رُوس کا جو جنگی بیڑہ اس وقت بحرِ ابیض میں ہے اُس کی سپلائی مسلسل جاری ہے[1]۔ میں نے مزاحًا

---

[1] بحرِ ابیض میں اس وقت روس کے ۵۰ جنگی جہاز موجود ہیں

اُن سے کہا کہ جن عربوں کی خاطر آپ نے رُوس کے لیے یہ آبی شاہراہ کھولی ہے وہ تو آپ کے دُشمنوں کو آپ کے خلاف فوجی امداد دیتے رہے ہیں۔ پروفیسر عزیر نے فوراً میرا اشارہ بھانپ لیا اور رمعًا جواب دیا کہ کیا عرب لیڈروں کی غلطیوں کا انتقام ہم عرب عوام سے لیں؟ عرب عوام مسلمان ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔ ہم اُن کے غم والم میں برابر کے شریک ہیں۔ شیخ یوسف نے تو یہاں تک حسبِ معمول جذباتی انداز میں کہہ دیا کہ اگر فلسطینی چھاپہ مار مجھے لینے کے لیے تیار ہوں تو مَیں آج ہی تمام کاروبار ختم کر کے اسرائیلیوں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ اپنی حکومت کی عرب نواز پالیسی پر یہ لوگ بہت مطمئن تھے اور سلیمان دَیرل کے حق میں اچھے جذبات کا اظہار کرتے رہے۔

کنارِ آبِ جُو

پہاڑی سے ہم بڑی مشکل سے موٹر کو اُتار سکے۔ شیخ یوسف نے جوشِ محبت میں پہاڑی پر موٹر کو چڑھا تو دیا تھا مگر راستہ بہت خراب تھا۔ اُترتے ہوئے سخت تکلیف ہوئی۔ پہاڑ سے اُتر کر ہم آبنائے باسفورس کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہو لیے تا کہ آبنائے کا قریب سے نظارہ دیکھیں۔ سڑک ساحل سے اس قدر متّصل ہے کہ اس پر لبِ ساحل کا اطلاق محاورۃً نہیں حقیقتاً ہوتا ہے۔ سڑک کے ایک طرف کنارۂ سمندر۔ دوسری طرف محلّات کا سلسلۂ طویل۔ اور محلّات بھی قدیم اور ساخت کے لحاظ سے عجوبۂ روزگار۔ نائف آفندی میری وضاحت طلب نظروں کو دیکھ کر بتانے لگے کہ یہ محلات مختلف عثمانی حکّام کے ہیں۔ عثمانی امراء اور بیگمات گرمیوں کے ایام میں ان محلّات میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ ان کی تعمیر میں اس

بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ بالاخانوں کے اندر بیٹھنے والے باہر کے نظارے سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں مگر باہر سے اندر کی کوئی چیز نظر نہ آئے۔ یہ محلات اپنی کہنگی کے باوجود نہایت دیدہ زیب اور جاذبِ نگاہ ہیں۔ ترکوں کے طرزِ تعمیر کو دنیا نے سراہا ہے۔ بلکہ تاریخ میں اُن کے طرزِ تعمیر کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا۔ اس بارے میں اُن کے ذوقِ بلند اور مہارتِ فن نے بڑی جولانیاں دکھائی ہیں۔ عمارات کی تعمیر میں عثمانی آرٹ کی نمایاں خوبیاں ایسی ہیں کہ آج بھی اُن کی باقیات کو دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں ہے۔ عمارات کی تعمیر میں عثمانی آرٹ کی نمایاں خوبیاں یہ ہیں کہ یہ عمارات مضبوطی اور استحکام میں بے نظیر ہیں۔ نزاکت، دلآویزی اور نقش و نگار کے لحاظ سے لاجواب۔ موسمی تغیرات کا سامنا کرنے کے لیے حد درجہ موزوں۔ اور اسلام کے اُصولِ معاشرت اور اسلامی آداب و قیود کے عین مطابق۔ عثمانی عمارتوں کو دیکھ کر انسان بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ترکوں کی تہذیب میں حیا، شرافت، پاکیزگی اور غیرت کو کس درجہ پذیرائی حاصل تھی۔

چلتے چلتے ہم ایک قہوہ خانہ پر جا کر رُک گئے۔ آبنائے باسفورس کا یہ نہایت مشہور و معروف ساحلی قہوہ خانہ ہے۔ اس کا نام ہے قہوہ امیر خان۔ بہت پُرانے اور تاریخی قہوہ خانوں میں سے ہے اور قاہرہ کے محلہ خان الخلیلی کے قہوہ خانوں کا ہم عصر۔ یہاں کی چائے اور ثَعْلَب بہت مشہور ہے۔ ان کی خاطر دُور دراز سے لوگ آتے ہیں۔ ثعلب ہمارے ہاں کی فرنی اور عربوں کی مُحَلَّبِیہ سے ملتی جلتی ایک چیز ہے۔ نائف آفندی کہنے لگے قہوہ امیر خاں کے بارے میں یہاں مشہور ہے کہ اگر کسی شخص کی عقل کام نہ کر رہی ہو تو اس قہوہ خانے

میں کچھ وقت گزار جائے۔ یہاں کے قہوہ اور ثعلب سے بھی شاد کام ہو اور آبنائے باسفورس کی نیلگوں موجوں سے بھی محظوظ۔ عثمانی دور میں اُمراء اور حکّام تک قہوہ امیرخان میں آتے تھے اور عام آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارتے تھے۔ اس قہوہ خانہ کو بعض سلاطینِ آلِ عثمان کی پذیرائی کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ نائف آفندی مجھ سے پوچھنے لگے کہ ہماری ثعلب آپ کو پسند آئی؟ راقم الحروف نے عرض کیا کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں میری پسند و ناپسند ناقابلِ اعتبار ہے۔ آپ کی ثعلب کے بارے میں اصل فیصلہ مولانا مودودی کر سکتے ہیں۔ کہنے لگے کہ ہم نے آج سے تہیّہ کر لیا ہے کہ مولانا مودودی اگر ترکی آئیں تو انہیں ایک رات یہاں ضرور لائیں گے۔ اور پھر مُسکرا کر کہنے لگے کہ "اسد (شیر) گجا اور ثعلب (لومڑی) کجا"۔ یہ فقرہ دوستوں کے لیے کافی دیر تک دل لگی کا موضوع بنا رہا۔

پُورے ساحل پر ایک اور عجیب منظر دیکھا۔ مچھیروں نے پانی میں جال ڈال رکھے تھے اور خوب ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ چونکہ ساتھ ساتھ مچھلی فروخت ہو رہی تھی اس لیے ہنگامہ آرائی نے پُورے ساحل کو مچھلی مارکیٹ بنا رکھا تھا۔ مچھیرے چھوٹے چھوٹے اسٹیمروں پر سوار تھے۔ اسٹیمروں کے اندر ہی بیٹھ کر انہوں نے بڑے بڑے جال پانی میں ڈال رکھے تھے۔ ایک میل کے فاصلہ تک پانی کے اندر اسٹیمر ہی اسٹیمر دوڑتے پھر رہے تھے۔ اور جو مچھلی ان کے ذریعہ شکار کی جاتی تھی اُسے کنارے پر ڈھیر کرتے جاتے تھے۔ دلاّل بھی موقع پر موجود تھے۔ مچھلی کا شکار اور اس کی تھوک کے حساب سے فروخت بیک وقت

جاری تھی۔ اس شدید سردی میں جب کہ اعضائے جسم یخ ہو رہے تھے ترکی مچھیروں کی اس جفاکشی اور سخت جانی پر طبیعت عش عش کر اٹھی۔ ترکی قوم مجموعی طور پر نہایت فعّال اور محنت کش قوم ہے۔ اور اس لحاظ سے پاکستانی قوم سے بہت حد تک مشابہت رکھتی ہے۔ ترکوں کی اس جفاکشی کا ضرورت سے زیادہ احساس اس لیے بھی ہو رہا ہے کہ ابھی ابھی سعودی عرب کی سہل انگار اور سُست رَو قوم کو دیکھ کر آیا ہوں۔ ساحل وہاں بھی ہیں مگر اُن سے استفادہ کرنے والے خال خال۔ ناقت آفندی نے بتایا کہ مچھلی ہماری قومی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ ہے۔ ایک طرف انسانوں کا گروہِ کثیر مچھلی کے شکار میں مگن تھا اور دوسری طرف پرندوں، بطخوں اور مُرغابیوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ سطحِ آب پر تیرتے پھر رہے تھے اور اُسی انداز سے شور مچا رہے تھے جس انداز سے ماہی گیروں نے مچا رکھا تھا۔ جو مچھلی اِنسانوں کی گرفت سے بچ جاتی وہ اس مخلوق کا لقمہ بن جاتی۔ قرآن کی یہ آیت بے ساختہ زبان پر آتی رہی کہ وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَی الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (النحل - ۱۴)

اِسلامی اخوّت کے مظاہر

واپسی کے وقت وہ کٹھن راستہ ہم نے ترک کر دیا جس سے آئے تھے بلکہ ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کافی رات ہو چکی تھی۔ سردی کی شدّت سے دنیا اپنے اپنے ٹھکانوں میں سر چھپائے پڑی تھی۔ راستے میں شیخ یوسف نے

ایک ریستوران کے سامنے موٹر روک لی اور دعوت دی کہ کھانا کھایا جائے۔ مَیں سوء ہضم میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ساتھیوں نے بہت اصرار کیا کہ مَیں کچھ نہ کچھ ضرور کھاؤں مگر مَیں نے عرض کیا کہ کھانا کھانے کے بجائے دوا کھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، کیونکہ معدہ روزوں کی وجہ سے اور مسلسل آب و ہوا کی تبدیلی سے بے حد متاثر ہو چکا ہے۔ مَیں نے اپنی یہ کیفیت کھانے کے لیے اُن کے اصرار سے بچنے کی وجہ سے سادگی سے بیان کر دی مگر شیخ یوسف یہ سُنتے ہی اُٹھے اور ہمیں ریستوران میں چھوڑ موٹر لے کر ڈاکٹر کی تلاش میں نکل گئے۔ مَیں نے جب اُن کے فوری غیاب کی وجہ دریافت کی تو نائف آفندی نے بتایا کہ وہ آپ کی تکلیف کا حال سُن کر دوا کی تلاش میں نکل گئے ہیں۔ مجھے یہ سُن کر شدید ندامت ہوئی۔ رات خوب بھیگ چکی ہے۔ برفباری کا وقت ہے۔ شہر میں ہُو کا عالم ہے۔ شیخ یوسف کو یہ کیا سُوجھی کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ معمولی سی تکلیف کی خاطر تلاشِ طبیب میں نکل کھڑے ہوئے۔ دس پندرہ منٹ بمشکل گزرے ہوں گے کہ وہ دواؤں کا لفافہ ہاتھ میں لیے ریستوران میں داخل ہوئے۔ مَیں نے وفورِ تشکر سے دواؤں کا لفافہ وصول کر لیا مگر اس اعتذار اور ندامت کے ساتھ کہ مَیں آپ کے لیے ناوقت تکلیف کا سبب بن گیا۔ شیخ یوسف کہنے لگے کہ رمضان المبارک میں دوا رات کو ہی کھائی جا سکتی ہے، اس لیے اب اگر دوا نہ لیتے تو کل شام تک بات ٹل جاتی اور مرض میں اضافہ ہو جاتا ترکوں کی مہمان نوازی اور خاطر داری کی شہرت بہت سُنی تھی، مگر اب تو قدم قدم پر اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہو رہا ہے۔ تعارف اور ملاقات کی مدت چوبیس گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتی ہے مگر آپس میں ایسی یگانگت اور قرب

اور قلبی اتصال موجزن ہے کہ گویا ہم پہلے کسی دَور میں اکٹھے رہ چکے ہیں اور ایک عارضی وقفہ و فراق کے بعد دوبارہ ملنے کا موقع نصیب ہو گیا ہے۔ درحقیقت یہ وہ رُوحانی وحدت ہے جو صرف اسلام کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے اور جس پر زبان اور رنگ کا اختلاف اور نسل و وطن کی بیگانگی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس وحدت پر مستزاد وہ تحریکی اور نظریاتی ہم آہنگی ہے جو میرے اور ان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ میرا جماعت اسلامی سے تعلق ہے اور مولانا مودودی کا میں سیکرٹری اور ان کی کتابوں کا مترجم ہوں تو وہ محبّت سے بے قابو ہو جاتے ہیں اور میری یہ نسبت اُن کی غیر معمولی اُلفت و موانست کا مرکز بن جاتی ہے۔

یہ ریستوران جس میں ہم بیٹھے ہیں اِس کے مالک وہی بزرگ ہیں جنہوں نے آج مدرسہ امام وخطیب کے طلبہ و اساتذہ کی افطاری کا انتظام کیا تھا۔ بڑے صاحبِ ثروت ہیں۔ اس ریستوران کے علاوہ اور بھی متعدد تجارتی اداروں کے مالک ہیں۔ مگر مزاج و طبیعت کے لحاظ سے انکساری، سادگی، تواضع اور درویش منشی کا پیکر ہیں۔ ریستوران کے اندر انہوں نے یہ اعلان آویزاں کر رکھا ہے کہ مدرسہ امام وخطیب کے طلبہ و اساتذہ اور دوسرے مفتیوں اور اماموں کے لیے یہ خصوصی رعایت ہے کہ اُن سے کھانے کے ۲۵ فی صد دام کم لیے جائیں گے۔ یہ ریستوران استنبول کے اعلیٰ درجے کے ریستورانوں میں شمار ہوتا ہے۔ گولڈن ہارن کے کنارے واقع ہے۔ سیّاحوں اور عام شہریوں کا ہر وقت جمگٹا رہتا ہے۔ نظافت اور صفائی میں تُرکوں کے ذوقِ نفیس کا آئینہ ہے۔ کمرے کشادہ اور نشستیں نہایت آرام دہ اور خوبصورت ہیں۔ اور خدمت گار چاق و چوبند۔ ساتھیوں نے بتایا کہ

کھانوں کے لحاظ سے بھی اِس کا معیار بہت بلند اور شہرت یافتہ ہے اسلامی آداب کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے ہر کمرے میں یہ دُعا طغرے کی شکل میں آویزاں ہے کہ: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔" مزید معلوم ہُوا کہ ریستوران کے مالک ترکی کی موجودہ اسلامی تحریک سے وابستہ ہیں اور اُن کا یہ ریستوران ہمیشہ اہلِ دعوت کی فرودگاہ بنا رہتا ہے۔

ترکستانی مسلمانوں کی مظلومی

اگلے دن صبح کے دس بجے علیسٰی یُوسف الپتگین ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ رات انہوں نے ملاقات کا وعدہ لے لیا تھا۔ علیسٰی یوسف ہمارے پُرانے شناسا ہیں۔ ایک مرتبہ لاہور بھی تشریف لا چکے ہیں اور مولانا محترم سے ملاقات کر چکے ہیں۔ رابطۂ عالمِ اسلامی (مکہ مکرمہ) کے اجلاس کے دَوران بھی ایک بار اُن سے ملاقات ہو چکی ہے۔ مشرقی ترکستان پر جب ۱۹۴۹ء میں چین کی کمیونسٹ حکومت نے زبردست فوجی کارروائی کے ساتھ قبضہ کر لیا تو موصوف وہاں سے پاکستان پہنچ گئے اور مختصر عرصہ کے قیام کے بعد پاکستان سے تُرکی چلے گئے، پھر ترکی ہی کو اپنا دارالہجرت بنا لیا۔ موصوف برابر مسئلۂ ترکستان کے لیے سرگرمِ کار ہیں اور یہ اُن معدودے چند ترکستانیوں میں سے ہیں جو ترکستان کی آزادی کے لیے تڑپ رکھتے ہیں اور اس کے لیے عملاً جدّوجہد کرتے رہتے ہیں۔ علیسٰی یوسف صاحب نے آتے ہی پہلے مولانا محترم کی صحت کے بارے میں پُوچھا اور پھر فرمانے لگے کہ ہم نے سُنا ہے کہ مولانا مودودی تُرکی تشریف لا رہے ہیں۔ ہم اس موقع پر مشرقی ترکستان کے مہاجروں کا ایک عام اجتماع بُلائیں گے تاکہ وہ مولانا محترم سے

مل کر اُن کے سامنے تُرکستان کا مسئلہ رکھیں۔ اِس غرض کے لیے انہوں نے مجھ سے وہ تاریخیں دریافت کیں جن میں مولانا محترم ترکی آئیں گے۔ لیکن مَیں نے اُنہیں بتایا کہ مَیں مولانا محترم سے رابطہ قائم کر رہا ہوں۔ اُن کی طرف سے جو جواب ملے گا اُس کی روشنی میں آپ کوئی پروگرام تیار کریں۔

رُوس اور چین کا شکار عظیم تر تُرکستان

عیسٰی یوسف صاحب نے ابتدائی بات چیت کے بعد تُرکستان اور ترکستانی مسلمانوں کی حکایتِ خونچکاں چھیڑ دی۔ اِدھر بھی سازِ دل تشنۂ مضراب تھا۔ شیخ عیسٰی کی موجودگی سے پُورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس داستان کی تفصیلات سُنیں، اور تُرکستان کے اسلامی خطّہ کے سقوط اور مہاجرین ترکستان کی سرگزشت سے آگاہی حاصل کی۔ دو گھنٹے تک شیخ عیسٰی کے ساتھ اِس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ شیخ عیسٰی یوسف نے بتایا کہ ہم "عظیم تر تُرکستان" (Greater Turkistan) کے دعویدار ہیں۔ "یہ عظیم تر ترکستان" خالص اِسلامی خطّہ ہے۔ مگر اس پر اب دو استعماری طاقتوں، روس اور چین نے بجبر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ مسلمان ممالک میں سے کسی ملک نے اِس قضیہ کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔ رابطۂ عالمِ اِسلامی مکّہ اور مؤتمر عالمِ اسلامی کراچی نے بھی اس مسئلہ کو قرار دادوں تک محدود رکھا ہے۔ ہر مسئلہ کی پُشت پر کوئی نہ کوئی طاقت موجود ہے، یہاں تک کہ تبّت کے مسئلہ پر بُدھ مذہب کے پیرو باشندے اور حکومتیں موجود ہیں، مگر تُرکستان مسلمان حکومتوں کی سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے اور آج تک یہ مسئلہ اقوامِ متحدہ کی میز تک نہیں پہنچ سکا۔ حالانکہ تبت کا مسئلہ اب تک بین

بار ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۵ء میں اقوامِ متحدہ میں موضوعِ بحث آچکا ہے اور بدھ حکومتوں کی تائید اور تھائی لینڈ، فلپائن اور آئرلینڈ کی حمایت حاصل کر چکا ہے۔ ترکستان کے حق میں اگر کہیں سے آواز بلند بھی ہوئی ہے تو وہ ترکستان کے مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ مخصوص مفادات کے تقاضوں کے تحت بلند ہوئی ہے۔

"عظیم ترترکستان" کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ عیسیٰ نے بتایا کہ عظیم تر ترکستان سے مراد ترکستان کے دونوں حصے ہیں۔ مغربی ترکستان بھی جس پر روس قابض ہے اور مشرقی ترکستان بھی جسے چین نے ہڑپ کر رکھا ہے۔ مغربی ترکستان پر روسی کمیونسٹوں نے ۱۹۲۳ء میں قبضہ کیا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے شہروں مثلاً بخارا (امام بخاریؒ کی جائے پیدائش)، سمرقند (تیمور لنگ کے دارالحکومت اور امام منصور ماتریدیؒ کی جائے سکونت)، افشنہ (ابن سینا کی جائے پیدائش)، تاشقند (جس کا قدیم نام شاش ہے اور اصولِ فقہ کی مشہور کتاب اصول الشاشی کے مصنف کا مولد ہے)، مرغینان (فقہ کی نامور کتاب ہدایہ کے مصنف، امام علی بن ابوبکر عبدالجلیل کے وطن)، نمنگان اور اندجان کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ مغربی ترکستان کا رقبہ ۴۰ لاکھ کیلومیٹر مربع ہے اور آبادی ۳ کروڑ کے لگ بھگ۔ یہ سب مسلمان ہیں۔ روس کی کمیونسٹ حکومت سے پہلے یہاں چار بڑی امارتیں قائم تھیں: امارتِ بخارا۔ امارتِ خیوہ (خوارزم)، امارتِ سمرقند اور امارتِ خوقند۔ کمیونسٹوں نے ان امارتوں کو ختم کر کے پورے مغربی ترکستان کے حصے بخرے کر دیئے اور یہ دیکھ کر کہ اتنے وسیع رقبہ پر تسلط قائم رکھنا مشکل ہو گا۔ اسے پانچ نام نہاد جمہوریتوں

میں بانٹ دیا۔ یعنی ازبکستان، قازقستان، قرغیزستان، ترکمانستان اور تاجکستان۔ ان جمہوریتوں میں ایسا مستبدانہ نظام قائم کردیا گیا کہ ایک علاقہ کے افراد دوسرے علاقہ کے افراد سے کلیتہً منقطع ہو گئے۔ حتیٰ کہ ان کے رسم الخط تک الگ الگ کر دیئے گئے حالانکہ زبان سب کی ایک تھی۔ اِس طرح مسلمانوں کی بہت بڑی طاقت کو منتشر کر دیا گیا۔ شیخ عیسیٰ یوسف نے بتایا کہ مغربی ترکستان کی بربادی کے بعد ترکستانی مسلمانوں نے مشرقی ترکستان کو اپنا مرکز بنا لیا اور کاشغر کو اس کا دارالحکومت قرار دیا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں وہاں جمہوریہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر الحاج خواجہ نیاز منتخب ہوتے اور وزیرِاعظم الحاج ثابت داملا۔ مگر یکایک ملک کے اندر روسی فوجیں داخل ہو گئیں جو جدید اسلحہ سے لیس تھیں۔ روسی فوجوں نے جمہوریہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ۵ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو جیلوں میں ڈال دیا اور ۲ لاکھ تعذیب اور گشت و خون کی نذر ہو گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران نیشنلسٹ چین (چیانگ کائی شیک کی حکومت) کے مطالبے کی بنا پر ۱۹۴۱ء میں روسی فوجوں نے مشرقی ترکستان خالی کر دیا۔ نیشنلسٹ چین کی فوجوں نے بھی ترکستانی مسلمانوں پر ظلم توڑے۔ بالآخر ترکستانی مجاہد علی خاں تورہ کی قیادت میں ۱۹۴۳ء میں اس حکومت کے خلاف بغاوت برپا ہو گئی۔ مگر روس نے ثالث کی حیثیت سے دخل دیا اور اس کے نتیجے میں یہ طے ہوا کہ ترکستان کو اندرونی خود مختاری دی جائے گی۔ چنانچہ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں عام انتخابات ہوئے جن میں وطن پرست اور مخلص عناصر کو بھاری کامیابی ہوئی۔ ایک نئی حکومت وجود میں آگئی جس میں مسعود صبری گورنر جنرل مقرر کیے گئے، محمد امین بغرا وزیر تعمیرات اور شیخ عیسیٰ یوسف

الپتنگین چیف سیکرٹری۔ روس اس حکومت کی پُشت پناہی کر رہا تھا مگر ماؤ زے تنگ کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ماؤ زے تنگ کی سُرخ فوجیں اس مُلک میں داخل ہو گئیں۔ ترکستان کے چین نواز بعض فوجی جرنلوں نے اُن سے تعاون کیا اور عوام الناس کی مزاحمت کے باوجود چین کی سُرخ فوجوں نے مشرقی ترکستان پر قبضہ کر لیا۔ آخر کار لاتعداد مسلمانوں کو وہاں سے جلاوطن ہونا پڑا۔ کاشغر، یارقند، آقسو، ختن اور طرفان وغیرہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے قدیم مراکز آن کی آن میں زمین بوس ہو گئے۔ اور مشرقی ترکستان سے ترک مسلمانوں کی نسبت محو کرنے کے لیے اُس کا نام "مشرقی ترکستان" کے بجائے سِنگ کیانگ رکھ دیا گیا۔ مشرقی ترکستان کا رقبہ ۲۰ لاکھ کیلومیٹر مربع اور آبادی ایک کروڑ ہے۔ یہ تمام کی تمام آبادی مسلمان ہے اور اب کوشش کی جا رہی ہے کہ وہاں چینی اقوام کو لا لا کر آباد کیا جائے۔ مگر ترکستانی آبادی چینیوں سے شدید نفرت کرتی ہے اس لیے بہت کم تعداد میں چینی وہاں جانے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اور جو آباد ہو چکے ہیں اُن کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ چین نے اس علاقہ میں ایٹمی راکٹوں کی تیاری کے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ یہ ہے روسی اور چینی کمیونسٹوں کا وہ انصاف جو انھوں نے کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے۔ اور یہاں کچھ مسخرے یہ سمجھتے ہیں کہ سامراج صرف سفید رنگ ہی کا ہے، اور سُرخ سامراج کہیں موجود نہیں ہے۔

رُوس کی دُوسری مسلم آبادیاں

شیخ عیسیٰ یوسف نے درد بھرے انداز میں کہا کہ ہم ترکستان کے دونوں

حصوں کی آزادی چاہتے ہیں۔ یہ عظیم تر ترکستان مسلمانوں کی تاریخی اور تہذیبی دولت کی سرزمین ہے۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں ۸۶ھ میں یہ علاقے حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے تھے۔ پوری ۱۲ صدیوں تک اس سرزمین نے علم و ثقافت اور جہاد و جانفشانی کے میدان میں زبردست خدمات سرانجام دی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان حکومتیں اس کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہو رہی ہیں۔ شیخ علیسٰی یوسف نے تُرکستان کی آزادی کو پاکستان کے بقاء و استقلال کے لیے بہت اہم قرار دیا۔ شیخ علیسٰی نے "عظیم تر ترکستان" کا ایک نقشہ بھی تیار کر رکھا ہے۔ اُسے سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ میں صرف تُرکستان کی اسلامی حیثیت پر گفتگو کر رہا ہوں، ورنہ شمالی آذربیجان (رقبہ: ۹۰ ہزار کیلومیٹر مربع، آبادی ۳۵ لاکھ، مسلم آبادی ۸۰ فی صد)، والگا۔ اُورال کے علاقے (مجموعی رقبہ ۶۰ ہزار کیلومیٹر مربع، آبادی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ، مسلمان ایک کروڑ سے زائد)، شمالی قوقاز (رقبہ ایک لاکھ ۶۶ ہزار مربع میل، آبادی ایک کروڑ ۱۰ لاکھ ۲۰ ہزار، اور اکثریت مسلمان) اور جزیرہ نمائے قرم یا کریمیا (رقبہ ۲۷ ہزار کیلومیٹر مربع۔ مسلم آبادی ۲۲ لاکھ جو ۱۹۴۶ء میں پُوری کی پُوری جزیرہ سے نکال دی گئی) اور جمہوریۂ تاتار اور جمہوریۂ باشکر جن میں لاکھوں تاتاری مسلمان رہے ہیں، مُسلم علاقے ہیں اور یہ بھی اُسی ہمدردی، توجہ اور تعاون کے مستحق ہیں جس کے مستحق تُرکستانی مسلمان ہیں۔

شیخ علیسٰی یوسف نے اپنے حیرت انگیز حافظے کی مدد پر مجھے رُوس اور چین کے مسلمانوں کی کتابِ ماضی کے ورق ورق سُنا دیئے، پھر اُنہوں نے

نہایت مستند تحریری مواد بھی میرے سامنے رکھ دیا اور تاکید کی کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے مسئلہ کو اُٹھائیں۔ شیخ علیسیٰ یوسف مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ مولانا مودودی کا اپنا خاندان بھی تو اصلاً ماوراء النہر کا ہے اور ننہیال کی طرف سے وہ خود بھی ترکستانی ہیں اس لیے یہ اُن کا اسلامی مسئلہ بھی ہے اور وطنی اور ملّی بھی، مولانا محترم کا خاندانی لحاظ سے ترکستانی اور مادری سلسلے سے ترک یا ترکمان ہونا ترکستانی مہاجروں میں خوب مشہور ہے۔ ترکی کے لوگ بھی جب یہ سُنتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ بہرحال شیخ علیسیٰ یوسف الپتگین کے ساتھ ۲ گھنٹے تک بات چیت ہوتی رہی، اور اُن کی جگر پاش پاش کر دینے والی کہانی سُنتا رہا۔

ترکستانی مہاجروں کی تنظیم

شیخ علیسیٰ یوسف اور دوسرے ترکستانی مہاجروں نے استنبول میں باقاعدہ اپنی ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ اس تنظیم کا ایک اعلیٰ قسم کا مرکز ہے جو استنبول میں شارع باب علی قادسی پر ایک خوبصورت اور بلند و بالا عمارت میں واقع ہے۔ اس مرکز میں ترکستانی تنظیم نے اچھے سرگرم، انتھک اور قابل نوجوانوں کی ٹیم جمع کر رکھی ہے جو ہمہ وقت اپنے مشن میں منہمک رہتی ہے۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ان نوجوانوں کے اندر ایسے افراد بھی ہیں جو تُرکی کے علاوہ رُوسی، انگریزی اور عربی زبانوں میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ شیخ علیسیٰ نے ایک نوجوان عرفان اوغلو کا نام لیا اور مجھے تاکید کی کہ میں اُس سے ضرور ملوں۔ وہ عربی زبان میں بہت اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ شیخ علیسیٰ نے ترکستان کے مسئلہ پر مجھے جو تحریری

مواد دیا اُس میں اکثر چیزیں اِسی نوجوان کی تیار کردہ ہیں - علاوہ بریں اِس دفتر کے اندر وہ پُورا دستاویزی مواد موجود ہے جو ترکستان کی تاریخ اور وہاں کی مسلم آبادی کے حالات اور چینی کمیونسٹوں کے مظالم کی منہ بولتی تصویر پیش کرتا ہے - قدیم لٹریچر موجود ہے ، خود روس اور چین کے اخبارات اور کتابوں کے حوالے موجود ہیں ، نقشے اور خاکے ہیں - الغرض علمی اور سیاسی جنگ لڑنے کے لیے جس مواد کی ضرورت ہے وہ انہوں نے مہیا کر رکھا ہے - شیخ عیسیٰ یوسف کہنے لگے کہ مولانا مودودی ہمیشہ یہ تاکید کرتے رہے ہیں کہ ہم اپنی ایک باقاعدہ تنظیم قائم کریں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ترکستان کے مسئلہ کو عالمی رائے عام اور خصوصاً عالمِ اسلامی کے سامنے رکھیں - ہماری موجودہ تنظیم کی سرگرمیاں مولانا محترم کی اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہیں - ترکستان کے بعض دوسرے مہاجرین بھی اِنفرادی طور پر ترکستان کے مسئلہ پر آواز اُٹھاتے رہتے ہیں - ان میں نمایاں ترین آدمی شیخ محمد امین اِسلامی ہیں جو جدّہ میں مقیم ہیں اور قلمی حد تک اس مسئلہ کے حق میں بھرپُور جدّوجہد کر رہے ہیں - اِس معاملے میں مغربی تُرکستان کے مہاجرین نے کمزوری کا ثبوت دیا ہے - ترکی ، افغانستان ، پاکستان اور سعودی عرب میں ان کے بکثرت لوگ بستے ہیں ، مگر ایک تو رُوسی کمیونسٹوں کے وحشیانہ مظالم کا ہَول ان پر اِس قدر طاری رہا کہ اطمینان اور دِل جمعی کے ساتھ ان کو اپنے قضیے کو پیش کرنے کا کہیں موقع نہ مِل سکا اور دُوسرا غریب الوطنی اور معاشی مشکلات بھی ان کی راہ میں حائل رہیں - مگر اب بظاہر اُن کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے - انہیں اپنے مسئلہ

کو بیانگِ دُہل اُٹھانا چاہیئے۔ شیخ عیسیٰ سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ جزیرہ نمائے قرم (کریمیا) کے تاتاری مہاجروں میں سرگرمی پائی جاتی ہے۔ ترکی میں اُن کی اپنی تنظیم ہے جس کی طرف سے امل کے نام سے ایک اخبار نکلتا ہے اور اب خود روس میں بھی انہوں نے ایجی ٹیشن شروع کر دیا ہے۔ راقم الحروف نے شیخ عیسیٰ یوسف سے وعدہ کیا کہ گو ہم نے ترکستان کے مسئلہ کے بارے میں پہلے بھی کبھی کوتاہی نہیں کی ہے، مگر آئندہ انشاء اللہ اس میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کریں گے۔ بلکہ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ایک مرتبہ رابطۂ عالمِ اسلامی کے اجلاس میں ترکستان کے مسئلہ پر جب قرارداد آئی تو فارموسا کے نمائندے کی طرف سے اُس کی مخالفت کی گئی، کیونکہ روس اور چین کے علاوہ فارموسا کی نیشنلسٹ حکومت بھی ترکستان کی دعویدار ہے اور تاریخی طور پر وہ ترکستان کو چین ہی کا ایک حصّہ قرار دیتی ہے۔ مگر مولانا مودودی نے اس کوشش کا بر وقت تدارک کیا اور تاریخی حیثیت سے تحریری طور پر رابطہ کے اجلاس کے اندر یہ ثابت کیا کہ ترکستان صرف ترکستان کی ترک اور مسلمان اقوام کا خطّہ ہے اور بیرونی اقوام کو خواہ وہ چینی ہوں یا رُوسی اس پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ مولانا محترم کے دلائل کے بعد ترکستان کے مسئلہ پر بڑی مضبوط اور واضح قرارداد پاس کی گئی اور آئندہ کے لیے ایسی نامناسب اور بے بُنیاد کوشش کا سدِّ باب کر دیا گیا۔

ایک اِسلامی ورکشاپ

شیخ عیسیٰ یوسف سے فارغ ہوا تھا کہ عبدالقادر سیز گین، نائف آفندی اور

استاذ عزیر اور شیخ یوسف بھی تشریف لے آئے اور استنبول کے بعض مقامات کی سیر کے ارادے سے ہم ہوٹل سے نکل کھڑے ہوئے۔ قدیم استنبول (قسطنطنیہ) کی حد سے نکل کر جو قدیم فصیل کی شکل میں اب تک قائم ہے نئی آبادی میں آگئے۔ پروگرام تو یہ تھا کہ سب سے پہلے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار مبارک پر حاضری دی جائے، مگر چونکہ نماز ظہر کا وقت ہو رہا تھا اس لیے ہم راستے میں ایک ورکشاپ میں چلے گئے جس کے مالک جناب حسین آفندی بڑے نیک دل اور صاحبِ جذبہ مسلمان ہیں۔ اس ورکشاپ میں ہم نے نمازِ ظہر ادا کی۔ ورکشاپ کے مالک اور نوخیز کاریگروں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اس ورکشاپ میں نجاری کے آلات تیار ہوتے ہیں اور ۴۰ کے قریب کاریگر کام کر رہے ہیں جو سب کے سب نوخیز اور ۲۰ - ۲۵ سال کے لگ بھگ یا اس سے کم عمر کے ہیں۔ نماز ظہر کے وقت ورکشاپ بند کر دی گئی اور خود حسین آفندی اور تمام ملازمین ورکشاپ کی مسجد میں، جو ورکشاپ کے اُوپر کے حصے میں بنائی گئی ہے، جمع ہو گئے۔ عبدالقادر سیزگین نے جماعت کرائی۔ اس کے بعد نوخیز نمازیوں نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ تقریباً سات آٹھ لڑکوں نے تلاوت میں حصّہ لیا۔ اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ابھی ابھی جو لڑکے بجلی کی مشینوں پر کام کر رہے تھے اور لوہے کے ساتھ کشتی لڑ رہے تھے وہ جب قرآن کی تلاوت کرنے لگے تو لہجہ، مخارج اور ادائیگی الفاظ میں اچھے خاصے قاری نظر آئے۔ آواز کا سُریلا پن اس پر مستزاد۔ کجا ورکشاپوں کی دنیا اور کجا نماز اور قرآن سے یہ دلچسپی۔ قراءت کے بعد مجھ سے تقریر کا مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ میں

نے مختصر طور پر اُن کے سامنے اِسلام میں محنت کی اہمیت اور محنت کار کے مرتبہ و مقام پر اظہارِ خیال کیا۔

اس نرالی ورکشاپ سے مجھے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ حسین آفندی سے جب گفتگو ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ مَیں یہاں نئے بچّوں کو اِس شرط پر بھرتی کرتا ہوں کہ وہ نماز پڑھیں گے اور اُن اسلامی آداب کا جن کی اس ورکشاپ میں پابندی کرائی جاتی ہے، لحاظ کریں گے اور قرآن کریم کی سُورتیں اور دُعائیں یاد کریں گے۔ چنانچہ مَیں نماز اور قرآن خوانی کے لیے انہیں ورکشاپ کے اوقاتِ کار میں موقع دیتا ہوں۔ نماز اور روزہ کے مسائل بھی انہیں باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں۔ رمضان شریف میں اوقاتِ کار میں بھی دو گھنٹوں کی کمی کر دی جاتی ہے۔ حسین آفندی نے مسجد کے اندر وضو کے لیے گرم پانی کا وافر انتظام کر رکھا ہے۔ لڑکوں کو ایک ایک آہنی الماری دے رکھی ہے جس میں وہ اپنے کپڑے اور صابن رکھتے ہیں اور نماز پڑھنے کے وقت فوراً لباس تبدیل کر لیتے ہیں۔ مَیں نے چند لڑکوں سے پوچھا کہ وہ روزے کی حالت میں کیسے کام کر رہے ہیں؟ اُن سب کا جواب یہ تھا کہ روزہ کام میں ہرگز حائل نہیں ہوتا بلکہ روزے میں انسان زیادہ یکسوئی کے ساتھ کام کرتا ہے۔ ایک نوجوان نے یہاں تک کہہ دیا کہ بورقیبہ نے لوگوں کو دھوکا دیا ہے کہ روزہ سے کارخانوں کی پیداوار میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس ذہین و فطین نوجوان نے میری معلومات میں یہ اضافہ بھی کر دیا کہ بورقیبہ نے جو کچھ کہا ہے یہ اُس کے اپنے ذہن کی اختراع نہیں ہے بلکہ ایک یہودی اسکالر ڈریخ نے سب سے پہلے کہا تھا کہ "رمضان کا

مہینہ پیداوار میں حاصل ہوتا ہے۔" معلوم ہوا کہ اس کارخانے کے تمام کارکن روزے سے ہیں۔ اُن سب نے حسین آفندی سے بڑی محبت کا اظہار کیا اور اُن کی خوش اخلاقی کی بے حد تعریف کی۔ اُجرتوں کے بارے میں بھی حسین آفندی بڑی فراخدلی اور انصاف پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ دو سو ترکی پونڈ سے اُجرت کا آغاز ہوتا ہے جو معمولی کام جاننے والا لیتا ہے اور پھر حسبِ قابلیت اور تجربہ اُس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ حسین آفندی سے گفتگو میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان کا تعلق ترکی کی اسلامی تحریک سے ہے۔ بڑے مجاہد اور سرگرم آدمی ہیں۔ دین کی دعوت و اشاعت میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ ان کی ورکشاپ میں جتنے لڑکے کام کرتے ہیں ان کے والدین اور سرپرستوں پر ان کا بڑا اخلاقی اثر ہے۔ ورکشاپ سے رخصت ہونے لگے تو حسین آفندی نے کہا کہ پاکستان میں جو لوگ اسلام کی سربلندی کے لیے کام کر رہے ہیں اُن سب تک میرا ہدیہ محبت و عقیدت پہنچا دیا جائے۔ حسین آفندی نے ورکشاپ کو صحیح معنی میں اسلامی تحریک کا نرسری فارم بنا رکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک ہمہ پہلو کام کر رہی ہے اور نیک فطرت انسانوں کی ایک جماعت اللہ تعالیٰ نے اس کام پر لگا رکھی ہے۔

قبرستان سلطان ایوبؓ

ورکشاپ سے فارغ ہو کر ہم اس آبادی میں آ گئے جسے "ایوب سلطان" کہتے ہیں۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور چند دیگر صحابہ کی اسی آبادی میں آرام گاہیں ہیں۔ یہ آبادی حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے نام منسوب

ہے اور عوام اسے احتراماً "ایوب سلطان" کہتے ہیں۔ یہ نہایت پُر فضا اور دلکش مقام ہے۔ ایک پہاڑی کے اُوپر ہم نے چڑھ کر دیکھا کہ گولڈن ہارن خلیج پانچ میل تک اندر داخل ہونے کے بعد یہاں آکر ختم ہو رہی ہے۔ ساحل کے اس پار وسیع وعریض قبرستان ہے۔ اور اس کا نام بھی "ایوبیہ" ہے۔ دُور دُور تک قبریں نظر آئیں۔ عثمانی خاندان کے کئی بزرگ اس قبرستان میں مدفون ہیں۔ نائف آفندی نے کئی ترکی جرنیلوں اور سپہ سالاروں کے نام بھی لیے جن کی قبریں یہاں بنی ہوئی ہیں۔ گزشتہ زمانے میں بھی اور آج بھی ہر شخص کی یہ آرزو ہے کہ اس کی آخری آرام گاہ اِسی متبرک قبرستان کے کسی گوشے میں بنے۔ اور اُسے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی ہمسائگی اور قُرب کی سعادت حاصل ہو۔ قریب ہی ایک قبر کی طرف اُنگلی کا اشارہ کرتے ہوئے نائف آفندی نے کہا یہ فوزی چقماق پاشا کی قبر ہے۔ اُستاذ عُزیر نے فوراً چیں بجبیں ہو کر کہا کہ "ترکی کو لادینیت کے حوالے کرنے میں ان صاحب کا بھی حصّہ ہے کیونکہ فوزی چقماق پاشا کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ لوزان کانفرنس (۱۹۲۳ء) کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے پچھلے تمام وعدوں پر پانی پھیر کر نیا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد فوزی چقماق نے کیوں نہ اس سے عوام کو خبردار کیا؟ اور کیوں نہ لادینیت کے سیلاب کا بروقت انسداد کیا؟ مصطفیٰ کمال پاشا اور محترم عصمت انونو کے دَور تک ترک عوام اپنی تاریخ کے ۲۵ سالہ دَور کے بارے میں اندھیرے میں رہے ہیں مگر اب جو اس دَور کے چہرے سے یکایک نقاب اُٹھا ہے تو اس کا ہر ہر پہلو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اس دَور میں جس شخص نے جو رول ادا کیا

ہے ترکی قوم کا بچہ بچہ اُس سے آگاہ ہو چکا ہے اور مدح و ستائش کے جھوٹے اور مصنوعی لبادے اُتر جانے کے بعد تاریخ کے صفحات میں وہی مقام حاصل کر رہا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ آج ایک مختصر سے بے دین گروہ کے سوا ترک عوام میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو مصطفیٰ کمال کو ترکی قوم کا ہیرو سمجھتا ہو۔ بلکہ جس سے بات کیجیے وہ اس کو بدترین الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

پیر لوتی کا قہوہ خانہ

پہاڑی کی چوٹی پر ایک قدیم قہوہ خانہ ہے جسے "پیر لوتی کا قہوہ خانہ" کہتے ہیں۔ پیر لوتی مشہور فرانسیسی ناول نگار گزرا ہے۔ یہاں یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے اپنا شہرہ آفاق ناول ازیادا اسی قہوہ خانہ کے اندر ایک چٹان کے اوپر بیٹھ کر لکھا ہے۔ اس ناول میں اُس نے جتنی خیالی تصویریں کھینچی ہیں وہ اس منظر کے حُسن و جمال سے تاثر کا نتیجہ تھیں۔ قہوہ خانہ کے اندر کی ہر چیز حتیٰ کہ فرنیچر، برتن اور اشیاء کی ترتیب قدیم عثمانی دَور کی عکاسی کرتی ہے۔ عثمانی خلفاء بھی غمِ دنیا سے تھوڑی دیر نجات پانے کے لیے اس قہوہ خانے کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں۔ اگر عثمانی دَور کی مثالی تفریح گاہ کا اندازہ کرنا ہو تو اِس قہوہ خانہ سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر چیز سے معقولیت اور سنجیدگی مترشح ہوتی ہے۔ ساقی گردوں کے لباس کے بھی جو نمونے اس میں نظر آتے ہیں اُن سے بھی یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اُس دَور میں تفریح اور دل لگی کے لیے جو سامان اور ذرائع مستعمل تھے اُن میں جائز حدود کو پامال نہیں کیا گیا اور نہ سنجیدگی اور وقار کا دامن ہاتھ سے چھوڑا گیا ہے۔ البتہ قہوہ خانہ

کے موجودہ کارندے اِس سنجیدگی اور وقار کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ایک خاتون جس نے قدیم طرز کا خالص ترکی لباس پہن رکھا تھا ہمیں قہوہ پیش کرنے کے لیے آگے بڑھی مگر نائف آفندی نے اُسے تُرش لہجے میں کہا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ رمضان المبارک کا مہینہ ہے؟ اس پر اُس نے بڑی معذرت کی اور معافی بھی مانگی اور بتانے لگی کہ عام سیّاح اگرچہ یہاں آج کل بھی قہوہ پیتے ہیں۔ اِس لیے میں نے معمولاً یہ پیش کش کر دی۔ اِس رُومانی شہر میں یہ جگہ حد درجہ رومانی ہے۔ زائر اس منظر پر نگاہ ڈالتے ہی بیخود ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ قدیم استنبول کے گنبد اور مینار، ہلال نما شاخِ زرّیں، وہ چھوٹا سا چشمہ جس کا نام یورپ کا آبِ شیریں رکھا گیا ہے جہاں ترک شہزادیاں پکنک کے لیے جایا کرتی تھیں، اور تا بحدِ نگاہ لالہ و نسترن کی بچھی ہوئی سُرخ و زرد چادر۔

قبروں سے مسلمانوں کی عقیدت

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزارِ مبارک کو جب ہم جا رہے تھے۔ تو راستے میں بعض ایسی قبریں نظر آئیں جن پر شمعیں جل رہی تھیں اور دیواروں کے ساتھ دھاگے بندھے تھے۔ میں نے نائف آفندی سے پوچھا کہ یہ حرکتیں ترکی میں بھی ہوتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں کئی ولیوں کے مزار ہیں جن میں ہر وقت اہلِ طلب کا ہجوم رہتا ہے۔ عورتیں اور مرد اپنی حاجتیں لے کر آتے ہیں۔ شمعیں جلاتے ہیں۔ نذرانے چڑھاتے ہیں اور حصولِ مدعا کے لیے دیواروں پر دھاگے باندھتے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ قبر پرستی اور خوش عقیدگی کی یہ وبا مسلمان ملکوں میں کس قدر عام ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے جُہّال ہی اس میں مبتلا نہیں

ہیں، یورپی ترکی کے جہاں بھی اس حمام میں ننگے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۴ء میں جب میں قاہرہ گیا اور امام شافعیؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا تو یہ دیکھ کر طبیعت سخت کبیدہ ہوئی کہ ایک امام اور فقیہ کی قبر کو بھی یار لوگوں نے اپنی اوہام پرستی کی آماجگاہ بنا رکھا ہے۔ عورتوں کے گروہ قبر کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ طواف کے دوران عورتیں جھومتی ہیں اور چیخیں مارتی ہیں۔ مجاوروں کی بن آئی ہے۔ نذرانے اور ہدیوں کی بھرمار ہے۔ عورتوں کی چیخوں کی حقیقت ایک دوست نے یہ بتائی کہ یہ امام شافعیؒ کی روح سے ہمکلام ہونے کے لیے ہیں۔ کتاب الاُم اور الرسالہ کے مصنف اور اصولِ فقہ کی بنیاد رکھنے والے اور مذہب شافعیؒ کے امام کو کیا خبر تھی کہ انہیں پیروکاروں کی ایک ایسی جماعت بھی ملے گی جسے اُن کی فقہ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی بلکہ وہ اُن کی رُوح کو حاضر کر کے اُس سے عشق و محبت کی مشکلات حل کرنے میں مدد حاصل کرے گی۔ خرافات و بدعات کی یلغار سے اگر کسی کی قبر محفوظ رہی ہے تو وہ امام ابنِ تیمیہؒ ہیں۔ دمشق میں جہاں ابن العربی کا مزار اوہام پرستی اور مشرکانہ اعمال کا گڑھ بنا ہوا ہے، امام ابن تیمیہؒ اسپتال کی ایک غیر آباد دیوار کے زیر سایہ اِن تمام حرکتوں سے محفوظ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اور گمنامی کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی سے اُن کی قبر پوچھی جائے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرے گا۔

جامع ایوبؓ

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزارِ مبارک ایک وسیع اور کشادہ عمارت کے اندر ہے۔ کاشی کے کام نے عمارت کو حُسنِ باطن کیساتھ ساتھ



جامع سیدنا ایوب انصاریؓ - استنبول

حُسنِ ظاہر کا پیکر بھی بنا دیا ہے۔ مزار شریف کے ساتھ ہی مسجد ہے جسے جامع ایوبؓ کہتے ہیں۔ اور یہ اُن چند مساجد میں سے ایک ہے جو خلفائے آلِ عثمان کی اسلام سے وابستگی کی لازوال یادگاریں سمجھی جاتی ہیں۔ ترکی زبان میں مسجد کا لفظ بہت کم سُننے میں آتا ہے۔ جسے ہم مسجد کہتے ہیں تُرک اُسے جامع کہتے ہیں۔ پچھلے صفحات میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابو ایوبؓ اُس لشکر میں شریک تھے جسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۸ھ (۶۶۸ء) میں قسطنطنیہ پر حملہ کے لیے روانہ کیا تھا۔ محاصرہ کے دَوران حضرت ابو ایوبؓ کا انتقال ہو گیا۔ وفات سے پہلے انہوں نے یہ وصیت فرمادی تھی کہ میری میت کو قسطنطنیہ کی دیواروں سے جس قدر قریب لے جا کر دفن کیا جا سکے دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ آپؓ کی وصیت کے مطابق قسطنطنیہ کی فصیل سے متصل آپ کو دفن کر دیا گیا۔ اور جب اسلامی فوج نے محاصرہ اٹھایا تو اعلان کر دیا گیا کہ اگر اس قبر کو کوئی گزند پہنچا تو شام یا اسلامی دنیا میں کسی مسیحی عمارت کو محفوظ نہ چھوڑا جائے گا۔ سلطان محمد فاتح نے جب ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تو فتح کے تیسرے روز ایک بزرگ نے حضرت ابو ایوبؓ کے مرقد مبارک کا سراغ لگایا اور وہاں آپ کا مقبرہ اور مسجد تعمیر کی گئی۔ اس جلیل القدر صحابی کی قبر کے انکشاف سے فاتح عثمانی لشکر کے اندر مسرّت و افتخار کی لہر دوڑ گئی۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق ہر لشکری اس احساس میں ڈوب گیا کہ اس فتح کے اصل قائد وہ مقدّس صحابی ہیں، جو آٹھ سو سال سے فصیلِ قسطنطنیہ کے پاس اس اسلامی لشکر کا انتظار کر رہے ہیں جو اس فصیل کو عبور کرے گا۔

سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان اوّل (۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۶ء) کی جو تلوار آلِ عثمان کے پاس نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی تھی، محمد الفاتح نے وہ تلوار جامع ایوبؓ میں رکھوا دی۔ محمد الفاتح کے بعد جو سلطان بھی سر یر آرائے سلطنت ہوتا وہ جامع ایوبؓ میں حاضری دیتا اور اس تلوار کو حمائل کرتا۔ دنیا پرست سلاطین تاجپوشی کے وقت جو مُسرفانہ تقریبیں منعقد کرتے ہیں اور جس جاہ و جلال کی نمائش کرتے ہیں، عثمانی سلاطین ان کے برعکس اس روایت کے پابند رہے ہیں کہ تخت نشینی کے وقت سلطان باوضو ہو کر مسجدِ ایوبؓ میں حاضر ہوتا، دو رکعت نماز ادا کرتا اور مسجد کے امام صاحب کے ہاتھ سے سیفِ عثمانی لے کر گلے میں حمائل کرتا۔ اسی طرح جب کوئی لشکر جہاد کے لیے نکلتا تو سالارِ لشکر اُس موقع پر بھی امام کے ہاتھ سے اس تلوار کو لیتا اور یہ عہد کرتا کہ "تلوار اسلام کی محافظ رہے گی اور اسلام تلوار کا محافظ رہے گا"۔ اس کے بعد تکبیر و تہلیل کے نعروں کے ساتھ وہ اپنی سپاہ کو لے کر جہاد کے لیے روانہ ہو جاتا۔

جامع ایوبؓ میں نمازیوں اور زائرین کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں استنبول کی روح اس مسجد میں کھنچ آتی ہے۔ قُرّاء کی جماعتیں باری باری تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتی ہیں۔ ترکوں کو قرآن پڑھنے اور قرآن سُننے کا بڑا شوق ہے۔ نمازوں کے اوقات کے علاوہ بھی لوگ صرف قرآن سُننے کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ اور ہمہ تن گوش ہو کر کلامِ خداوندی کو سُنتے ہیں۔ عورتوں کا بھی بڑا رجوع ہے۔ مغربی لباس میں ملبوس عورتیں جب مسجد میں داخل ہوتی ہیں تو ٹانگوں کو لمبے گون یا سیاہ جرابوں سے ڈھانک لیتی ہیں

اور سروں پر رُومال باندھ لیتی ہیں۔ پُورا ماحول خشیت اور تقدس کی فضا سے معمور ہوتا ہے۔ مزار ایوبؓ کی طرح جامع ایوبؓ بھی تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ گنبدوں کے جھرمٹ اور پچی کاری کے کمالات دیکھتے آنکھیں نہیں تھکتیں۔ بے اختیار اُس ترک معمار کے حق میں کلماتِ تحسین زبان پر جاری ہو جاتے ہیں جس کے فن نے محمد الفاتح کی اس مخلصانہ کوشش کو چار چاند لگا دیئے۔ مسجد کے ایک ملحقہ کمرے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض تبرکات بھی رکھے ہوتے ہیں۔ اِس دُہرے تقدس کی وجہ سے پرہیزگار ترک اس مسجد میں بکثرت نماز کے لیے آتے ہیں۔ اور تینتیس دانوں کی ایک تسبیح پھیرتے رہتے ہیں۔

مزار ایوبؓ

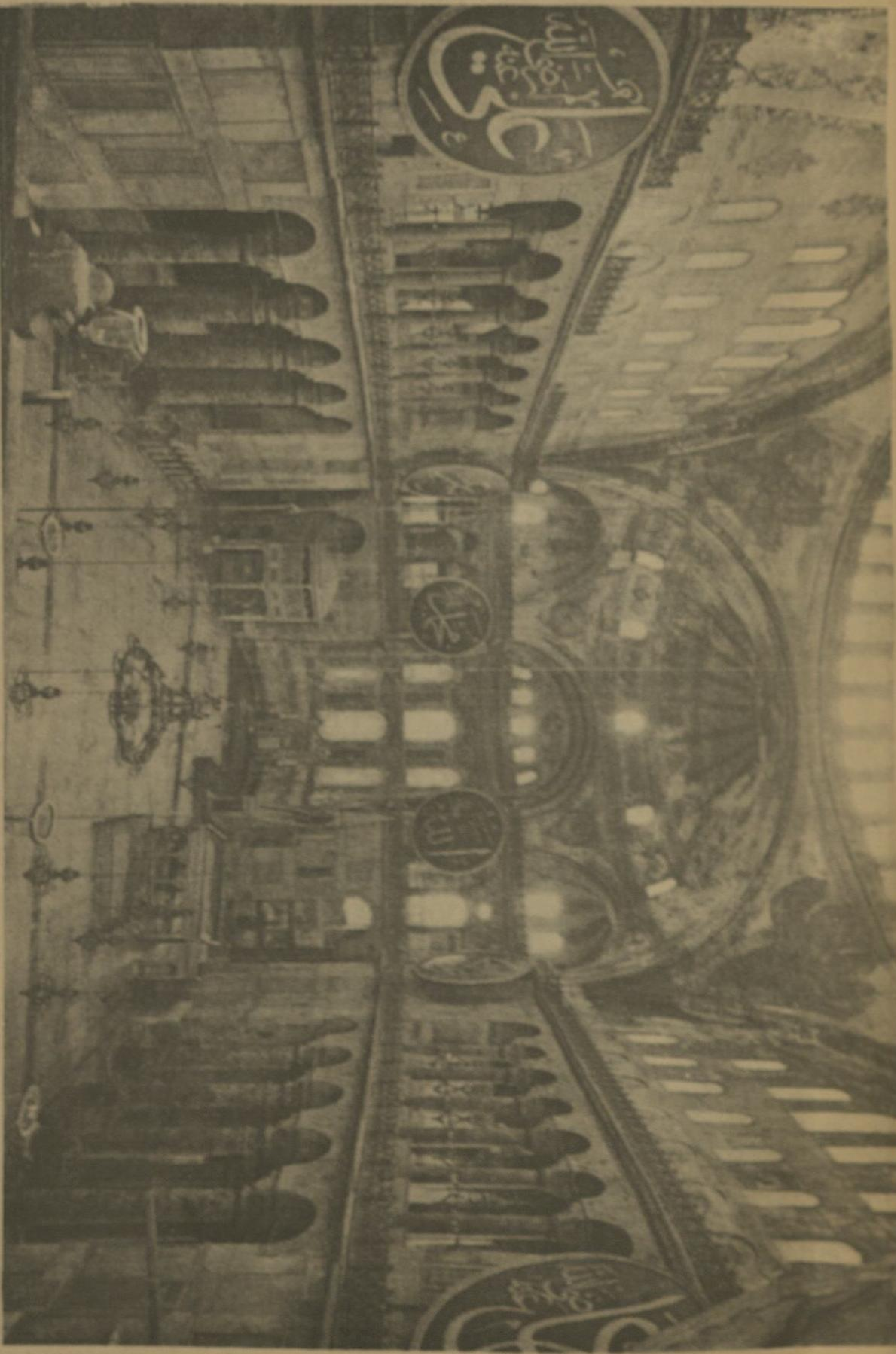
جامع ایوب میں دوگانہ ادا کر کے ہم مزار شریف کی جانب سلام کے لیے گئے۔ مزار کا وسیع و عریض صحن زائرین کے لیے ناکافی ہو رہا تھا۔ قبر مبارک ایک ہال نما کمرے کے اندر ہے۔ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور دوسرے سے نکلتے ہیں۔ سلام کہنے والے مردوں اور عورتوں کی دو لمبی قطاریں لگ رہی تھیں۔ ۲۰-۲۵ کی تعداد میں زائرین اندر داخل ہوتے اور سلام اور مختصر سی دُعا کے بعد پہرہ دار سپاہیوں کے معمولی اشارے سے واپس ہو جاتے۔ پاکستانی زائر ہونے کی وجہ سے مجھے قطار کی پابندی سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اندر داخل ہوا اور اس جلیل القدر صحابی کو، جو آج ترکی کی ملتِ مسلمہ کے دینی جوش و جذبہ کا محرک بنا ہوا ہے، سلام مسنون پیش کیا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قبر خوش عقیدہ لوگوں کے تصرفات سے محفوظ ہے۔ کوئی نذر نذرانہ نہیں، گُل پاشی و

شمع افروزی نہیں، طواف و سجود نہیں۔ پردۂ سکوت چھا رہا ہے۔ لوگ پورے احترام اور وقار کے ساتھ دم ساد ھے سلام کرتے ہیں اور چند لمحات کے بعد نکل جاتے ہیں۔ ترک قوم کے اندر مجموعی طور پر جو نفاست اور سلیقہ شعاری پائی جاتی ہے وہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ ساتھیوں نے بتایا کہ حضرت ابو ایوبؓ کا جسم مبارک سونے کے ایک جڑاؤ صندوق کے اندر ہے جو قبر کے اندر رکھا ہوا ہے۔ قبر کی ساخت ترکی طریقے کے مطابق سر کی جانب سے اُونچی اور پاؤں کی جانب سے کافی پست ہے۔ ترکانِ جنگ آزما کا یہ قدیم عقیدہ ہے کہ زندگی کی طرح موت بھی نشیب و فراز سے بھری ہونی چاہیئے۔ حضرت ابو ایوبؓ انصاری کا وہ مکان جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرتِ مدینہ کے وقت پہلی مرتبہ اُترے تھے اُسے بارہا مدینہ منورہ میں دیکھا ہے۔ یہ مکان آنحضورؐ کے روضۂ اقدس سے چند قدم کے فاصلے پر ہے اور آج بھی اسی بزرگ خانوادہ کے ایک فرد ابو الجُود انصاری کے پاس ہے۔ اب خود حضرت ابو ایوبؓ کی قبر کی زیارت بھی نصیب ہو گئی۔ و للہ الحمد۔

ایا صوفیا

استنبول کی بعض دوسری مسجدوں کی بھی طائرانہ زیارت کی۔ مگر خاکسار کے دل میں ایک نہایت قدیم آرزو چٹکیاں لے رہی تھی۔ وہ تھی جامع ایا صوفیا کی زیارت۔ یہ تاریخی جامع جسے اب ترکی کی سرکاری زبان میں ایا صوفیا میوزیم کہا جاتا ہے، اور ترکی کے مسلمان جامع ایا صوفیا کہتے ہیں، استنبول کے یورپی حصّہ کے اندر منطقہ فاتح میں واقع ہے۔ نمازِ عصر سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہم

جامع ایاصوفیہ، استنبول



جامع ایاصوفیا میں داخل ہو گئے۔ چونکہ یہ جامع اب سرکاری طور پر میوزیم میں تبدیل ہو چکی ہے اس لیے اس میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوتا ہے اور اُن آداب و حدود کی پابندی نہیں کرائی جاتی جو مسجد کے لیے مخصوص ہیں۔ ایاصوفیا کیا ہے؟ انسان کی قوتِ تخلیق کا ایسا نگار خانہ جس میں حُسن و جمال بھی نقطۂ کمال کو چھو رہا ہے اور تقدس و روحانیت کا سیلِ نور بھی موجزن ہے۔ چار میناروں کی مسجد آٹھ بھاری ستونوں پر قائم ہے۔ درمیان میں کانسی کی دیو ہیکل قندیلیں آویزاں ہیں۔ پورا صحن اور دیواریں قیمتی پتھروں سے مرصّع ہیں۔ یہ پتھر مصر سے منگوائے گئے تھے۔ اندر نماز کی جگہ پر ابھی تک قالین بچھے ہوئے ہیں۔ محراب میں امام کا مخصوص یونیفارم (سیاہ گون اور لال ٹوپی) رکھا ہوا ہے۔ صفوں میں ترکی مسجدوں کے رواج کے مطابق صد دانہ تسبیحیں بکھری پڑی ہیں۔ گویا خدا کے پرستاروں کی کوئی جماعت ابھی ابھی عبادت سے فارغ ہو کر اُٹھی ہے۔ در و دیوار پر قرآن کی آیات، اسمائے حُسنیٰ اور خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی کندہ ہیں۔ بیرونی صحن میں وضو کرنے کی ٹنکی نصب ہے جو گول دائرے کی شکل میں ہے اور چاروں طرف وضو کے لیے نشستیں بنی ہوئی ہیں۔ عثمانی خلفاء کو مذہبی عمارات اور بالخصوص مساجد کی تعمیر سے جو دلچسپی تھی اُس کا صحیح عکس حرمِ مکی اور حرمِ نبوی کے بعد ایاصوفیا میں دیکھا جا سکتا ہے۔

تاریخی پس منظر

ایاصوفیا کی تعمیر ۳۶۰ء میں قیصر قسطنطین کے عہد میں ہوئی تھی۔ اس کے افتتاح پر قسطنطین نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ایاصوفیا عظمت میں ہیکلِ سلیمانی پر فوقیت رکھتا

ہے۔ قسطنطین کے ان الفاظ کا مدعا یہ تھا کہ یہودیت کے مقابلے میں عیسائیت برحق ہے۔ قسطنطین نے ایا صوفیا کو بظاہر آرتھوڈکس کلیسا کا نام دیا مگر یہ درحقیقت صلیبی حکومت کے سربراہ کا مرکز تھا اور اسے نہ صرف مذہبی حیثیت تھی بلکہ سیاسی اہمیت بھی حاصل تھی۔ سلطان محمد الفاتح نے ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو قیصر نے ایا صوفیا کو مرکز بنا کر سلطان کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان نے ایا صوفیا کی اسی سیاسی اہمیت کے پیش نظر اسے کسی دوسرے تصرف میں لانے کے بجائے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ قسطنطنیہ میں محمد فاتح کا داخلہ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ہوا تھا۔ یہ جمعہ کا روز تھا۔ ظہر کے قریب سلطان اپنے وزراء اور اُمراء کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ ایا صوفیا کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اُترا اور اس عالیشان معبد کے اندر چلا گیا جس میں گیارہ سو برس سے تین خداؤں کی پرستش ہو رہی تھی۔ سلطان نے مؤذن کو حکم دیا کہ اللہ کے بندوں کو اس کی عبادت کے لیے آواز دے۔ اور حسبِ معمول خود خطبۂ جمعہ دینے کے بجائے اپنے شیخ الاسلام کو خطبہ دینے اور امامت کرنے کا حکم دیا۔ شیخ الاسلام نے حمد و ثنا کے بعد فتح قسطنطنیہ سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پڑھی کہ: لتفتحن القسطنطينية فلنعم الامير اميرها ولنعم الجيش جيشها۔ شیخ الاسلام نے فتح کی بے پایاں خوشی کے باوجود صحابہؓ کے احترام کے پیش نظر اس حدیث کی وضاحت میں کہا کہ فتح قسطنطنیہ کی ابتداء اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اس کا اصل سہرا اُن بزرگ ہستیوں کے سر ہے۔ عثمانی مجاہدین اس فتح کی محض تکمیل کرنے والے ہیں۔ سلطان محمد الفاتح

اور آپ کے ساتھیوں نے دنیا پرست فاتحین کے برعکس قسطنطنیہ پر اپنے اقتدار کا آغاز خدا کے حضور سر افگندگی سے کیا۔ سلطان نے اعلان کر دیا کہ ایا صوفیا میں آج سے تین خداؤں کے بجائے صرف ایک خدا کا نام بلند ہوا کرے گا۔ ایا صوفیا کے صدر دروازے کی پیشانی پر سلطان نے مذکورۂ بالا حدیث بھی ایک پتھر پر نقش کروا دی۔ یہ حدیث آج بھی ہر زائر کی نگاہِ اوّلین کا مرکز بنتی ہے۔

ایا صوفیا اور ترک مسلمان

مصطفیٰ کمال پاشا کے عہد میں ایا صوفیا کی اسلامی حیثیت کو ختم کر دیا گیا اور اُسے مسجد کے بجائے میوزیم قرار دے دیا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس ناروا اقدام پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا مگر تشدد اور دہشت انگیزی کی جو شمشیر اندھا دھند اسلام کی ہر روایت کو کاٹتی چلی جا رہی تھی اُس نے یہاں بھی ملّتِ اِسلامی کے جذبات کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اب جب کہ ترکی میں اسلام از نو کروٹ لے رہا ہے ایا صوفیا کو واگذار کرانے اور اسے بحیثیت جامع بحال کرنے کا مطالبہ بھی شدت پکڑتا جا رہا ہے۔ میرے ساتھی نالقت آفندی، پروفیسر عُزیر اور عبدالقادر سیزگین مجھے ایا صوفیا کے بارے میں برابر مستند معلومات فراہم کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ پاپائے روم نے کیتھولک چرچ اور آرتھوڈکس چرچ میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ترکی کا دورہ کیا اور اس دورہ میں اُس نے نہ صرف ایا صوفیا کی زیارت کی بلکہ کیتھولک عقیدے کے مطابق باقاعدہ مذہبی مراسم بھی ادا کیے۔ ترکی کے اخبارات میں جب یہ خبر چھپی تو مسلمانوں پر گویا بجلی گر پڑی۔ مسلمانوں کے بارے میں ترکی

حکومت کا رویّہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص جذبۂ دینی سے مجبور ہو کر ایا صوفیا میں نماز پڑھ لیتا تھا تو پولیس اُسے زدوکوب کرتی اور اُس کے خلاف مقدمہ دائر کرتی تھی۔ مگر اب مسیحی سربراہ کو آزادانہ طور پر یہاں مذہبی مراسم ادا کرتے دیکھ کر اُن کے اندر بھی شدید ردِّ عمل ہوا۔ چنانچہ استنبول یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کی طرف سے یونین کے ممبروں کے نام یہ ہدایت جاری کی گئی کہ وہ ایا صوفیا میں نماز پڑھنے کے لیے فوراً جمع ہوں۔ طلبہ کے اِس فیصلے کو سُن کر نہ صرف سینکڑوں طلبہ بلکہ استنبول کے ہزاروں نوجوان ایا صوفیا پہنچ گئے اور نماز باجماعت ادا کی۔ شہر میں خاصی ہلچل مچ گئی۔ حکومت نے طلبہ کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ نائف آفندی نے بتایا کہ وہ بھی ان گرفتار شدگان میں شامل تھے۔ نائف آفندی نے بتایا کہ طلبہ کے لیڈروں نے حکومت کے گوش گزار کر دیا تھا کہ اگر ایا صوفیا کے اندر صلیب پرست اپنے مذہبی مراسم ادا کریں گے تو مسلمان بھی لازماً وہاں نماز ادا کریں گے۔ نائف صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پچھلے چار سالوں سے ایا صوفیا کا مسئلہ انتہائی نزاکت اختیار کر چکا ہے، اور اب سرکاری کمیٹیاں اس بات کا جائزہ لے رہی ہیں کہ کیا ایا صوفیا کو مسجد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ عبدالقادر سیزگین نے ایک وزیر رفعت سیزگین کے بارے میں بتایا کہ اُس نے ایک بیان میں کہا ہے کہ "میں ترکی کے ایک شہری کی حیثیت سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ بہتر یہ ہے کہ ایا صوفیا کو فی الفور مسجد کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔" دوستوں نے بتایا کہ ایا صوفیا کے بارے میں ترک مسلمانوں کے دل انتہائی زخم خوردہ ہیں۔ جس محفل میں ایا صوفیا کا ذکر آ جاتا ہے لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور سینوں میں آتشِ غم کے شعلے فروزاں ہو جاتے

ہیں۔ عبدالقادر سیزگین نے مجھے ایا صوفیا سے متعلق تُرکی نظم کے چند اشعار بھی سُنائے جو آج کل زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ یہ نظم تُرکی کے موجودہ نامور شاعر عثمان یوکسل کی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب فتح استنبول کی پانچ صد سالہ سالگرہ منائی گئی تھی تو یہ نظم اُس وقت تُرکی کے اخبارات میں چھپی تھی اور اس سے ایک دھوم مچ گئی تھی۔ جس روز یہ نظم اخبارات میں چھپی اُسی روز عثمان یوکسل گرفتار کر لیے گئے۔[1] نائف آفندی نے مجھے یہ پوری نظم قلم بند کرا دی۔ پاکستان کے دوستوں کے لیے میں اس نظم کا اُردو ترجمہ پیش کرتا ہوں:

اَے ایا صوفیا! اَے پرتوِ اسلام، اے مایۂ افتخارِ مسلم، اے معبدِ زیبا!

ایا صوفیا! تو تنہا کیوں ہے؟ تجھ پر یہ کیسا سکوت طاری ہے؟

تیرے میناروں کی بلندیوں سے اب کیوں تکبیر کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کیوں اب تیری طرف سے صدائے فلاح بلند نہیں ہوتی۔

وہ تیرا عہدِ پُرشکوہ تیری جلوہ آرائی اور نور افگنی کدھر گئی؟

ایا صوفیا! تُو میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتی؟ اَے ایا صوفیا، اَے یگانہ و تنہا ایا صوفیا! اب تیرے منبرِ دلرُبا سے صدائے حق کیوں نہیں اُٹھتی، تیرے محراب کے دامن میں اب جبینیں کیوں خُدا کے حضور سجدہ ریز نہیں ہوتیں۔

---

[1] عثمان یوکسل پر باقاعدہ عدالت میں مقدمہ دائر ہوا۔ اور طویل بحثوں کے بعد عدالت نے موصوف کو بری کر دیا۔

ایا صوفیا! کل تیری خاک نے ایمان سے لبریز مجاہدوں کے اشک خود
اپنی آنکھ سے بہتے دیکھے تھے۔ اور آج تیرے فرشِ پاک کو
کیسے لوگ پامال کر رہے ہیں۔

آہ اے ایا صوفیا! تیرے حق میں اس ظلم کا ارتکاب کس نے کیا ہے؟ اور کس نے
بظاہر تجھ سے تیرا نور چھیننے کی جسارت کی ہے؟
تیری قرآن کی نوائے دلنشین جو دلوں کو لرزا دیتی تھی اب کہاں ہے؟

ایا صوفیا! تیرا چراغ کس نے گل کرنے کی حماقت کی؟ وہ کون نادان تھا جس
نے قرآن کو معبدِ فاتح سے باہر نکال دیا اور تجھے کارگر ہتھیار سے
محروم کر دیا؟

ایا صوفیا! برملا کہہ دے کہ ایک تباہ کار ہاتھ نے تیرے دل پر زخم کاری
لگایا ہے۔ برملا کہہ دے کہ ایک پاگل شخص نے ایا صوفیا کو دوبارہ
بتکدہ بنا دیا ہے۔

لیکن اے ایا صوفیا! اے معبدِ زیبا! ہم تجھے تنہا نہیں چھوڑیں گے، ہم بزرگ فاتح
کے سپوت ہیں۔ ہم عنقریب بتوں کو پاش پاش کر دیں گے اور
تجھے دوبارہ مسجدِ پُر شکوہ میں تبدیل کر دیں گے۔
اُس وقت ہم اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر چشم ہائے
خونبار کے اشکوں سے وضو کریں گے اور تجھے سجدوں سے
بھر دیں گے اور تیرے چپے چپے پر یکتا خالق کی بندگی بجا لائیں
گے۔

وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ تیرے خاموش گوشوں سے اللہ اکبر
کی صدائے دلآویز بلند ہو گی اور اہلِ جہان کے کانوں سے
ٹکرائے گی۔

تب تمام دنیا یہ سمجھ جائے گی کہ محمد الفاتح از سرِ نو زندہ ہو
گیا ہے۔

ترکوں کے دِل کی دھڑکن

ایاصوفیا میں داخل ہو کر انسان عجیب کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ ایاصوفیا کی زیارت کسی تاریخی اثر یا میوزیم یا فنِ تعمیر کا قابلِ دید نمونہ ہونے کی بنا پر نہیں کروں گا بلکہ مسجدِ اسلام کی حیثیت سے کروں گا۔ چنانچہ ایاصوفیا میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ محراب کے پاس دوگانہ ادا کیا اور قبل اس کے کہ پولیس کے محافظ دستے کو اطلاع ہوتی دوگانہ سے فارغ ہو گیا۔ ایاصوفیا کا اندرونی ہال سیاحوں اور زائرین سے بھرا ہوا تھا۔ میرے نماز ادا کرنے پر یہ لوگ برابر مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے رہے اور جب تک مَیں مسجد کے اندر رہا چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ نالقت آفندی نے بتایا کہ ترکی کے بکثرت نوجوان مُہم کے طور پر یہاں آ کر نماز پڑھتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نوجوان نماز پڑھ رہا ہوتا ہے اور اُس کی پشت پر پولیس کا سپاہی بید زنی کر رہا ہوتا ہے۔ مجھے استنبول، انقرہ اور قونیہ میں کئی ایسے نوجوان مِلے جنہوں نے مجھے فخر سے بتایا کہ وہ ایاصوفیا میں بحالتِ نماز پولیس کے بید کھانے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں اور متعدد اس جرم میں ۳ ماہ اور ۶ ماہ کی قید بھی

بُھگت چکے ہیں۔ مگر اب یہ معاملہ منتظمین کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ افراد کے بجائے اب نوجوانوں کے گروہ ایا صوفیا میں نماز کے لیے جاتے ہیں اور اس بارے میں پولیس کے تشدد اور قانون شکنی کی پرواہ نہیں کرتے۔ حال ہی کی بات ہے کہ استنبول یونیورسٹی کے ۷۰ طلبا ایا صوفیا میں گھس گئے اور نماز باجماعت ادا کی[1] میرا اندازہ ہے کہ ایا صوفیا ترکی میں اسلامی انقلاب کا نقطۂ انفجار ثابت ہو گی کیونکہ یہ مسجد ترک نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بن چکی ہے۔

ایا صوفیا کا ماضی، اور اس کا حال اور ترکی مسلمانوں کا اس سے لگاؤ اور اُس کی رُوح پرور فضا اور تعمیری ہیبت کا جائزہ لینے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ گھنٹہ یا دو گھنٹے اس کے لیے ناکافی ہیں۔ ایا صوفیا سے باہر نکلا تو آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور دل جذبات سے بہہ رہا تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ ایا صوفیا کو سلامِ رخصت پیش کیا کہ جب دوبارہ استنبول میں حاضری ہو گی تو انشاء اللہ تیرے میناروں سے نعرۂ توحید بلند ہو رہا ہو گا، خوش نوا قُرّاء تیرے گوشوں میں بیٹھے نغمۂ سرمدی الاپ رہے ہوں گے اور تُرکانِ باصفا کی جماعتیں تیرے دامن میں بحضورِ خدا جبہہ سائی کر رہی ہوں گی۔

مسجد نیلگوں

نماز عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ایا صوفیا کے سامنے کی سڑک کے اُس پار مسجد سلطان احمد ہے۔ جسے مسجد نیلگوں بھی کہا جاتا ہے۔ نماز کے لیے ہم اس مسجد

---

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ اتحاد، استنبول ۲۹ اپریل ۱۹۶۹ء

میں چلے گئے۔ یہاں بھی نمازیوں کا جمِ غفیر تھا۔ اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ قرّاء نوبت بہ نوبت قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ حاضرین کپڑے کی ٹوپیاں اوڑھے سر بجیب قرآن سُننے میں محو تھے۔ ہیٹ ترکی کے قومی لباس کا ایک جُزو ہے۔ مگر مسلمان جب مسجد میں آئے گا تو ہیٹ دروازے پر موجود محافظ کے حوالے کر دے گا اور اپنے نمبر کا ٹوکن لے لے گا۔ استنبول کی جو چیزیں زیارت کے قابل ہیں۔ اُن میں یہ مسجد نیلگوں بھی ہے۔ یہ دنیا میں وہ واحد مسجد ہے جس کے چھ مینار ہیں جو اس قدر کم چوڑے ہیں کہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا کی کسی مسجد میں اتنی طوالت کے ساتھ اس قدر کم چوڑائی کے مینار نہیں ہیں۔ اسے سلطان احمد اوّل نے ۱۶۰۹ء تا ۱۶۱۶ء میں سات سالوں کے اندر تعمیر کروایا تھا۔ تعمیر کے دَوران عجلت میں یہ حقیقت فراموش ہو گئی کہ چھ میناروں کا امتیاز روزِ اوّل سے مکّہ مکرمہ کی مسجد الحرام کے لیے مخصوص ہے۔ مگر اب مسجد تیار ہو چکی تھی اور اس میں تبدیلی کا وقت نہیں رہا تھا اس لیے سلطان احمد نے اپنی مسجد کے مینار منہدم کرانے کے بجائے مسجد الحرام میں ایک مینار کا اضافہ کروا دیا اور اس کے سات مینار ہو گئے۔ اگر کسی مسجد کے مینار مسجد الحرام کے میناروں سے زیادہ ہوں تو شرعاً اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر عثمانی خلفاء جو حرمین شریفین کے سچے خادم تھے اور جن کے دل اسلام کی محبت سے منوّر تھے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ سلطان احمد کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی مسجد کسی لحاظ سے مسجد الحرام پر فوقیت حاصل کرے۔ مسجد کا پُورا فرش مرمر کی بڑی بڑی سلوں کا بنا ہوا ہے۔ گرانیٹ کے ۲۶ ستونوں نے گنبدوں کے سلسلۂ طویل کو اُٹھا

رکھا ہے۔ بڑا گنبد درمیان میں ہے۔ زائر جب مسجد کی دہلیز عبور کر کے اندر قدم رکھتا ہے تو وہ ایک حیرت انگیز منظر میں ڈوب جاتا ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے گنبدوں کی رَو اُس کے ساتھ ساتھ محوِ خرام ہے جو آخر کار درمیان کے بڑے گنبد میں جا کر گِر جاتی ہے۔ عمارت کی خوبصورتی کو ہم عربی زبان میں یُوں ادا کریں گے کہ آیۃ فی فن العمارۃ و فن الزخرفۃ۔ یہ عمارت جس معمار کا کرشمہ ہے اُس کا نام محمد آغا تھا۔ چونکہ مسجد کی دیواریں نیلے اور سبز نقوش سے مزیّن ہیں اس لیے اُسے مسجد نیلگوں کہا جاتا ہے۔ مسجد کے اندر حجرِ اسود کا ایک ٹکڑا بھی موجود ہے۔

تُرکوں کی اصل طلب

نماز عصر کے بعد نمازیوں کا جمِ غفیر میری طرف لپکا۔ کوئی میرے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور کوئی میرے لباس کو مَس کرتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں تُرک نمازیوں کی نگاہ میں کوئی پیرِ مغاں تھا۔ بلکہ صرف اس وجہ سے کہ میں مسلمان اور پاکستانی ہوں۔ عبدالقادر سیزگین نے لوگوں کو یہ بھی بتا دیا کہ میں "پاکستان کے بڑے عالمِ دین، اور اسلامی مفکر اور خدا رسیدہ بزرگ کا شاگرد ہوں" تو پھر کیا تھا حاضرین کی عقیدت دوچند ہو گئی اور لگے ہاتھوں مجھے تقریر کی دعوت پیش کر دی گئی۔ حاضرین میں یونیورسٹی کے طلبہ اور بعض پروفیسر بھی تھے اور اکثریت تاجروں کی تھی۔ میں نے اُن لوگوں کے اصرار پر قرآن کریم کا ایک رکوع تلاوت کیا اور اُس کے بعض حصّوں کی تشریح کر دی۔ اور یوں "جوابِ عقیدت" کے بارے سبکدوش ہُوا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ دل تُرکی کی سیاحت کو جائے تو اُسے

پہلے سے تیار رہنا چاہیئے کہ اُسے کسی بھی وقت تقریر کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ کم از کم ترک اس سے قرآن کریم کا کچھ حصّہ یا کوئی عربی یا فارسی نعت یا مسنون دعائیں اور مناجاتیں سُنے بغیر معاف نہیں کریں گے۔ اور اگر انہیں یہ محسوس ہوگیا کہ زائر کو مذہب سے دلچسپی نہیں ہے تو اُن کی دلچسپی بھی زائر سے کم ہو جائے گی۔ ترکی میں سیّاحوں کی کمی نہیں ہے۔ دنیا بھر کے سیّاحوں سے تُرکوں کو پالا پڑتا ہے[ل۱]۔ وہ سیّاحوں کو ذریعۂ آمدنی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ بے شک وہ سیّاح کی بھرپُور خدمت کرتے ہیں مگر مادّی احساسات کے تحت۔ لیکن ترکوں کے دل میں وہی اُتر سکتا ہے جو اُن کے پاس اِسلام کی سوغات لے کر جاتے۔

روزنامہ بُگُون

استنبول کے جن لوگوں سے مجھے ملنے کا بے حد شوق تھا اُن میں سے بُگُون اخبار کے ایڈیٹر اور مالک محمد شوکت ایجی بھی تھے۔ روزنامہ بُگُون (جس کا اُردو ترجمہ امروز ہے) پچھلے سال معرضِ وجود میں آیا ہے۔ مگر اس کی تُند و تیز تحریروں اور حیرت انگیز انکشافات اور بے لاگ تنقیدوں نے پُورے ترکی میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ سعودی عرب اور لبنان کے اخبارات میں بُگُون کی تحریروں کے عربی تراجم نظروں سے گزرتے رہے ہیں۔ ان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تُرکی کے اِسلامی محاذ میں ایک نڈر مجاہد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ رابطۂ عالمِ اسلامی کے مرکزی دفتر (مکہ مکرمہ) کے ایک

ل۱ ترکی میں تقریباً ۱½ لاکھ سیّاح سالانہ آتے ہیں۔ ان میں سے ۳ لاکھ کے قریب وہ سیّاح ہیں جو صرف یورپ سے آتے ہیں۔

دوست نے بڑی تاکید کی تھی اور تعارفی خط بھی دے دیا تھا کہ میں محمد شوکت صاحب سے استنبول میں ضرور ملوں۔ چنانچہ میں نے ناقف آفندی سے اپنے ارادے کا اظہار کیا اور طے پایا کہ مغرب کے بعد بُگُن اخبار کے دفتر میں جائیں گے۔ افطاری آج بھی مدرسہ امام و خطیب میں تھی۔ افطاری سے پہلے کا وقفہ گزارنے کے لیے دوست مجھے ترک طلبہ کی فیڈریشن کے دفتر میں لے گئے۔ میرے لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ کس شارع اور کس سمت یہ دفتر واقع ہے۔ یوسف صاحب کی موٹر اِدھر سے اُدھر لیے لیے پھرتی رہی اور میں موٹر کے اندر بیٹھا کبھی استنبول کے خوبصورت مگر خلیق، مغربی لباس میں ملبوس مگر جذبۂ ایمانی سے بھرپور لوگوں کے چہروں پر تھرکتی نظریں ڈالتا، کبھی استنبول کی قدیم و جدید عمارتوں کے منظر سے اپنی بے تاب نگاہوں کی خدمت کرتا، کبھی ساتھیوں سے پوچھتا کہ سلاطین کا قدیم قصر توپ کاپی کہاں ہے، اسلامی میوزیم کہاں ہے۔ دولمہ باغچہ کا قصر کہاں ہے، بابِ عالی کہاں ہے، اور وہ چار جزیرے کدھر واقع ہیں جو شہزادوں کے جزیرے کہلاتے ہیں جن کا قدرتی حُسن بلا کا فتنہ خیز بتایا جاتا ہے۔ اور کبھی ان سطحی باتوں سے ہٹ کر اسلامی آثار اور اسلامی کُتب خانوں کا تذکرہ چھیڑ دیتا۔ کیفیت یہ تھی کہ ؎

زِ فرق تا بقدم ہر کُجا کہ می نگرم

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

ترک طلبہ کی تنظیمیں

باتوں باتوں میں ہم ترک طلبہ کے وفاق ملّی کے مرکز میں پہنچ گئے۔ یہ ایک

بڑی وسیع عمارت ہے جس کی دوسری منزل پر بہت کشادہ ہال ہے اور اطراف میں چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ جن میں دفاتر ہیں۔ نچلے حصے میں سیاحوں کی معلومات اور رہنمائی کا دفتر ہے جس میں طلبہ ہی رضا کارانہ خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ غیر ملکی زائرین کے لیے طلبہ کی یہ خدمت بڑی قابلِ قدر بلکہ قابلِ رشک ہے۔ دل میں بار بار یہ خواہش اُٹھتی رہی کہ کاش اپنے ہاں بھی طلبہ کی تنظیمیں اس پہلو پر توجہ دیں۔ مرکز کی اس وقت مرمت اور صفائی ہو رہی تھی اس لیے بعض دفاتر بند تھے۔ وفاق ملی کے نائب صدر جناب حسین جوجکن سے ملاقات ہو گئی۔ وفاق کے جنرل سیکرٹری بھی آ گئے۔ وقت اگرچہ کم تھا مگر دونوں بڑے تپاک سے ملے اور مولانا محترم کی صحت و عافیت دریافت کرنے لگے۔ وفاق کے نائب صدر اور جنرل سیکرٹری دونوں اسلام پسند ہیں۔ اگرچہ وفاق میں مختلف الخیال عناصر پائے جاتے ہیں مگر اسلام پسندوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ وفاق کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ نکلتا ہے جس میں اسلامی مفکرین کے مضامین بھی چھپتے ہیں۔ حسین جوجکن مسکرا کر کہنے لگے کہ حضرت مودودی ترکی آ رہے ہیں، ہم اُن کی آمد سے پہلے ہال کی صفائی کروا رہے ہیں۔ ان کی سب سے پہلی تقریر اسی حال میں ہو گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ حضرت کے شایانِ شان ہال کی سج دھج ہو اور ہماری قدیم آرزو طمطراق سے بروئے کار آئے۔ میں یہ سُن کر دل میں سوچنے لگا کہ استنبول تو اپنی جگہ مولانا محترم کے استقبال کے لیے زور و شور سے تیاریاں کر رہا ہے مگر سوال یہ ہے کہ مولانا محترم اس حالت میں کیسے یہ بار اُٹھا سکیں گے۔ حسین جوجکن جس خوشی میں مگن تھے مَیں نے یہ بتا کر اُسے مکدّر کرنے کی کوشش

نہیں کی کہ مولانا محترم کا ترکی ٹھہرنا یقینی نہیں ہے۔ حسین جوجکن نے بتایا کہ استنبول کے ہوائی اڈے پر مولانا محترم سے ان کی ملاقات ہو چکی ہے۔ مگر ۱۰ منٹ کی اس ملاقات نے آتشِ شوق کو تیز تر کر دیا ہے۔ میں نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے حسین سے پوچھا کہ طلبہ میں اسلامی رجحانات کے فروغ کا کیا حال ہے؟ بتانے لگے کہ اسلامی رجحان برق رفتاری سے بڑھ رہا ہے اور طلبہ صاف طور پر دو گروہوں میں بٹتے جا رہے ہیں۔ ایک اسلام پسند اور دوسرا قوم پرست۔ مؤخرالذکر گروہ میں آزاد خیال، سوشلسٹ اور مغرب پرست تمام عناصر شامل ہیں۔ اسلام پسندوں کا محاذ بڑے سنجیدہ، دلیر اور مخلص کارکنوں پر مشتمل ہے۔ دونوں کا مقابلہ زبردست ہے۔ اور دونوں مختلف انداز سے پنجہ آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ حسین جوجکن بڑے اعتماد اور جگرداری کے ساتھ کہنے لگے کہ "مستقبل ہمارے ہاتھ میں ہے۔

ترک طلبہ کی ایک اور تنظیم کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس تنظیم کا نام ہے اسلامک انسٹی ٹیوٹ فیڈریشن آف ترک طلبہ۔ یہ بڑی جاندار تنظیم ہے۔ اس کی طرف سے "اسلام مدنیت" (تمدن اسلام) کے نام سے ایک ماہانہ میگزین بھی استنبول سے نکلتا ہے جس میں ترک اہلِ قلم کے علاوہ مولانا مودودی، مولانا ابوالحسن ندوی، شیخ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر حمید اللہ اور اخوانی رہنماؤں کے مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں۔ جہاں جہاں اِسلامک انسٹی ٹیوٹ قائم ہیں اس تنظیم کی شاخیں موجود ہیں۔ یہ تنظیم اسلام کے احیاء کے لیے بڑی مؤثر کوشش سرانجام دے رہی ہے۔ "اسلام مدنیت" میگزین جس معیار کا پرچہ ہے اُس کا اندازہ اس سے

ہو سکتا ہے کہ اس کا ستمبر ۷۰ء کا شمارہ فتح استنبول نمبر تھا اور محمد الفاتح کے ہاتھوں استنبول کی فتح کو ۵۰۱ سال گزرنے پر نکالا گیا تھا۔ اس طرح نزولِ قرآن کی چودہ صد سالہ تقریب پر بھی اس نے خصوصی نمبر نکالا تھا۔ مولانا مودودی جب لندن جاتے وقت استنبول کے ہوائی اڈہ پر ٹھہرے تھے تو اس تنظیم کے کارکنوں کا ایک وفد مولانا محترم سے مِلا اور اُس نے اپنی تنظیم کی طرف سے اپنے میگزین کا ایک سیٹ تُرکی جھنڈے میں لپیٹ کر اس ٹائیٹل کے ساتھ مولانا محترم کی خدمت میں پیش کیا کہ (Buyuk Islam Mucahi Dine) (اسلام کے مجاہدِ اعظم کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت)۔ مَیں نے اپنے ترک دوست صالح اوزجان سے دریافت کیا کہ تُرکی جھنڈے کے اندر میگزین کو لپیٹ کر پیش کرنے میں کیا حکمت تھی؟ صالح اوزجان نے بتایا کہ "ترکی کا پرچم سُرخ جس کے وسط میں سفید رنگ کا ستارہ ہلال ہے اب سیکولرازم کا شعار نہیں اسلام کا شعار بنے گا"۔ طلبہ کی مذکورہ بالا دونوں تنظیمیں عربوں کی حمایت اور یہودیوں کی جارحیت کے خلاف آواز بلند کرتی رہتی ہیں۔ میرے رفیق نائف آفندی نے بتایا کہ اس ہال میں جون کے پہلے ہفتے میں یومِ فلسطین منایا گیا ہے۔ اور ایک عظیم اجتماع منعقد کیا جا چکا ہے جس میں ۲ ہزار طلبہ شریک ہوئے تھے۔ مرکز کے بیرونی دروازے کی پیشانی پر ایک بینر لٹکایا گیا تھا جس پر لکھا ہوا تھا "فلسطین میں یہودیوں کے مظالم"۔ ایسے ہی ۲۵ بینر استنبول کی مختلف سڑکوں پر لگائے گئے تھے۔ اجتماع کمیٹی کی طرف سے مسئلہ فلسطین کے موضوع پر شہر میں وسیع پیمانے پر لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ ہال کے اندر نمائش لگائی گئی جس میں

فلسطینی مہاجرین اور ناپام بموں سے متاثر ہونے والوں کی تصاویر پیش کی گئیں۔ مختلف طریقوں سے یہ دکھایا گیا کہ یہودیوں کے آئندہ عزائم کیا ہیں۔ اسٹیج پر مسجد اقصیٰ کی بہت بڑی تصویر نصب تھی۔ مختلف مقررین نے تقریریں کیں۔ ترکی شعراء نے نظمیں سنائیں جنہیں سن کر لوگ رو رہے تھے۔ الغرض طلبہ نے مسلمانوں کے اس اہم مسئلہ پر ترک ملت کو متوجہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ ہے اُن مسلمان ترکوں کا رویہ جنہیں عرب برابر مطعون کرتے چلے آ رہے ہیں۔

محمد الفاتح کی جامع اور درس گاہ

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آج کی افطاری بھی مدرسہ امام و خطیب میں تھی۔ وفاق ملی برائے ترک طلبہ کے مرکز سے ہم سیدھے مدرسہ امام و خطیب روانہ ہو گئے۔ ہماری موٹر رواں دواں جا رہی تھی کہ استنبول کی بلدیہ کے پاس پہنچ گئے۔ اور کچھ فاصلہ آگے چلے ہوں گے کہ نائف آفندی نے سڑک کے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ جامع محمد الفاتح ہے۔ اس جامع کو اندر سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ گو جی چاہتا تھا کہ جو شخصیت تاریخ میں استنبول کی رُوحِ رواں رہی ہے اُس کی اپنے نام سے تعمیر کردہ مسجد کے خدوخال کی بھی زیارت ہو جائے، مگر وقت کی تنگی آڑے آئی۔ البتہ مسجد کی ملحقہ عمارات اور حدود اربعہ پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کا موقع نکال ہی لیا۔ اس مسجد کا خصوصی وصف یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک بہت بڑی تعلیمی درسگاہ بھی تھی۔ اس درس گاہ کی عمارتیں اب بھی موجود ہیں اور کسی بہت بڑی



جامع سلطان محمدؒ فاتح، استنبول

یونیورسٹی کا پتہ دیتی ہیں۔ آستانۂ خلافت میں اس درس گاہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔
محمد الفاتح محض صاحبِ سیف و سنان ہی نہ تھا، علم و ادب کا قدر دان بھی تھا۔ اپنی
مسجد کے ساتھ اس نے علم و ادب کی اعلیٰ درس گاہ قائم کر کے اسلامی تاریخ کے ان
حکمرانوں کی مثال قائم کی جن کے ایک ہاتھ میں دستۂ عَلَم تھا اور دوسرے ہاتھ میں
دفترِ علم۔ مگر اب درس گاہ محمد الفاتح ویرانہ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ صرف خالی عمارتیں
باقی ہیں۔ جب ایا صوفیا کو میوزیم بنایا گیا تھا (۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء) تو جامع محمد الفاتح
کو گودام بنا دیا گیا۔ یہ زیادتیاں کسی غیر مسلم فاتح سے تو متوقع ہو سکتی ہیں لیکن ایک
مسلمان ملک میں ان کا ارتکاب مصطفیٰ کمال کے عہد میں کیا گیا! ایا صوفیا کو مسجد سے
میوزیم میں تبدیل کرنے کی وجہ تو پھر بھی یہ ہو سکتی تھی کہ یہ مسیحی یورپ کو راضی کرنا مقصود
تھا۔ مگر مسجد محمد الفاتح کو کس کی رضا جوئی کے لیے گودام بنایا گیا۔

عمل پسند قوم

مدرسہ امام و خطیب میں کل کی طرح آج بھی افطاری پر گروہِ کثیر جمع تھا۔ افطاری
کے بعد حسبِ معمول تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج بھی مجھے تقریر کے لیے مجبور
کیا گیا۔ پہلے تو تقریر کی دعوت میرے لیے "بلائے ناگہانی" تھی مگر اب یہ کیفیت
ہو گئی کہ جوں ہی چھوٹے یا بڑے اجتماع کا سامنا ہوا، ذہن نے یہ سمجھ کر کوئی نہ
کوئی موضوع تراشنا شروع کر دیا کہ ترک بھائی تقریر کے بغیر معاف نہیں کریں
گے۔ لیکن معاملہ اگر محض تقریر اور سخن سازی پر ٹل سکتا ہو تو بھی قابلِ برداشت
ہے۔ اور انسان حُسنِ مخلص کی تدبیر کر سکتا ہے۔ مگر یہاں ہندوستان اور پاکستان
کی طرح چرب زبانی سے کام لینا اور لچھے دار تقریر جھاڑ دینا مشکل میں بھی مبتلا کر

سکتا ہے۔ ترک قوم آج کل کے عربوں کی طرح باتونی نہیں ہے بلکہ عملی قوم ہے۔ ترکوں کے سامنے اگر مؤثر تقریر کر دی جائے تو اُن کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں اور وہ فوراً عمل کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ترک طبعاً ایسے علم الکلام سے واقف نہیں ہیں جس کی تان زبان و بیان پر ٹوٹ جاتی ہو، بلکہ وہ صرف اس علم الکلام کو جانتے ہیں جس کے قلابے گرز و میدان سے ملے ہوئے ہوں۔

راقم الحروف کو ترکوں کی عمل پسندی کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ہمارے ایک عرب دوست استاذ محمود مہدی استانبولی بڑے صاحبِ جذبہ آدمی ہیں۔ دمشق کے ماہنامہ "التمدن الاسلامی" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اسی رسالے میں انہوں نے اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ حج کے زمانے میں انہوں نے حاجیوں کے بحری جہاز کے اندر لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کی۔ حجاج کے اندر ترکوں کی ایک جماعت بھی موجود تھی۔ تقریر میں انہوں نے دُنیائے اِسلام کی حالتِ زار اور بالخصوص المیۂ فلسطین پر وضاحت سے روشنی ڈالی اور تمام حاضرین سے اور علی الخصوص ترکوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اسرائیل کے ساتھ قطعاً تعاون نہ کریں، کیونکہ اسرائیل سے تعاون کرنا اسلام کے منافی ہے۔ جہاد کی ضرورت پر بھی انہوں نے زور دیا۔ اس تقریر کے بعد انہوں نے اپنے ایک ترکی دان ساتھی سے کہا کہ وہ اس تقریر کا ترکی ترجمہ پیش کریں۔ چنانچہ ان صاحب نے بڑے مؤثر اور جذبہ انگیز انداز میں ترک حجاج کے سامنے تقریر کا ترجمہ پیش کیا۔ تقریر سُن کر تمام تُرک حاجی مترجم کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے کہا کہ "جب ہم نے اپنے وطن سے کُوچ کیا تھا تو ہم یہ وصیت کر آئے تھے کہ واپس نہیں

آئیں گے۔ یا حضرت مولانا چلیے، ہم آپ کی قیادت میں جہاد کریں گے" یہ رنگ دیکھ کر مترجم کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ کہنے لگے: "محمود صاحب آپ نے مجھے سخت مشکل میں پھنسا دیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ معاملہ صرف ایک تقریر کر دینے کا ہے اور بس مگر یہ لوگ تو سچ مچ لڑنے مرنے پر اُتر آئے ہیں اور بات سنجیدگی اختیار کر گئی ہے۔ ترک قوم تو مذاق اور زبان آرائی نہیں جانتی"۔[1] یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ محمود صاحب اور اُن کے ساتھی نے ترک حاجیوں سے کس طرح جان بخشی کروائی۔ مگر یہ واقعہ ترکوں اور عربوں دونوں کے ملی کردار کا عکس پیش کرتا ہے۔

اسلامی تعلیم کا شوق

راقم الحروف نے افطاری کے بعد مختصر تقریر کی۔ اس مرتبہ ترجمانی کے فرائض الٰہیات فیکلٹی کے ایک پروفیسر صاحب نے سر انجام دیئے۔ نام تو اُن کا یاد نہیں رہا مگر موصوف ازہر یونیورسٹی (قاہرہ) کے گریجویٹ ہیں اور نہایت فصیح اور شستہ عربی میں گفتگو کرتے ہیں۔ اُن کا یہ فقرہ ابھی تک میرے دل پر نقش ہے کہ "ترکوں کے اندر اسلامی شعور از سرِ نو اُبل پڑا ہے" مترجم چونکہ عربی دان تھا اس لیے میں نے تقریر بھی عربی زبان میں کی۔ میں کل سے سُن رہا تھا کہ مدارس امام و خطیب کے فارغ شدہ طلبہ کو تکمیلِ تعلیم میں بڑی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ الٰہیات فیکلٹی ایک محدود تعداد سے زیادہ طلبہ کو نہیں لیتی جب کہ ہر سال ان مدارس سے ہزارہا کی کھیپ فارغ ہو رہی ہے۔ دوسرے کالجوں کے دروازے بھی ان

---

[1] ماہنامہ التمدن الاسلامی، دمشق۔ ج ۲۳ شمارہ اپریل ۵۷ء

پر بند ہیں۔ حالانکہ ذہنی اور علمی استعداد کے لحاظ سے یہ طلبہ گورنمنٹ کے سیکولر اسکولوں کے طلبہ کی نسبت بہت بلند تر ہیں اور اسی "شوخیٔ طبع" کی وجہ سے ملک کی سرکاری یونیورسٹیاں انہیں لینے سے گریز کر رہی ہیں[1]۔ میں نے اپنی تقریر میں پاکستان کے نظامِ تعلیم پر روشنی ڈالی اور پاکستان میں اسلامی تعلیم اور پاکستانی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اسلامیات کے حدود اربعہ بیان کیے۔ یہ اشارہ بھی کر دیا کہ پاکستان میں اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مواقع موجود ہیں اور پاکستانی مسلمان تُرک طلبہ کا خیر مقدم کریں گے۔ تقریر کے بعد میں بھی اُسی مشکل میں پھنس گیا جس میں دمشق کے محمود مہدی استانبولی اور اُن کے ساتھی پھنس گئے تھے۔ مدرسہ امام و خطیب کے نہ صرف طلبہ کی ایک کثیر تعداد بلکہ بعض اساتذہ تک بھی پاکستان جانے کے لیے تُل گئے بلکہ پا بہ رکاب ہو گئے۔ اُن کے جذبۂ بے اختیارِ شوق کو دیکھ کر راقم الحروف کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دل نے بہ آہِ سرد کہا اے کاش! پاکستان ان شیروں اور شیرزادوں کو فراخ دلی سے اپنے ہاں جگہ دینے کے لیے

---

[1] ان مدارس کی تنظیموں اور حکومت کے درمیان مدّت سے جھگڑا چل رہا تھا۔ ان تنظیموں کا مطالبہ تھا کہ مدرسہ امام و خطیب کے فارغ شدہ طلبا کو بھی یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ جس کالج میں چاہیں داخلہ لے سکیں اور اگر حکومت کو ان کی صلاحیتوں میں کچھ شُبہ ہو تو وہ دوسرے طلبہ کے ساتھ ان طلبہ کا امتحانی مقابلہ کرا سکتی ہے۔ میں تُرکی ہی میں تھا کہ یہ خبر مل گئی کہ حکومت نے مدارس امام و خطیب کی تنظیموں کا مطالبہ تسلیم کر لیا ہے اور اب وہ ہر کالج میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

تیار ہوتا اور یہ اکتساب علم کے لیے پاکستان کے دروازے بے تکلف کھلے ہوئے پاتے۔ ترکوں نے قرنوں اسلام اور ملتِ اسلامی کی پاسداری کی ہے۔ اب کچھ تو اس احسان مندی کا لحاظ ہو۔ طلبہ اور اساتذہ نے مجھے بتایا کہ "اگر ہم مغربی ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جائیں تو ہمیں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں لیکن اگر ہم اسلامی ممالک میں تعلیم کے لیے اور بالخصوص اسلامی تعلیم کے لیے جانا چاہیں تو ہزاروں موانع سامنا کرتے ہیں۔" ترکوں ہی پر کیا موقوف جو مسلمان بھی زہرِ ہلاہل کو قند کہنے سے انکار کرے گا ایسی رکاوٹوں سے دوچار ہوگا۔

مغرب کی نماز پڑھی تو یوسف صالح قرجہ بھی آ گئے۔ مدرسہ امام و خطیب کے پرنسپل صاحب نے پیش کش کی کہ میں مدرسہ کی عمارت اور نظام کو دیکھوں۔ پیاسے کو آبِ زلال کی پیش کش مل گئی۔

مدرسہ امام و خطیب کی تفصیلات

مدرسہ امام و خطیب کی یہ عمارت محمد الفاتح کی مسجد کے قریب ہے۔ یوسف صالح قرجہ کے الفاظ میں "جامع محمد الفاتح کا قرب مدرسہ امام و خطیب کے طلبہ کو اپنے شاندار ماضی کی یاد دلاتا رہتا ہے۔" یہ عمارت پانچ منزلہ ہے اور جدید ترین طرز پر بنی ہوئی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۱۰۰ سو میٹر ہے، ایک ہزار تین سو طلبہ ہیں اور ۵۰ اساتذہ ہیں۔ مدرسہ کا اپنا شفا خانہ ہے۔ لائبریری، دارالمطالعہ اور مطبخ کا نظام معیاری ہے۔ درس گاہیں نہایت صاف اور پُرسکون ہیں۔ طلبہ کے لیے نشستوں کا انتظام جدید تقاضوں کا عکاس ہے۔ ہوسٹل صفائی اور نظم اور سلیقہ کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ بستروں اور آہنی چارپائیوں کی یکسانیت

قابلِ دید ہے۔ ضرورت مند طلبہ کے لیے لباس نصابی کُتب اور طبی امداد مفت مہیّا کی جاتی ہے۔ دوسری منزل پر ایئر کنڈیشنڈ مسجد ہے۔ نماز باجماعت اور تجوید و قرأت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ہوسٹل کے ہر حصّے میں ایک نگران مقرر ہے جو طلبہ کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہی نہیں اُن کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت کا ذمّہ دار بھی ہے۔ مطبخ جدید ترین سامان سے لیس ہے۔ برتن خوش ذوقی کا آئینہ اور کھانے کی میزیں اور اُن کی ترتیب عسکری رُوح سے لبریز۔ کھانے کی تیاری کے لیے باتنخواہ طبّاخ اور تقسیم کے لیے طلبہ کی باری باری ڈیوٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ غسل خانوں اور طہارت خانوں کی افراط ہے طلبہ کو اساتذہ سے عقیدت اور اساتذہ کو طلبہ سے محبت اور دونوں مدرسۂ امام و خطیب کی ترقی و عروج کے طلب گار۔ یوسف صالح قرجہ نے بتایا کہ اس مدرسہ میں طلبہ کے اندر کبھی دنگا فساد نہیں ہوا۔ چوری اور خیانت کے حادثات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایثار و اخوّت کی بھرپور فضا اور تلاوتِ قرآن کی کثرت دِلوں کو نصب العین سے ہمہ وقت مربوط رکھتی ہے۔ شہر کے مسلمان بھی ان طلبہ کو حقارت کی نظروں سے دیکھنے کے بجائے عزت و احترام سے پیش آتے ہیں۔ اور انہیں مستقبل کی امید گردانتے ہیں۔ میرے ایک ساتھی عبد القادر سیزگین اس مدرسہ کے فارغ ہیں۔ مختلف کلاسوں سے ہوتے ہوتے جب ہم اُن کے کلاس روم میں پہنچے جہاں وہ خود مدرسہ کی تعلیم کا آخری سال گزار چکے ہیں تو وہ بے محابا اپنی نشست کی طرف لپکے اور پرانی یاد تازہ کرنے کے لیے وہاں جا بیٹھے۔ ۲۵ سال کا یہ باریش نوجوان نشست پر بیٹھتے ہی اشکبار ہوگیا۔ اس کے یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے: "اے میری پیاری

درس گاہ، خدا تجھے ہمہ جہت ترقی سے ہمکنار کرے۔ تُونے مجھے دین سے آشنا کیا۔ مادہ پرستی کے سیلاب کے اندر مجھے روحانی لذت سے آشنا کیا۔ اَے میرے پیارے بنچ، اے میرے محبوب ڈیسک، اَے میری نگاہوں کے مرکز تختۂ سیاہ، اَے زمین، اَے چھت، مَیں تمہارا احسان اور تمہاری محبت کبھی فراموش نہیں کر سکتا"

عبد القادر سیز گین بے خود تھے۔ نائف آفندی نے اُن کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا کہ "آفندم ہمیں جلدی ہے۔ یہ عثمانی تھیٹر نہیں ہے۔ پھر کبھی دل کی بھڑاس نکال لیجیے۔" عبد القادر سیز گین عثمانی تھیٹر میں کام کرتے ہیں۔ اس تھیٹر میں عثمانیوں کی تاریخ اسٹیج کی جا رہی ہے۔ عثمانیوں سے محبت و عقیدت کے اظہار کے لیے ترک نوجوان گوناگوں اور بوقلموں طریقے ایجاد کر رہے ہیں۔ یوسف صالح قرجہ اور دوسرے احباب کی معیت میں مدرسہ امام و خطیب کے اہم حصّوں اور شعبوں کو دیکھا۔ لائبریری میں کچھ دیر استراحت کی اور کتابوں کا جائزہ لیا۔ زیادہ کتابیں لاطینی رسم الخط میں ہیں۔ عربی رسم الخط کے بھی کچھ نسخے ہیں۔ عربی زبان میں تفسیر اور حدیث کی چند کتابیں بھی موجود ہیں۔ ایک ثانوی اسکول کی لائبریری کے لیے جس طرح کے ذخیرۂ کتب کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی حد تک مہیّا ہے۔ اس سے استفادہ کرنے والے زیادہ تر اساتذہ ہیں۔ لائبریری کے انچارج نے بتایا کہ طلبہ کو لائبریری سے استفادہ کے لیے باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے مولانا مودودی مدظلہ العالی کی کتابوں کے تُرکی تراجم بھی لائبریری میں موجود ہیں۔

مذہبی تعلیم کا آغاز کب ہوُا

اتنا بڑا ادارہ حکومت کی امداد پر نہیں بلکہ عامۂ مسلمین کی امداد پر چل رہا ہے۔

۱۹۵۰ء تک ترکی میں "مذہب کی دیکھ بھال" حکومت کا محکمۂ امورِ مذہبی کرتا تھا۔ مصطفیٰ کمال نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد شیخ الاسلامی کے منصب کو ختم کر دیا، اور وزارتِ اوقاف کو (۲ر مارچ ۱۹۲۴ء میں) توڑ کر اُسے وزارتِ تعلیم میں مدغم کر دیا۔ اور "مذہب کی نگرانی" کے لیے محکمہ اُمورِ دینی قائم کر دیا۔ مگر اس محکمہ کے ساتھ ترکی کی سیکولر حکومت نے عملاً ایسا برتاؤ کیا کہ وہ بالکل بے جان محکمہ بن کر رہ گیا۔ ۱۹۵۰ء تک مذہب پر ہر شو خزاں کے بادل چھائے رہے۔ اس کے بعد سیاسی حالات میں جب تبدیلی کا آغاز ہوا تو معاشرتی زندگی بھی اس سے متاثر ہونے لگی اور ترک مسلمانوں نے اوّلین فرصت میں اپنے مذہب کی طرف دھیان دیا۔ اِسی دَور کی بات ہے کہ ۱۹۵۱ء میں "اشاعتِ علم کے نام سے ایک انجمن کی تاسیس ہوئی۔ مدرسۂ امام و خطیب اسی رفاہی انجمن کی ایک کوشش ہے۔ ترکی میں احیائے اسلام کی موجودہ مساعی کے اندر انجمن اشاعت علم کا بھی قابلِ قدر کردار ہے۔

انجمن اشاعتِ علم اور اس کی خدمات

۶۸ ارکان سے انجمن اشاعتِ علم کا آغاز ہوا اور ایک غیر سیاسی ثقافتی اور رفاہی ادارے کی حیثیت سے اُس نے کام کی طرح ڈالی۔ اب اُس کے ارکان ہزاروں سے متجاوز ہیں اور ہر طبقے اور گروہ کی نمائندگی اسے حاصل ہے۔ سب سے پہلا کارنامہ اس انجمن کا یہ ہے کہ اس نے عوام کے چندے سے ایک شرعی مدرسے کی بنا ڈالی اور اب ترکی کے گوشے گوشے میں مدارس شرعیہ قائم ہو چکے ہیں[1]۔ جنہیں مدارس امام و خطیب

---

[1] ان مدارس کی موجودہ تعداد ۷۰ ہے اور اس میں زیرِ تعلیم طلبہ کی کُل تعداد ۴۲ ہزار ہے۔ ترکی کے اندر دینی تعلیم کے موجودہ نظام کا مفصّل ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔

کہا جاتا ہے۔ خود انجمن کی اب ۲۰ سے زائد شاخیں ہیں اور بہت بڑا بجٹ اس کے تصرف میں ہے۔ اس کے صدر ایک پُرانے فوجی کرنل جمال قرہ بکر ہیں۔ نائب صدر ایک وکیل ہیں۔ انتظامیہ کے ارکان میں زیادہ تر تعداد وکلاء اور انجینئر اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دین کے احیاء میں دلچسپی صرف قدیم طبقے کو ہی نہیں ہے بلکہ جدید طبقہ میں بھی اس کا شدید احساس ابھر رہا ہے۔

استنبول کے مدرسۂ امام و خطیب کا آغاز ۲۰ طلبہ سے ہوا اور اب ایک ہزار ۳ سو طلبہ تک تعداد جا پہنچی ہے۔ پہلے یہ ایک کرائے کی عمارت میں تھا اور اب جس وسیع و ضخیم عمارت میں ہے یہ اس کی اپنی ملکیت ہے اور ۲۰ لاکھ ترکی پونڈ سے تیار ہوئی ہے۔ پھر بھی ناکافی ہو رہی ہے۔ طلبہ کی رہائش کے لیے ۶۰ ہزار ترکی پونڈ کے سالانہ کرائے سے ایک اور ملحقہ عمارت حاصل کی جا چکی ہے۔ انجمن اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ اور یونیورسٹیوں کے دیگر طلبہ کی بھی امداد کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے انجمن نے ایک الگ ہوسٹل تعمیر کر دیا ہے جس کا رقبہ ۱۵ سو میٹر اور کل مصارف ۲۰ لاکھ ترکی پونڈ ہیں۔ مذہب، معاشرت، قانون اخلاق، ادب اور صنعت و زراعت کے میدان میں بھی انجمن کی قابل تعریف خدمات ہیں۔ معاشرتی امراض خصوصاً جوئے اور شراب کے خلاف انجمن نے آج کل خاصی زوردار مہم چلا رکھی ہے۔

روزنامہ بُگُن اور اس کے ایڈیٹر

مدرسۂ امام و خطیب سے فارغ ہو کر ہم روزنامہ بُگُن کے دفتر میں گئے۔

بگن کے ایڈیٹر جناب محمد شوکت ایجی سے ملاقات ہوئی۔ موصوف روزنامہ بگن کے ساتھ روزنامہ صباح بھی چلا رہے ہیں۔ دونوں کی اشاعت بہت وسیع ہے۔ صرف بگن کی اشاعت ۸۰ ہزار ہے۔ نہ صرف ترکی بلکہ پورے یورپ کے صہیونی اور سامراجی حلقے بگن پر سیخ پا ہو رہے ہیں۔ لندن کا مشہور یہودی پرچہ جیوش کرانیکل تو بار بار بگن کے خلاف خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔ محمد شوکت ایجی جواں سال اور جواں ہمت صحافی ہیں۔ انگریزی میں بات چیت کر لیتے ہیں۔ عربی سمجھتے ہیں بول نہیں سکتے۔ ترکی زبان کے آتش بیان ادیب ہیں۔ ترکی کے ملحد اور لادین طبقے اور دونما اور یہودیوں کے خلاف تند و تیز جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ موصوف بڑے تپاک سے ملے۔ مولانا محترم کی خیریت دریافت کی اور واپسی پر مولانا کے پروگرام کی تفصیل پوچھی۔ پاکستان کے سیاسی مسائل، المیۂ فلسطین اور ترکی کی اسلامی تحریک کے موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ ان دنوں پاکستان میں شدید ہنگامے ہو رہے تھے۔ عرب اور مسلمان ممالک کے اکثر صحافیوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ پاکستان کے صحیح حالات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ سعودی عرب میں روزنامہ المدینہ کے سوا کسی پرچے کے اندر پاکستان کے حالات کا صحیح تجزیہ نہیں دیکھا۔ مصری اخبارات نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ وہ پاکستانی خبروں کو اہمیت نہیں دیں گے۔ انہیں ہندوستان سے جو عشق ہے وہ پاکستان کی طرف ان کو ملتفت نہیں ہونے دیتا۔ بیروت کا الحیاۃ پاکستان کی خبریں اندر کے صفحات میں شائع کرتا ہے مگر نہایت سطحی طور پر۔ پاکستان کے سفارت خانے کی بدولت وہ پچھلے دس سال میں ایوب صاحب کی "حکومت راشدہ" کے قصیدے پڑھتا رہا ہے۔ جو لوگ فی الواقع

پاکستان سے قلبی تعلق رکھتے ہیں وہ بھی پاکستانی سیاست کو ظاہری سطح سے آگے کچھ نہیں جانتے۔ ترکی کے دوسرے صحافیوں کا تو مجھے اندازہ نہیں ہے مگر ٹگُن کے ایڈیٹر محمد شوکت ایجی کو پاکستانی سیاست پر گہری نظر حاصل ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی اشتراکیت نوازی پر خوب روشنی ڈالی اور ان کے اس زمانے کے حالات سُنائے جب وہ وزیر خارجہ تھے۔ یہاں تک کہہ گئے کہ پاکستان کے آنے والے دس سال اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ فری میسن اور یہودیوں کی بین الاقوامی سازشوں سے باخبر ہونے کی وجہ سے مجھے بار بار متوجہ کرتے رہے کہ پاکستان بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہیں ہے۔ بتانے لگے کہ ترکی میں خلافت کا خاتمہ اور لادینیت کا ظہور فری میسن اور یہودیوں کی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے بتایا کہ جب سے میں نے ان دونوں کیخلاف آواز اُٹھا رکھی ہے یہ مجھے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے قابو کرنے کے دَرپے ہیں۔ بلکہ یہودی تو مجھے کئی لاکھ کی رشوت پیش کر چکے ہیں تاکہ مَیں اُن کی سازشوں کو بے نقاب کرنے سے دستبردار ہو جاؤں۔ موصوف عربوں پر بہت برستے رہے اور اُن کی کوتاہ ہمتی، باہمی کشمکش، اخلاقی انحطاط اور خلافِ اسلام نظریات پر فریفتگی پر افسوس کا اظہار کرتے رہے۔

اِسرائیل اور تُرک مسلمان

مسئلہ فلسطین کے بارے میں اس نوجوان تُرک صحافی کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے یوم فلسطین کے موقع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کیا ہے:

" پچھلے سال اسی تاریخ کو اسرائیل نے نہایت وحشیانہ طریقے سے سرزمین عرب پر قبضہ کر لیا اور پُرامن آبادی کے اندر اس نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور ہزاروں باشندوں کو ظالمانہ طور پر ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ اسرائیل کی یہ جارحانہ کارروائی اُن فراخ دلانہ امدادوں کی بدولت عمل میں آئی ہے جو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور مغربی جرمنی سے اُسے جدید ترین ہتھیاروں اور ناپام بموں کی شکل میں مل رہی ہے۔"

" حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل آج صرف عرب ممالک کے لیے ہی ایک خطرہ نہیں ہے بلکہ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ مشرق اوسط کے پورے علاقے کے لیے جس میں خود ترکی بھی شامل ہے عظیم خطرہ بن رہا ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ فقرہ لکھا ہوا ہے کہ " اسرائیل کی جغرافیائی حدود نیل سے فرات تک ہیں۔" اس کے معنی یہ ہوئے کہ دریائے فرات جس کا نصف حصہ عرب کے اندر ہے اور نصف ترکی کے اندر اسرائیل کی جوع الارضی کا ہدف ہے۔ اس حقیقت سے صیہونی پریس اور اس کے ہم سفر قطعاً انکار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ترکی کے بعض یہودی سرمایہ داروں نے ابھی سے شامی سرحدوں سے متصل علاقوں مثلاً مرسین، آدنہ اور اسکندرونہ کے اندر زمینیں خریدنی شروع کر دی ہیں اور وہاں کارخانے اور تجارتی مراکز کھولنے شروع

کر دیئے ہیں کیونکہ یہ علاقے اسرائیل کی سرحدوں سے ملتے ہیں۔"

"یہ بات بڑی المناک ہے کہ بحر ابیض کے اندر یہودیوں کی دو بہت بڑی کالونیاں ہیں۔ ایک روشنیا تلڈ کی سرزمین فرانس اور دوسرے ترکی۔ ترکی میں ۴۵ ہزار یہودی ہم مسلمانوں کے بل بوتے پر جی رہے ہیں۔ اور خود ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ ترکی کی فری میسن لاج، لائنز کلب اور روٹری کلب ان یہودیوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ یہ یہودی ہمارے ملک کی صحافت اور نشر و اشاعت کے وسائل و ذرائع کے واحد اجارہ دار بن کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ترکی کے اخبارات نے (جنہیں بظاہر مسلمان چلا رہے ہیں) روزنامہ بگن کے سوا اسرائیل کے خلاف ایک سطر تک نہیں لکھی۔ حتیٰ کہ بعض اخبارات جو دائیں بازو کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں ان کی رگ ترکی کے مشہور یہودی سرمایہ دار اردن ماجور کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں کے بنک، درآمدی و برآمدی ادارے، اخبارات، نصابی کتابیں، انشورنس کمپنیاں تمام تر یہودیوں اور فری میسنز یوں کے قبضہ میں ہیں۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جو ترک مسلمانوں کو ندامت اور شرمندگی سے پانی پانی کر رہی ہے۔"

"مزید برآں اسرائیلی جارحیت کسی معین حد تک جا کر رک جانے والی نہیں ہے۔ یہودیوں کے توسیع پسندانہ عزائم مملکت داؤد کو بحال کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی حدود فرات سے نیل تک

بتائی جاتی ہیں۔ گویا یہ مملکت اُن مسلمانوں اور عربوں کو بے گھر کر کے وجود میں لائی جاتے گی جو تیرہ سو سال سے وہاں آباد ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہودیوں کی یہ تمام کارروائیاں بین الاقوامی قزاقی سے عبارت ہیں۔"

"یہ صورتِ حال کب تک برداشت کی جائے گی؟ ترکوں کے دل اپنے عرب بھائیوں کے دوش بدوش دھڑک رہے ہیں۔ عرب ہمارے دینی بھائی ہیں۔ بیت المقدس صرف عربوں کا شہر نہیں ہے بلکہ وہ تمام اسلامی دنیا کی میراث ہے۔ کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور عربوں اور ترکوں کے اندر از سرِ نَو اتّحاد و یگانگت کی فضا پیدا کی جائے۔ مَیں اپنے تمام دینی بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ متّحد ہو جائیں۔ ہم غصب شدہ علاقوں سے یہودیوں کو صرف اتّحاد کے ذریعہ ہی نکال سکتے ہیں۔"

"اے تُرک بھائیو! یہ نہ سمجھو کہ اسرائیل ہم سے بہت دُور ہے۔ بلکہ وہ ہمارے بہت نزدیک ہے۔ وہ ہمارے اندر پھل پھول رہا ہے۔ وہ ہمارے مال لُوٹ رہا ہے، ہمارا استحصال کر رہا ہے اور ہماری سرحدوں سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسرائیل نے اب (خدانخواستہ) مدینہ منورہ کی طرف بھی جھانکنا شروع کر دیا ہے۔ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی

تمام میدانوں میں اسرائیل کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیں۔ آج قلم اور زبان سے اُس کے خلاف آغازِ جنگ کر دیں اور کل ہتھیاروں کے ساتھ اُس کے مقابلے میں ڈٹ جائیں یہاں تک کہ سلب شدہ علاقے آزاد ہو جائیں۔ اور ہمارا بیت المقدس ہمیں مِل جائے۔ انشاء اللہ"

یہ اُس ترک صحافی کے جذبات و خیالات ہیں جس کے بھائی بند چند سال قبل قُبرس کی جنگ میں اُن ہتھیاروں سے زخم کھا چکے ہیں جو مصر نے مکاریوس کو فراہم کیے تھے۔ ترکی کے ملاحدہ اور قوم پرست عربوں کے حق میں کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ یہ صرف عام مسلمان ہیں جو اِسلامی اخوت اور اسلامی رشتہ کو ہر قیمت پر ترجیح دیتے ہیں۔ شریف حسین، غازی فیصل اور عرب قوم پرست اگر زندہ ہوتے تو وہ دیکھ لیتے کہ انگریزوں کی چالوں اور کرنل لارنس کے مشوروں نے جس قوم کے خلاف انہیں کھڑا کر دیا تھا وہ اس سزا کی مستحق نہ تھی کہ اس کے چند غلط اندیش لیڈروں کی نازیبا کارروائیوں سے بھڑک کر اُس قوم کی عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام کیا جاتا، اس کی ٹرینوں کی ٹرینیں ڈائنامیٹ سے اُڑا دی جاتیں اور صحراؤں کے اندر اُس کے گوشت کے ٹکڑے بکھیرے جاتے۔ مگر اب ترک مسلمان اس داستان سینہ فگار کو بھول جانا چاہتا ہے۔ عربوں کو بھی اب عقل کے ناخن لینے چاہئیں۔

مولانا محترم کا انتظار

شوکت صاحب کے دفتر کی ہر چیز نہایت قرینے اور ترتیب سے رکھی ہوئی

تھی۔ باہر اگرچہ سردی انتہائی شدید تھی مگر دفتر کو اندر سے ہیٹروں نے خوب گرم کر رکھا تھا۔ بگن اور صباح دونوں کا سٹاف نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اس گفتگو میں سٹاف کے اور بھی متعدد ارکان شریک تھے۔ مولانا رومیؒ کی برسی اور مدرسہ امام و خطیب میں میری تقریروں کو بگن نے صفحۂ اوّل پر شائع کیا تھا، اور اب وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ مولانا محترم ترکی میں آئیں اور بگن اُن کی آمد پر خصوصی نمبر نکالے۔

اسلامی صحافت

وقت کم ہو اور آرزوئیں لامحدود، ایسی صورت میں جو قلبی کیفیت ہوتی ہے وہی یہاں تھی۔ بے ربطی کے ساتھ بہت سی اِدھر اُدھر کی باتیں ہو گئیں اصل چیز جس نے دل پر بے پناہ اثر چھوڑا وہ یہ تھی کہ اگر صحافت اور تعلیم کو نوجوان خون اسی طرح میسّر آتا رہا تو وہ دن دور نہیں کہ یہودی صحافت کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ ماضی قریب کی بات ہے کہ احمد امین یلمان کا وطن اخبار ترکی کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ احمد امین دونما گروہ سے تعلق رکھتا ہے، اور آج بھی روزنامہ جمہوریت اور حریت وغیرہ یہودی سرمائے کے شاخسانے ہیں۔ مگر عربی محاورہ کے مطابق اِنّ فی العرین اُسودا۔ اس کچھار میں اور شیر بھی ہیں۔ استنبول کا روزنامہ بگن، روزنامہ صباح اور روزنامہ اتحاد اِسلامی جریدے ہیں، اور ۶۰ اور ۸۰ ہزار کے درمیان ان میں سے ہر ایک کی یومیہ اشاعت ہے۔ انقرہ کا ماہنامہ ہلال اور ماہنامہ حق سَیس (صدائے حق) اور ماہ نامہ سونمز (خاموش نہیں رہ سکتا) اور ماہنامہ الٰہی نور (نورِ خدا)، استنبول کا ماہنامہ

اسلام مدنیت (تمدن اسلام) اور حرکت اور اس طرح دوسرے ماہنامے کثیر تعداد میں چھپ رہے ہیں۔ اسلام پسند جوان اُمڈ اُمڈ کر صحافت کے میدان میں قدم رکھ رہے ہیں۔ عدالت پارٹی کے روزنامہ عدالت اور ایک آزاد اخبار ترجمان میں بھی اسلام پسند صحافیوں کو دخل حاصل ہے۔ نجیب فاضل کی نظمیں اور احمد قبقلی ایڈیٹر ترجمان کے غیر جانب دارانہ تبصرے ادبی و سیاسی زندگی پر خوب اثر انداز ہو رہے ہیں۔ بایں ہمہ پریس کی باگ ڈور ملاحدہ کے ہاتھ سے چھیننے کے لیے محنت، وقت اور قربانی کی وافر مقدار درکار ہے۔ ترکی کے ملحد پریس کو مغربی پریس کا تعاون حاصل ہے۔ خدا ترک مسلمان کو یہ ہمت دے کہ وہ اس دُوہری جکڑ بندی سے نجات پاسکیں۔

دُعا اسلامی تحریکوں کا مشترک ہتھیار

رخصت ہوتے وقت جناب محمد شوکت ایچی نے راقم الحروف کو استاذ بدیع الزمان نورسی مرحوم کی مطبوعہ دعاؤں کے مجموعے کا ہدیہ پیش کیا۔ دعاؤں کی کتابوں سے مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ میرے پاس اخوان المسلمون کے بانی مرحوم حسن البنا کا مرتب کردہ مجموعہ، سنوسی اعظم کا مجموعہ، عبدالعزیز بن سعود کی ادعیۂ مسنونہ کے مجموعے بھی موجود ہیں۔ اسلامی تحریک ان چیزوں سے کبھی بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ آنحضورؐ کا فرمان مبارک ہے کہ الدعاء سلاح المومن (دعا مومن کا ہتھیار ہے) ترکی میں دُعاؤں اور مناجاتوں کا بڑا رواج ہے۔ ہر نمازکے ساتھ لوگ پابندی سے کئی کئی دُعائیں بآواز بلند پڑھتے ہیں۔ بدیع الزماں نورسی مرحوم کی دعاؤں کا مجموعہ جو کافی ضخیم ہے ایک طرف اللہ کی کبریائی اور

اور قہاری و جبروت کے اعتراف سے بھرپور ہے اور دوسری طرف بندے کی بے بسی اور عجز و درماندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ دعائیں بدیع الزماں مرحوم کے معمولات میں سے تھیں۔ ان دُعاؤں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جادُو اثر شخصیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس حد تک لگاؤ رکھتی تھی۔ مرحوم کے پیرو جنہیں طلبۂ نور کہا جاتا ہے۔ بالالتزام ان دعاؤں کو نماز پنجگانہ میں دُہراتے ہیں۔ اور بڑے والہانہ انداز کے ساتھ ان کا وِرد کرتے ہیں۔ تُرکی کی اِسلامی تحریک کا یہ پہلو مجھے پسند آیا۔ اخوان المسلمون میں بھی "وردِ رابطہ" کے نام سے ایک دل گداز اجتماعی دُعا کا رواج ہے اور وہ نماز مغرب سے پہلے یا دعوتی کام پر نکلتے وقت پڑھتے ہیں۔ مگر تُرکی کے طلبۂ نور کا یہ حال ہے کہ ہر شخص کی جیب میں یہ مجموعہ ہوتا ہے، سفر میں ہو یا حضر میں جب اُسے تنہائی میسّر آتی ہے تو وہ یہ مجموعہ کھول لیتا ہے۔

موئے مبارک کی زیارت

محمد شوکت صاحب سے اجازت لے کر ایک مسجد کا رُخ کیا تاکہ نماز عشاء اور نماز تراویح میں شمولیت کی جا سکے۔ نماز کے بعد میری انقرہ کو روانگی ہے۔ دوستوں نے ایک بس میں میری سیٹ بُک کرائی ہے۔ ریل کے بجائے بس کا سفر ترک دوستوں کے مشورہ پر مبنی ہے۔ ان کی رائے ہے کہ چونکہ بسیں ایئر کنڈیشنڈ ہیں اس لیے رات آرام سے گزرے گی اور فجر کی اذان انقرہ میں سُنی جا سکے گی۔ قریب ایک مسجد میں جسے جامع خوجہ پاشا کہتے ہیں داخل ہوئے تو مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ ہمیں دوسری منزل پر بمشکل جگہ مل سکی۔ رمضان المبارک

ختم ہو رہا ہے۔ ہر برناؤ پیر رمضان کو الوداع کرنے میں جذب و شوق سے حصّہ لے رہا ہے۔ پاکستان کی طرح یہاں بھی کم عمر بچے رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مگر تربیت ایسی ہے کہ شور و غل نہیں مچاتے۔ بلکہ نمازیوں کی جُوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ ساتھیوں کے بارے میں میرا خیال تھا کہ دن بھر کے تھکے ماندے عشاء کی نماز پر کفایت کریں گے اور تراویح کی بیس رکعت کی ہمت نہ پا سکیں گے۔ مگر انہوں نے خود بھی بیس رکعت تراویح ادا کی اور مجھے بھی حوصلہ ہو گیا۔ قاری صاحب کی تلاوت کے سوز اور پھر ہر چہار رکعت پر نمازیوں کے باآواز بلند درود شریف پڑھنے نے شوق کو مہمیز لگائی۔ نماز تراویح کے بعد اعلان ہوا کہ "بال مبارک کی زیارت ہو گی۔" عثمانی خلفاء کے عہد سے جو تبرکاتِ نبویؐ آستانہ میں موجود ہیں اُن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک بھی ہے۔ ہر سال رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں استنبول انقرہ اور دیگر بڑے بڑے شہروں میں موئے مبارک کی زیارت ہوتی ہے۔ حاضرین مسنون درود شریف پڑھتے جاتے تھے اور باری باری امام صاحب کے ہاتھ سے موئے مبارک کو بوسہ دیتے جاتے تھے۔ صحت و عدم صحت سے قطع نظر موئے مبارک سے حاضرین کی محبت و عشق کا منظر دیدنی تھا۔

انقرہ کی طرف

عمر ہوٹل آ کر سامان لیا اور اتمت کمپنی کی بس کے دفتر میں آ گئے۔ ہوٹل میں مینجر صاحب سے جب ہوٹل کا بِل طلب کیا تو انہوں نے یکایک یہ انکشاف کیا کہ "بگن" کے ایڈیٹر محمد شوکت ایچی صاحب کی طرف سے بِل ادا کر دیا گیا ہے،

اور جب بس کا ٹکٹ خریدنے لگا تو معلوم ہوا کہ گزشتہ رات مدرسہ امام و خطیب میں اسمٰعیل دائے نامی جن صاحب سے کتابوں کی نشر و اشاعت کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی تھی وہ میرے لیے ٹکٹ خرید چکے ہیں۔ استنبول میں راقم الحروف کے یہ دو دن بھر پور گزرے ہیں، شہر کی سیاحت بھی کی ہے۔ بعض قابلِ دید مقامات بھی دیکھے ہیں۔ مگر استنبول نے مجھے ایک تُرکی لیرہ بھی خرچ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ہوائی اڈہ سے عمر ہوٹل تک ٹیکسی والے نے چند لیرے لیے۔ اس کے بعد عبدالقادر سیزگین نے محبت کی ایسی طرح ڈالی کہ استنبول سے انقرہ روانہ ہوتے وقت تک نبر کا بھی ہاتھ جیب تک نہ جا سکے۔ "انقرہ سے واپس استنبول آؤں گا" یہ جملہ بار بار زبان پر آجاتا۔ دل کی خواہش بھی یہ تھی اور دوستوں کا تقاضا بھی۔ مگر اس کے باوجود استنبول کی مفارقت گراں گزر رہی تھی۔ بڑی دل گرفتگی کے عالم میں "انمت بس" میں سوار ہوا۔ اور جب تک بس نے حرکت نہیں کر لی ناتف آفندی، پروفیسر عزیز، اُستاد یوسف، عبدالقادر سیزگین اور دو تین اور اصحاب مجھ سے جُدا نہ ہوتے۔

سوئے انقرہ

آبنائے باسفورس

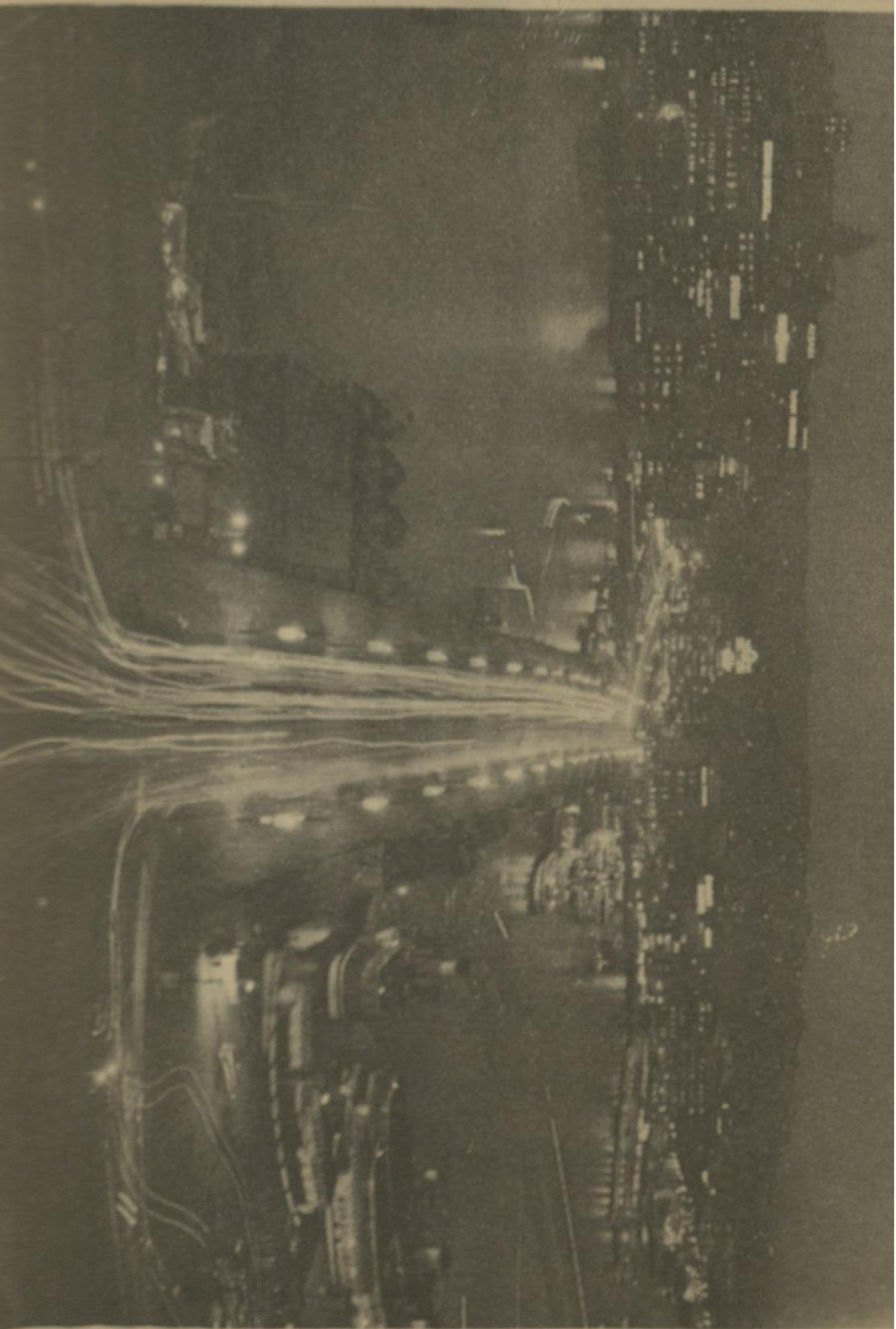
دل استنبول میں ہے اور رُخ انقرہ کی جانب۔ باسفورس کے کنارے پر جاکر ہماری بس رُک گئی۔ چند لمحات کے بعد ہماری بس یورپ سے نکل کر ایشیا میں رینگنے لگے گی۔ صرف آبنائے باسفورس درمیان میں حائل ہے۔ ہمارے پیچھے سات پہاڑیوں کا شہر ہے۔ یورپی استنبول۔ اُس کی سُرخ کھپریل کی چھتیں اور چوبی مکان بڑے دل کش ہیں۔ سات سو مسجدوں کا یہ شہر اپنی رنگینی و خوشنما روشنیوں کے ساتھ باسفورس کے سبز اور نیلے پانی میں پوری شانِ رعنائی کے ساتھ جھلک رہا ہے۔ بس سے باہر جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بسوں، ٹرکوں اور موٹروں کا طویل سلسلہ باسفورس عبور کرنے کے انتظار میں ہے۔ اسٹیمروں اور چھوٹے چھوٹے جہازوں کی کثیر تعداد نقل وحمل کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ہمارے ڈرائیور نے بس لائن میں کھڑی کر دی اور خود ٹکٹ خریدنے کے لیے نیچے اُتر گیا۔ دو تین منٹ کے بعد وہ باسفورس عبور کرنے کا ٹکٹ خرید لایا۔ "شیش کباب" ــــــ "ضلمہ" ــــــ "امام بایلدی" ــــــ "دونر کباب" ــــــ "دوگون شوربا سی"۔ چاروں طرف سے خوانچے والوں

کی آوازیں آرہی تھیں۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں بک رہی ہیں۔ بس کے مسافروں نے زادِ سفر خریدنا شروع کر دیا۔ سوچا اب یہ رات بھر کا سفر مترجم کے بغیر کٹے گا۔ کچھ پریشانی سی پیدا ہوئی۔ مجھے بھی سحری کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر لینا چاہیئے۔ مگر زبان کے باوجود بے زبانی میں گرفتار ہوں۔ یہی بے زبانی ہی میرے لیے زبان بن گئی۔ میرے قلق کو ایک نوجوان نے بھانپ لیا۔ پُوچھنے لگا: "انگریزی یا عربی جانتے ہیں؟" مَیں نے کہا ہاں، عربی جانتا ہوں۔" میرا نام عبدالقادر ہے، مصر کا باشندہ ہوں، بیروت میں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہوں۔ فرم کے سلسلے میں کئی بار ترکی آچکا ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی ترکی بول لیتا ہوں۔" اس نوجوان نے موانست پیدا کرنے کے لیے ایک ہی سانس میں اپنا بھرپور تعارف کرا دیا۔ مَیں خوشی کے مارے جامہ سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اس نوجوان نے اپنے لیے بھی کھانے کا سامان خرید لیا اور میری مدد بھی کی۔

استنبول کی عظمت کا نشان

باسفورس کے جس منظر سے اب نگاہیں کھیل رہی ہیں اُس نے دریائے نیل کے مسحور کُن مناظر کو بھی مات کر دیا ہے۔ باسفورس استنبول کی عظمت کا نشان ہے۔ باسفورس کے بغیر یہ شہر بے حقیقت ہوتا۔ اس کی رونق اور چہل پہل رات دن جاری رہتی ہے۔ ترک بچے اس میں بڑی چابکدستی کے ساتھ غوطہ زنی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ لکڑی کی چھڑیں لے کر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ کنارے پر جگہ جگہ قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ درختوں کے جُھنڈ چھتری تانے کھڑے ہیں۔

غلطہ پل، استنبول



بوڑھے لوگ بیٹھے نارجیلہ (حقّہ) پی رہے ہیں۔ مستورات اپنے چمکیلے چوبی مکانوں کی بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی اس رونق اور چہل پہل کی بہار دیکھ رہی ہیں۔ سفید رنگ کی کشتیاں ایک دوسری کے پاس سے گزرتی ہیں تو اپنے پیچھے ہلکی ہلکی پھوار چھوڑ جاتی ہیں۔ سطحِ بحر سے کسی قدر اوپر عجیب و غریب پرندوں کے جھنڈ اُڑ رہے ہیں اور کبھی کبھی اُن کے حلق سے ایسی آواز نکلتی ہے جیسے وہ کسی گمشدہ رُوح کی تلاش میں ہوں۔ جہازوں کی نقل و حرکت اس قدر منظم اور متواتر ہے کہ ایشیا یورپ میں اور یورپ ایشیا میں چند لمحات میں منتقل ہو جاتا ہے۔

یورپ اور ایشیا کا درمیانی پُل

ایک اور بات جو غیر ملکی کو متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بسوں اور موٹروں کی اتنی طویل قطاروں کے باوجود ڈرائیوروں کے اندر بے چینی نہیں۔ تُرکی بسوں اور ڈرائیوروں کو ہم نے حج کے موقع پر دیکھا ہے۔ یہ لوگ بڑے نظم پسند اور متحمل مزاج ہوتے ہیں۔ ہنگامہ آرائی، دھکم پیل اور لڑائی جھگڑے سے اکثر و بیشتر اجتناب کرتے ہیں۔ حج کی روحانی فضا میں ہی اُن کا یہ تحمّل نہیں دیکھا بلکہ باسفورس کے خالص دنیادارانہ ماحول میں بھی وہ اِسی تحمل و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یکایک وسل بجا اور بسیں اور موٹریں حرکت میں آ گئیں۔ جہاز کی نچلی سطح پر بسیں اور موٹریں مع سامان اور سواریوں کے سوار ہو گئیں اور اوپر کی کھلی سطح پر پیدل چلنے والے سوار ہو گئے۔ ۱۵ منٹ کے بعد ہم باسفورس کے ایشیائی کنارے پر پہنچ گئے۔ گویا ہم نے جہاز سے آبنائے کو عبور نہیں کیا بلکہ کسی پُل پر گزر رہے ہیں۔ یہ وہ تجربہ منظر

ہے جو دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے وجہِ کشش ہے۔ اور اگر ساتھ ہی یہ بھی تصوّر کر لیا جائے کہ محمد الفاتح نے ۱۴۵۳ء میں کشتیوں کے ذریعہ اس باسفورس کو عبور کر کے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا تو اِس منظر کی کشش میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ بدن میں ایسی زندگی بخش جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے کہ سخت سردی کے باوجود پسینہ چھوٹنے لگتا ہے۔ ایشیائی استنبول اور یورپی استنبول کہنے کو دو الگ الگ برِاعظموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر عملاً فرق کیا ہے؟ یورپی استنبول کی طرح یہاں بھی مرد سوٹوں میں ہیں، عورتوں کی نصف سے زیادہ رانیں عُریاں ہیں۔ زبانِ گفتگو وہی۔ درمیانہ قامت، متین چہرہ، خندہ پیشانی، دھیمی رفتار، کم گوئی اور محنت کشی جو یورپ کے تُرکوں میں ہے وہی ایشیا کے تُرکوں میں بھی ہے۔ مسجدوں کے میناروں پر رمضان کی خوشی میں جو قمقمے "فاتح" میں ہالہ تن رہے تھے ویسے ہی قمقمے "قاضی کوئی" میں بہار دکھا رہے ہیں۔ بے فکرے (ہپیز) لوگوں کے ریوڑ دونوں حصّوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہمہ نوع یکسانیت کے باوجود ذہن یہ محسوس کر رہا تھا اور بلا دلیل محسوس کر رہا تھا کہ یورپ یورپ ہے اور ایشیا ایشیا۔

۲۵ لاکھ کی آبادی کے شہر سے بس کا بسلامت نکل جانا اور کسی جگہ بھی بس کے ڈرائیور کا کسی دوسری بس کے ڈرائیور سے تُو تکار نہ ہونا نیک شگون ہے۔ استنبول کی پس ماندہ اور ناہموار گلیوں سے بھی بس گزری اور بڑی شاہراہوں سے بھی۔ دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی بجلی کی روشنی کے اشتہارات کا رواج ہے۔ مگر یُوں معلوم ہوتا ہے کہ بنکوں کے ناظمِ اشتہارات بڑے چوکس ہیں۔ ہر جگہ

بنکوں کے اشتہارات نظر آتے ہیں، جو راہ گیروں کو یاد دلا رہے ہیں کہ ہمارے سُود کی شرحیں بہت عمدہ اور ہماری مالی ساکھ نہایت مستحکم ہے۔ یہاں بھی راتوں کو قہوہ خانوں میں بیٹھ کر قہوہ پینا، نارجیلہ کے کش لگانا اور نرد کھیلنا محبوب مشغلہ ہے۔ رات کا ابتدائی حصّہ گزر چکا ہے۔ عام دکانیں بند ہو رہی ہیں مگر قہوہ خانوں کی آبادی عروج پر ہے۔

ایک مصری نوجوان کی رفاقت

بس کی سیٹیں ہوائی جہاز کی طرز پر بنائی گئی ہیں۔ ایئر کنڈیشنر نے بس کو اندر سے خوب گرم کر رکھا ہے۔ مصری نوجوان عبد القادر نے میری طرف پینترا بدلتے ہوئے ایک طویل گفتگو کی داغ بیل ڈال دی۔ مجھ سے پُوچھا کہ پاکستان کا کیا حال ہے؟ مَیں نے بولنے کی ڈیوٹی عبد القادر کی طرف منتقل کرتے ہوئے مصر کے داخلی حالات پر متعدد سوال کر دیئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ کسی مصری کو اگر اطمینان ہو جائے کہ اُس کا مخاطب جاسوس نہیں ہے تو وہ پھٹ پڑتا ہے اور مصر کے پوست کندہ حالات سے نقاب اُٹھا دینے میں تامّل نہیں کرتا۔ عبد القادر سے بھی مجھے یہی توقع تھی۔ صرف ایک بات کا خدشہ تھا۔ عبد القادر لبنان میں رہتا ہے، اور لبنان کے مسلمانوں پر مصر کے حکمران جمال عبد الناصر کا بڑا جادو چلتا ہے۔ بلکہ صرف لبنان کے مسلمان اور فلسطین کے باشندے ہی دو ایسے گروہ ہیں جو جمال عبد الناصر پر فریفتہ ہیں۔ اس فریفتگی کی اصل وجہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ بیروت میں ایک مرتبہ راقم الحروف ایک حجّام کی دکان پر بیٹھا تھا۔ جمال عبد الناصر کی "مقدس" شخصیت زیر بحث تھی۔ حجّام نے دورانِ گفتگو انکشاف کیا "جمال

عبدالناصر نے قرآن کریم کی ایک ایسی تفسیر لکھی ہے کہ آج تک کسی عالم نے ایسی تفسیر نہیں لکھی ہوگی۔" اس گفتگو میں میں نے بھی دخل دینا چاہا مگر لبنان کے دوستوں کی یہ بات مجھے یاد آگئی کہ "لبنان میں جمال عبدالناصر کی مخالفت بڑی مہنگی پڑتی ہے۔" عبدالقادر صاحب میرے خدشات کے برعکس نکلے۔ ۳۰ برس کا نوجوان، اقتصادیات کا ایم۔ اے، اُس کا چہرہ لال پیلا ہوگیا اور خالص مصری لہجے کے اندر مصر کے حالات بیان کرنے شروع کر دیئے۔ بتانے لگا کہ قاہرہ میں ہمارا مکان حکومت نے ضبط کر لیا۔ میرے بوڑھے والدین کو زدوکوب کیا گیا۔ نقدی اور زیورات تک چھین لیے گئے۔ میرے دوسرے رشتہ داروں اور جان پہچان والے لوگوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اب مصر کی اقتصادی حالت برباد ہو چکی ہے۔ ہمارے کئی رشتہ داروں کی خواہش ہے کہ وہ مصر سے نکل آئیں اور لبنان یا کسی اور مقام پر پناہ لے لیں مگر ایسی شدید ناکہ بندی ہے کہ کسی مصری کا مصر سے باہر نکلنا آسان نہیں ہے۔ جاسوسی کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہر وقت خوف و ہراس کی فضا طاری رہتی ہے۔ ہماری جائداد بلا دلیل و حجت ضبط کر لی گئی۔ ہمیں بے بس کر دیا گیا۔ کہیں واویلا بھی نہیں کر سکتے۔ عبدالقادر کو اپنی جائداد کی ضبطی کا شدید غم تھا۔ وہ یہ بات کرتے وقت شدید غیظ میں ڈوب رہا تھا۔ میں نے اُس سے اخوان المسلمون کے بارے میں دریافت کیا۔ اخوان کے بارے میں اُسے تفصیلی معلومات نہیں تھیں۔ اخوان پر ظلم و ستم کے واقعات کی اُس نے تصدیق کی اور کہا کہ یہ بھلے لوگ ہیں، اور ہر بھلا شخص مصر میں گردن زدنی ہے۔ مصر کے قرضوں، جنگ میں مصری فوجوں کی شکست اور مصری حکام کی منافقت

پر لگاتار اُس کی گفتگو جاری رہی۔ دو گھنٹے تک متواتر عبدالقادر صاحب دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔ مَیں درمیان میں مصریوں کے انداز میں بار بار "یا سلام" کے لفظ سے عبدالقادر کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا رہا کہ مَیں اُس کی گفتگو بڑے انہماک سے سُن رہا ہوں۔ گو مجھے نیند آ رہی تھی اور کبھی باہر کی دنیا کی طرف دھیان اُٹھ جاتا تھا مگر مصر کے اندرونی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے شوق میں کوئی کمی نہ آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ عبدالقادر نے مصر کے اندرونی حالات کی جو تصویر بیان کی وہ بڑی تکلیف دہ اور افسوس ناک تھی۔ یہ حالات ہمیں گاہے بگاہے معلوم ہوتے رہتے ہیں مگر ایک مصری جب اپنی زبان سے اپنی داستانِ غم بیان کرتا ہے تو دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ عبدالقادر اس قدر بھرا ہوا تھا کہ دو گھنٹے مسلسل گفتگو سے بھی اُس کی طبیعت سیر نہ ہوئی۔ آخر میں مجھ سے کہنے لگا کہ ایک انسان کی قدرتی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے کوئی ایسا ہمدم ملے جس کے سامنے وہ اپنا دکھ درد بیان کر کے اپنی طبیعت کو ہلکا کرے۔ مَیں لُبنان کے اندر بھی دل کی بات کھُل کر نہیں کر سکتا۔ چونکہ آپ پاکستانی ہیں اس لیے مجھے یہ کہنے کی ہمت ہو گئی۔"

استنبول سے انقرہ ۴۴۶ کیلو میٹر ہے یعنی تقریباً پونے تین سو میل۔ ایشیائی ترکی یعنی اناضول کی سطحِ مرتفع پر راتوں رات بس گزرتی رہی۔ راستے میں کہیں کہیں بس پٹرول لینے کے لیے رُک جاتی تھی۔ بس کے لیے جو رفتار مقرر کی گئی ہے اُسی رفتار پر چلتی رہی۔ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا جو جنون پاکستان اور سعودی عرب میں پایا جاتا ہے اُسے ترکی میں اُبھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اس معاملے میں پولیس کا محاسبہ بڑا سخت اور بے لوث ہوتا ہے۔ بس

کے مسافروں میں غیر ملکی زیادہ نظر آتے تھے اور تُرک کم۔ عبدالقادر نے بھی روزہ رکھا اور راقم الحروف نے بھی۔ بس کے پچھلے حصّے میں بعض عورتیں بھی سحری کھا پی رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بھی روزہ رکھا ہو۔

ترکی کے دارالحکومت میں


انقرہ جدید کا ایک منظر

انقرہ میں

بس دیر سے پہنچی۔ روشنی خوب پھیل چکی تھی۔ استنبول کے دوستوں نے نوری تحریک کے دو ذمہ دار آدمیوں سعید اُزدمیر اور حاجی ابراہیم قیا کو میری آمد کی اطلاع فون سے کر دی تھی۔ حاجی ابراہیم قیا اور اُن کے صاحب زادے علاؤ الدّین قیا بس کے اڈے پر آئے مگر بس لیٹ ہو جانے کی وجہ سے مایوس واپس چلے گئے۔ انقرہ کی سردی استنبول سے بھی زیادہ سخت اور پریشان کُن ہے۔ استنبول میں بوندا باندی جاری رہنے کی وجہ سے سردی میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے مگر انقرہ میں برف باری کے ساتھ ہوا بھی چل رہی ہے۔ عبدالقادر نے میری مدد کی۔ ٹیکسی میں سامان رکھا اور جامع حاجی بیرم خاں پہنچ گیا۔ مسجد کے باہر کھڑا تھا کہ ایک ضعیف العُمر تُرک نے اشارے سے دریافت کیا کہ مَیں کہاں جانا چاہتا ہوں۔ مَیں نے تُرکی انداز میں کہا: "نور مکتبہ"۔ اُس نے میرا بھاری بھَر کم سُوٹ کیس اُٹھا لیا۔ اور میرے واویلا کے باوجود بیس تیس قدم کے فاصلے پر واقع مکتبۂ نور میں لے گیا۔

مکتبۂ نور

حاجی ابراہیم قیا اسی نوعیت کی عربی بول لیتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں کے عربی مدارس کے لوگ۔ بہرحال ایک ترک اور ایک پاکستانی دونوں عربی زبان کو ذریعۂ اظہارِ خیال بنانے کا تجربہ کرتے رہے۔ قیا صاحب "طلبۂ نور" کے صفِ اوّل کے لوگوں میں سے ہیں۔ سعید اُزدمیر بھی اس جماعت کی ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ ۲۷ رمضان المبارک کو بدیع الزمان سعید نورسی مرحوم کی سالانہ برسی منائی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں سعید اُزدمیر صاحب ازمیر (سمرنا) گئے ہوئے ہیں۔ آج شام تک واپس آجائیں گے۔ یہ مکتبہ جس میں ہم بیٹھے ہیں اسلامی کتب خانہ ہے۔ ترکی کے اندر اسلام کے موضوع پر جو لٹریچر تیار ہو رہا ہے وہ اس مکتبے میں موجود ہے۔ مولانا مودودی کی تصنیفات، اخوان المسلمون کے رہنماؤں کی کتابیں، اور دیگر اسلامی لٹریچر بڑی تیزی کے ساتھ ترکی زبان میں منتقل ہو رہا ہے۔ عربی تفاسیر، صحاح ستّہ اور فقہ کی کتابوں کا ترجمہ بھی رومن ترکی میں ہو رہا ہے۔ صحیح بخاری، ہدایہ، قدوری، بلوغ المرام، ریاض الصالحین، اور تفسیر ابن کثیر کے تراجم مکتبۂ نور میں دیکھے۔ امام اور خطیب اور ہائر اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے کُھل جانے سے اسلامی کتابوں کی مانگ عوامی پیمانے پر پیدا ہو گئی ہے۔ اقتصاد، سیاست، اخلاق، قانون، تاریخ اور معاشرتی علوم وغیرہ ہر موضوع پر رومن ترکی میں اسلامی لٹریچر آنا شروع ہو گیا ہے۔ ابراہیم قیا صاحب نے مجھے خاص طور پر عربی سیکھنے کی کتابیں دکھائیں۔ ترک طالب علم اگر عربی زبان سیکھنا چاہے تو اسے گرامر اور انشاء دونوں پہلوؤں پر عبور حاصل کرنے کے لیے ترکی میں کئی سلسلے مل جاتے ہیں۔ میں نے قیا صاحب سے عربی

زبان کی مقبولیت کے باب میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ ترک نوجوانوں میں عربی زبان سیکھنے کا شوق جنوں کی حد تک پایا جاتا ہے۔ اور لڑکیوں کے اندر لڑکوں سے بھی زیادہ یہ شوق پیدا ہو رہا ہے۔ بگڑے ہوئے طبقے کو چھوڑ کر ہر مسلمان لڑکی کی یہ خواہش ہے کہ وہ قرآن حفظ کرے اور عربی زبان میں گفتگو کرے۔ مکتبۂ نور میں دو گھنٹے گزارے۔ ضیا صاحب سے بات چیت ہو رہی تھی کہ تین لڑکیاں آئیں، جنہوں نے سر سے لے کر پاؤں تک مکمل ساتر لباس پہن رکھا تھا، صرف چہرے ننگے تھے، ضیا صاحب سے متعدد اسلامی کتابیں انہوں نے خریدیں۔ انہیں امام غزالیؒ کی احیاء العلوم درکار تھی مگر ضیا صاحب کے پاس یہ کتاب نہ تھی۔ ضیا صاحب نے انہیں بتایا کہ احیاء العلوم کا ترکی ترجمہ زیر طبع ہے۔ مکتبۂ نور کی معلومات افزا فضا میں بیٹھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ قلب و نظر زمان و مکان کی حد بندیوں کو توڑ چکے ہیں۔ اسلامی تحریک کا ایک عالمگیر کارواں شرق تا غرب محوِ خرام ہے۔ اس کے ساز گو مختلف ہیں مگر نغمہ ایک ہی ہے۔ رنگ الگ الگ ہیں مگر خوشبو ایک ہی ہے۔ حُدی خوانوں کے لہجوں کی بوقلمونی اور حُدی کی یکسانیت نے اس کارواں کی وحدت کو کثرت اور کثرت کو وحدت میں سمو دیا ہے۔ مکتبے میں داخل ہونے والا ہر فرد مجھ سے سلام اور معانقہ کرتا اور پھر تعارف حاصل کرتا۔ کسی مہمان کو دیکھ کر لپک کر اُسے سلام کرنا اور جوشِ استقبال دکھانا عربوں اور ترکوں پر ختم ہے۔ افسوس ہے کہ پاکستان کے اکثر لوگ اِس اچھی عادت سے تہی دامن ہیں۔ میرا اپنا بارہا کا تجربہ ہے کہ ایک عرب مہمان آیا تو ایک آدھ کے سوا دوسرے حضرات نے اُس سے مصافحہ تک نہیں کیا۔ ابھی حال ہی کی بات

ہے کہ ایک عرب عالمِ دین لاہور آئے۔ ہمارے ایک دوست نے انہیں اپنے گھر میں جہاں اُن کا دفتر بھی ہے دعوت دی۔ جب ہم اُن کے گھر داخل ہوئے تو سوائے اُن کی اپنی ذات کے کسی نے اُٹھ کر اُن سے مصافحہ تک نہیں کیا۔ بعد میں عرب عالمِ دین نے مجھ سے پوچھا کہ کیا جو لوگ یہاں بیٹھے تھے وہ غیر تھے؟ یہ "غیریت" دانستہ نہیں اختیار کی جاتی بلکہ نادانستہ طور پر ایک عادت بن گئی ہے۔ کسی تُرکی گھرانے میں جب آپ جائیں گے تو تمام بڑے لوگ مصافحہ اور معانقہ کریں گے اور چھوٹے بچے ہاتھ کو بوسہ دیں گے۔

مدرسۂ یُوسفی

حاجی ابراہیم قیا بڑے کامیاب طریقے سے اپنا مکتبہ چلا رہے ہیں۔ ان کا مکتبہ "طلبۂ نور" کا مرکز بھی ہے اور نشر و اشاعت کا ادارہ بھی۔ مگر اس کاروبار کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ حاجی ابراہیم قیا صاحب آج سے صرف چار روز پہلے جیل سے رہا ہو کے آتے ہیں۔ مَیں نے حیرت میں ڈوب کر اُن سے پُوچھا کہ کس جُرم میں آپ جیل میں ڈال دیئے گئے تھے؟ میرا یہ سوال مواساۃ کے جذبے کے تحت تھا۔ ابراہیم قیا صاحب مسکرا کر بولے: "مدرسۂ یوسفیہ کی سند حاصل کرنے کا شوق جیل میں لے گیا تھا۔" نوری تحریک کے لوگ جیل کو "مدرسہ یوسف" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مدرسہ میں داخل ہونا ان کے نزدیک پریشانی کا باعث نہیں ہے بلکہ فخر و اعزاز کا مقام ہے۔ وہ اس مدرسہ میں مسکراتے ہوئے جاتے ہیں اور مسکراتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ حاجی ابراہیم قیا صاحب جن کی عمر ۵۰ سال سے کم نہ ہوگی، بدیع الزماں نورسی مرحوم کی تصنیفات جنہیں "رسائلِ نور" کہا جاتا ہے تقسیم کرنے

کے جُرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ رسائلِ نور کی اشاعت و تقسیم جُرم ہے۔ یہ رسائل نور بدیع الزماں نورسی مرحوم کی تقریروں، خطبوں اور درسوں پر مشتمل ہیں۔ ۱۹۵۰ء سے پہلے تک ان رسائل کی طباعت جرم تھی۔ طلبۂ نور راتوں کو بیٹھ کر ہاتھوں سے لکھتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ پھیلاتے تھے۔ عدنان مندریس مرحوم کے دورِ وزارت میں ان کی طباعت پر سے پابندی اٹھالی گئی جس کے نتیجے میں ان کی بکثرت اشاعت ہوئی۔ اب پھر ان کی کھُلم کھُلا اشاعت ممنوع ہے۔ حکومت اگر آزادیٔ فکر کے اصول کے تحت ان سے چشم پوشی بھی کر لیتی ہے تو ترکی کا سوشلسٹ، لادین اور ملحد عنصر رواداری سے کام نہیں لیتا۔ سیکولر دستور کا سہارا لے کر ان کے خلاف عدالتوں میں مقدمے دائر کر دیتا ہے اور رسائل تقسیم کرنے والوں اور چھاپنے والوں کو مختلف سزائیں دلواتا ہے۔ مگر مَیں نے دیکھا کہ ہر شخص کے گھر میں یہ رسائل موجود ہیں اور ان کا اجتماعی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بدیع الزماں نورسی مرحوم نے ان رسائل میں جو دعوت بیان کی ہے اُس کا خلاصہ ہے اسلامی معاشرے کا احیاء، اسلامی قوانین کا نفاذ، اِسلامی خلافت کی بحالی اور اتحادِ اسلامی کا قیام۔ اسی دعوت کو ترکی کے ملاحدہ "بغاوت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

برلن ہوٹل میں قیام

مکتبۂ نور سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر برلن ہوٹل میں مجھے ٹھیرا دیا گیا۔ اچھا صاف ستھرا ہوٹل ہے۔ اس کا مالک بھی کوئی مسلمان ہے۔ راستے میں بازار ہے۔ اُونچی دکانیں بھی موجود ہیں اور پھیری والے بھی سڑک کے دونوں طرف چھوٹا چھوٹا سامان لگائے کھڑے ہیں۔ البتہ آوازیں لگانے کا وہ ہنگامہ یہاں برپا

نہیں ہے جو ہمارے ہاں ہے۔ کچھ لڑکے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے رومال لیے پھرتے ہیں جنہیں عورتیں مسجد میں جاتے وقت سر پر باندھ لیتی ہیں۔ یہاں امارت و غربت کا امتیاز استنبول کی نسبت زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ اسلام اور الحاد کا مقابلہ بھی یہاں زیادہ تازہ دم اور تند و تیز ہے۔ آج ۲۷ رمضان المبارک ہے۔ اس لیے ریڈیو نے بھی اپنے گانوں اور دھنوں کا چولا بدل لیا ہے۔ رات بھر ریڈیو سے قرآن کریم کی تلاوت اور نعت خوانی ہوتی رہی اور دن کے پروگرام بھی مِلے جُلے نعتیہ کورسوں تک محدود رہے۔ یہاں ریڈیو سرکاری ادارہ نہیں ہے بلکہ پبلک ادارہ ہے اور تجارتی بنیادوں پر قائم ہے۔ رات بھر سفر کی تھکاوٹ اور روزے کے ضعف کی وجہ سے ظہر تک ہوٹل میں آرام کیا۔

انقرہ کی مشہور ترین مسجد

ظہر کی نماز جامع حاجی بیرم خاں میں ادا کی۔ مکتبۂ نور سے چند قدم دور یہ انقرہ کی قدیم ترین اور مشہور ترین مسجد ہے۔ حاجی بیرم خاں اس دیار کے مشہور و معروف ولی تھے۔ ۱۴۲۷ء میں اپنی وفات سے دو سال قبل انہوں نے اِس مسجد کی تعمیر کروائی اور بیرمی سِلسلہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے قریب ہی آگسٹس کا معبد ہے۔ مسجد کے بیرونی صحن میں جب دروازے سے داخل ہوں تو دائیں ہاتھ ایک حجرہ نظر آئے گا اور عورتوں کی ایک جماعت بھی حُجرے کے اندر جاتی یا باہر نکلتی مِلے گی۔ یہ حاجی بیرم کی قبر کی زیارت کرنے کے لیے آئی ہیں۔ نمازیوں سے مسجد بھر رہی تھی۔ ابراہیم قیا صاحب مجھے جگہ نہ مِلنے کی وجہ سے امام صاحب کے کمرے میں لے گئے اور ہم نے اس کمرے کے اندر نماز پڑھی۔ مسجد کے بوڑھے امام

الحاج ذکائی صاحب ۲۱ سال تک مدینہ منورہ میں رہ چکے ہیں۔ ان کی اولاد اب بھی مدینہ منورہ میں ہے۔ جب مَیں نے انہیں "فضیلۃ الشیخ" کے لقب سے پکارا تو فوراً کہنے لگے "الفضل عندکم فی پاکستان" (فضیلت تمہارے پاکستان میں ہے) انہوں نے بتایا کہ میں اصلاً انقرہ کا باشندہ ہوں۔ عمر کا کثیر حصّہ مدینہ منورہ میں گزارنے کے بعد صرف اس لیے انقرہ واپس آگیا ہوں کہ یہاں دعوت کی اشاعت اور تبلیغ دین کی شدید ضرورت ہے۔ مولانا مودودی مدظلہ العالی کی تمام عربی تصنیفات پڑھ چکے ہیں۔ ان کے بچے مولانا محترم کی ہر نئی کتاب مدینہ منورہ سے بھجواتے رہتے ہیں۔ ترکی ترجموں کی نسبت عربی ترجموں کو رغبت سے پڑھتے ہیں۔

ترک "مرتد" کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے

نماز پڑھ کر امام صاحب بھی باہر نکلے اور ہم بھی۔ مسجد کے بیرونی صحن کے اندر جس کے اردگرد وسیع چار دیواری کھینچ رکھی ہے متعدد جنازے رکھے ہوئے تھے۔ ہر جنازے کے ساتھ پھولوں کا ایک گول تختہ کھڑا کیا ہوا تھا اور دیوار سے باہر کثیر تعداد میں لوگ کھڑے تھے۔ چہرے مہرے اور لباس کی وضع سے اُونچے گھرانوں کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ مَیں نے قیا صاحب سے دریافت کیا کہ یہ لوگ یہاں کیوں کھڑے رہے، نماز میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ قیا صاحب نے کہا کہ "یہ مرتد لوگ ہیں۔ مسجد میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے۔ اِن جنازوں کے ہمراہ یہاں آئے ہیں۔ اب انتظار میں ہیں کہ امام صاحب ان کے جنازوں کی نماز پڑھ دیں۔ اور یہ جنازے بخشوا کر اُٹھالیں۔" چنانچہ وہی بات ہوئی۔ مسجد

کے اندر سے نکلنے والے نمازیوں نے جنازے کی نماز پڑھی اور یہ لوگ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے۔ اور جب نماز پڑھی جا چکی تو یہ اپنا اپنا جنازہ اُٹھا کر چلتے بنے۔ چونکہ یہ واقعہ بالکل نرالا تھا۔ میں بار بار ابراہیم فیا صاحب سے پوچھتا رہا کہ جب یہ لوگ خود نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے تو اپنے جنازے کو نماز کے بغیر دفن کیوں نہیں کرتے؟ فیا صاحب ان لوگوں کا ذکر کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ وہ یہی کہتے رہے کہ یہ مرتد ہیں۔ خود نماز کے قائل نہیں ہیں۔ مگر اپنے مُردوں کو نماز کے بغیر دفن بھی نہیں کرتے۔ یہ مسلمانوں کی رواداری ہے کہ وہ ان کی نمازہ پڑھ دیتے ہیں[1]۔"

---

[1] حال ہی میں ترکی اخبارات میں ایسے ہی ایک جنازے کی ہنگامہ خیز خبر شائع ہوئی ہے۔ استنبول کا روزنامہ اتحاد بابت ۶ مئی ۱۹۶۹ء جنرل عمران اوکتم کے جنازے پر برپا ہونے والے ہنگامے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ طبی امداد کے باوجود جنرل عمران اوکتم جمعرات کو انتقال کر گیا۔ انتقال کے دو روز بعد (یعنی ہفتہ کے روز) اس کی میت کو مسجد حاجی بیرم خان میں نماز جنازہ کے لیے لایا گیا۔ وہاں کے امام صاحب نے اوکتم کے مسلمان نہ ہونے پر بحث کرتے ہوئے جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ عام مسلمانوں نے امام صاحب کی تصدیق کی۔ عمران اوکتم کے دوست عصمت انونو صاحب بھی موجود تھے۔ حاضرین ان کے خلاف بھی بھڑک اُٹھے۔ اور اگر ایک فوجی جرنیل جو اس موقع پر موجود تھے محترم عصمت انونو صاحب کا دفاع نہ کرتے اور حملہ آوروں کو پستول نہ دکھاتے تو انونو صاحب کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اوکتم کے وارث میت کو وہاں سے اُٹھا کر یا تیپے مسجد میں لے گئے۔ وہاں کے امام صاحب نے بھی عوام کی تائید میں نماز پڑھنے سے (باقی صفحہ ۱۶۶ پر)

ظہر اور مغرب تک کا درمیانی وقفہ مکتبۂ نور ہیں گزرا۔ مکتبہ میں کتابیں بھی فروخت ہوتی رہیں اور دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ سعید بدیع الزماں نورسی کے تلامذہ اور معتقدین بکثرت آتے جاتے رہے۔ دو باتیں اُن میں مشترک نظر آئیں۔ ایک یہ کہ موجودہ حکومت پر بعض اصولی اور جزوی تنقیدوں کے باوجود وہ اس حکومت کو "غنیمت" سمجھتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ترکی کے مستقبل کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہیں کرتے یا عمداً اُس کا اظہار نہیں کرتے۔ مَیں نے ہر ذمّہ دار آدمی سے ترکی کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا مگر وہ آئندہ کے بارے میں قیاس آرائی کے بجائے حال میں محنت، کوشش، جانفشانی اور قربانی پر زور دیتا رہا۔ مکتبہ میں اچھے اچھے لوگ آئے۔ انقرہ کی دونوں یونیورسٹیوں (انقرہ

(بقیہ حاشیہ صد ۱۶۴ سے) معذرت کردی اور کہا کہ مسلم عوام کسی بے دین، منکرِ خدا اور مرتد کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے۔ دریں اثنا ری پبلکن پارٹی کے لوگ سرکاری اسپتال کے ایک امام صاحب کو لے آئے، لیکن لوگوں کے ہجوم میں وہ بھی غائب ہو گئے۔ بعد ازاں ایک وکیل صاحب الٰہیات فیکلٹی کے ایک ملازم کو یہ مہم انجام دینے کے لیے پکڑ لائے۔ مگر لوگوں نے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور آخرکار عمران اوکتم کو بغیر جنازہ پڑھے دفن کر دیا۔ ترک مسلمانوں نے عمران اوکتم کے بارے میں اس قدر شدید موقف اس وجہ سے اختیار کیا ہے کہ اوکتم نے جو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس تھا پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد نئے عدالتی سال کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اللہ کا تصوّر انسان کا اپنا گھڑا ہوا ہے"۔ اس فقرے پر ترکی کے مسلمانوں نے اُسی وقت سخت احتجاج کیا تھا، اور اسی بنا پر مسلمان اسے مرتد سمجھتے تھے۔

یونیورسٹی اور مڈل ایسٹ یونیورسٹی) کے اساتذہ اور طلبہ بھی اُن میں شامل تھے۔ ہر شخص پر یہ احساس طاری تھا کہ جیسے وہ ہنگامی حالات میں گھرا ہوا ہو اور اپنا رول ادا کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔

نورسی مرحوم کی برسی

سعید اُزدمیر بھی اِزمیر (سمرنا) سے آ گئے۔ تین دن اِزمیر میں رہے ہیں۔ سعید نورسی کی برسی کی تقریبات میں حصّہ لیتے رہے ہیں۔ فصیح عربی میں اظہار مافی الضمیر کی قدرت رکھتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ حاصل ہے۔ اپنے دوسرے نوری بھائیوں کی طرح سعید نورسی مرحوم کے رسائل کے اکثر حصّے انہیں زبانی یاد ہیں۔ نورسیؒ کی برسی کے بارے میں میرے سوالات کا جواب دیتے ہوتے بتانے لگے:

"دس ہزار کی تعداد میں تُرکی کے مختلف حصّوں سے "نورطلبہ" جمع ہوئے۔ اِزمیر کی مساجد میں انھوں نے ڈیرے لگا لیے۔ "سالانہ برسی" کے طفیل سال میں ایک مرتبہ یہ رُوح پرور اجتماع منعقد ہو جاتا ہے۔ مردوں کے علاوہ خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔ خواتین کا انتظام بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے۔ تین روز تک اِزمیر قرآن کی تلاوت، مجالسِ ذکر، حلقہ ہائے مذاکرہ اور اِسلامی تقاریر سے گونجتا رہا۔ عام اجتماعات بھی ہوئے اور خاص بھی۔ "آپ بیتی" کا جائزہ بھی لیا گیا اور "جگ بیتی" کا تذکرہ بھی ہوا۔ دن کو عام طور پر تقاریر کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسلام کے مختلف گوشے واضح کیے جاتے۔ سعید نورسی

مرحوم کی دعوت کا خلاصہ مختلف زاویوں سے پیش کیا جاتا۔ اور راتیں ذکر و فکر اور تعلق باللہ کی استواری میں گزرتی ہیں۔ خواتین کے اندر بڑی شد و مد سے کام ہو رہا ہے۔ شُعلہ یوکسل شنلر نامی ایک خاتون کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شعلہ بیانی سے نواز رکھا ہے۔ بڑی مؤثر اور دلنشیں تقریر کرتی ہیں۔ عورتوں کو اسلامی آداب و حقوق سے آگاہ کرتی ہیں۔ قرآن و حدیث کا بڑے پُرکشش پیرائے میں درس دیتی ہیں۔ رفقاء کے گھروں میں اُن کی تقریروں اور درسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہزارہا کی تعداد میں نوجوان لڑکیاں اُن کی دعوت و تبلیغ سے اصلاح پذیر ہو رہی ہیں[1]۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ قصبات اور دیہات کی تُرک عورتیں انقرہ اور

---

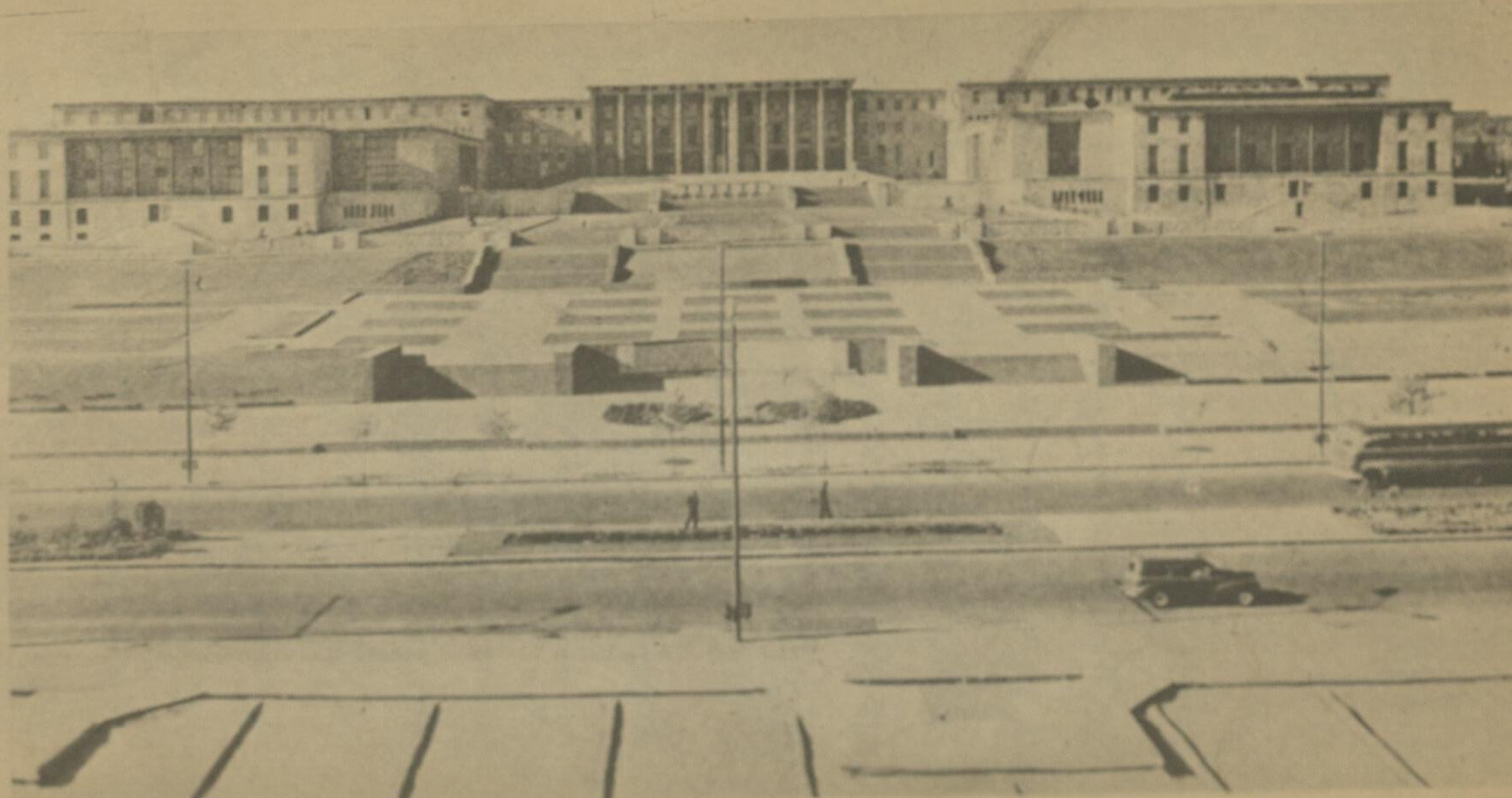
[1] بیروت کے اسلامی جریدہ الشہاب کے یکم جون ۱۹۶۹ء کے شمارے میں "ترکی میں مسلمان عورت کی سرگرمی" کے عنوان سے یہ خبر چھپی ہے کہ شعلہ نے تُرکی کے مغربی علاقے میں متعدد مقامات پر تقریریں کی ہیں۔ ان کی آخری تقریر افیون شہر میں ہوئی۔ شہر کا ہال اپنی وسعت کے باوجود لڑکیوں سے پُوری طرح بھر گیا تھا۔ بلکہ شہر کی ۶۰ مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکروں کو تاروں کے ذریعہ ہال کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ اور یُوں شعلہ کی تقریر سے ہزارہا افراد نے استفادہ کیا۔ موصوفہ نے اپنی تقریر میں اسلامی قانون اور اِسلامی پردے پر زور دیا۔ چنانچہ اب اِسلامی پردہ کی بحالی کے لیے تُرکی میں بڑی مضبوط تحریک چل رہی ہے اور لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد نے اپنے سروں کو ڈھانکنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ کمال اتاترک اور ان کے جانشین پردے کے خاتمہ کے لیے بے پناہ کوششیں صرف کرتے رہے ہیں۔

استنبول کی تعلیم یافتہ خواتین کو گھروں میں گھسنے نہ دیتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی کے دیہات میں مغربی تہذیب اور کمالی اصلاحات کا نام ونشان نہیں ملتا۔ ہمیں بھی شروع شروع میں دیہی عورتوں تک اپنی بات پہنچانے میں بڑی دشواری کا سامنا ہوا۔ مگر" نور طالبات" کی ایک ٹیم نے اس مہم کو سَر کر لیا۔ دیہی عورتوں کو یہ اطمینان ہو گیا کہ "نور طالبات" اُن جراثیم سے پاک ہیں جو اُن کی روایات کے لیے مُضر ہیں۔ اب قصبوں اور دیہاتوں کی طرف سے اس قدر دعوت نامے آرہے ہیں کہ" نور طالبات" کے لیے اُن کو نبھانا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر نور طالبات کو بھی اللہ تعالیٰ نے بڑی ہمت دے رکھی ہے اور وہ انتھک طریقے سے معرکۂ کارزار میں سرگرم عمل ہیں۔

اِز میر میں سعید بدیع الزمان نورسی مرحوم کا انتقال ہوا۔ چونکہ انتقال کے وقت مرحوم کی نعش کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اس لیے عام لوگوں کو اُن کی قبر معلوم نہیں ہے۔ نورسی مرحوم ہمیشہ یہ دُعا کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد انہیں کسی فتنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ انہیں خدشہ تھا کہ عقیدت مند لوگ اُن کی اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنے کے بجائے کہیں اُن کی قبر ہی کو اوہام پرستی کا اڈہ نہ بنالیں۔"

نورسی مرحوم کی ایک خاص وصیّت

سعید اُزدمیر نے بتایا کہ نورسی مرحوم کا جب انتقال ہوا تو وہ اُس وقت



ترکی پارلیمنٹ ۔ انقرہ

مرحوم کے پاس تھے اور اُن کی آخری وصیتیں محفوظ کر رہے تھے۔ یہ تمام تر وصیتیں اسلامی تحریک کے کام سے متعلق ہیں۔ اُنہی وصیتوں میں سے اُن کی ایک وصیت یہ بھی تھی کہ:

"میرے بعد فکری رہنمائی حاصل کرنے کے لیے تمہیں پاکستان کے اسلامی رہنما مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ میں نے تمہارے ایمان اور عقیدہ کو بچانے کی کوشش میں عمر صرف کی ہے، مولانا مودودی سے تمہیں دین و شریعت کی تفصیلات اور عہدِ حاضر میں اسلامی نظام کے نفاذ کا طریقہ معلوم ہو گا۔"

سعید اُزدمیر کے علاوہ نوری تحریک کے دیگر ذمہ دار حضرات نے بھی استنبول، انقرہ اور قونیہ میں میرے سامنے اس وصیت کا ذکر کیا ہے۔ نورسی مرحوم کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کے اندر اس وقت اسلامی تحریک جہاں جہاں کام کر رہی ہے اُس کے افراد کو ایک دوسرے کے تجربات اور نتائجِ فکر سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ اسی وصیت کا اثر ہے کہ طلبائے نور میں مولانا مودودی کی تصنیفات کثرت سے پھیل رہی ہیں اور ان کے دینی شعور میں اضافے کا موجب ہو رہی ہیں۔

انقرہ کے تاریخی نشیب و فراز

انقرہ کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب مصطفیٰ کمال نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا تھا تو اس کی مجموعی آبادی ۲۰ ہزار سے متجاوز نہ

تھی۔ مگر اب انقرہ دس لاکھ نفوس کی جولانگاہ بن چکا ہے۔ اور ابھی تعمیر و توسیع کا ہنگامہ شب و روز بپا ہے۔ اس کا قدیم نام انگورہ ہے۔ اس کے تاریخی نشیب و فراز کا مجمل خاکہ یہ ہے کہ ۱۰۷۳ء میں اس چھوٹے سے مقام پر پہلی مرتبہ ترکوں نے قبضہ کیا۔ ۱۱۰۱ء میں یہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا اور رومی عیسائیوں کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ ۱۱۲۷ء میں سلجوقی ترکوں نے اسے صلیب پرستوں سے آزاد کروا لیا۔ ۱۳۵۴ء میں یہ عثمانی قلمرو کا ایک حصّہ بن گیا۔ ۱۴۰۲ء میں عثمانی فرمانروا سلطان بایزید یلدرم اور مُغل فاتح تیمور کے درمیان یہاں وہ مشہور جنگ ہوئی جو تاریخ میں جنگِ انگورہ کے نام سے مشہور ہے۔ یونانیوں کے خلاف مصطفیٰ کمال پاشا نے آزادی کی جو جنگیں لڑی ہیں اُن میں مصطفیٰ کمال نے انقرہ ہی کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ اور جب مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں نے ترکی میں عثمانی خلافت کا خاتمہ کیا اور جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا تو انقرہ ہی کو جمہوریہ ترکیہ کا دارالحکومت قرار دے دیا۔ اس طرح ۱۳ ؍ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے استنبول کی پونے پانچ سو سالہ اسلامی تاریخ عجائب گھر میں رکھ دی گئی اور انقرہ میں ایک نئے دارالحکومت کی کُھدائی شروع ہو گئی۔ یہ ۴۶ سالہ دارالحکومت ابھی اپنے دورِ شباب میں ہے۔ ترکوں کو استنبول سے جو وابستگی تھی اُس کی وجہ سے شروع میں تو ان پر استنبول کے بجائے انقرہ کا "مرکزِ عقیدت" بن جانا بجلی بن کر گرا مگر اب وہ کشاں کشاں اِس تحویل پر راضی ہوتے جا رہے ہیں اور ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچنے والوں پر اب اس شہر کی بعض خوبیاں بھی نمایاں ہو رہی ہیں۔ مثلاً یہ عثمانیوں کے پہلے دارالحکومت بروصہ سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ عثمانیوں سے

پہلے سلجوقیوں کا دارالحکومت قونیہ بھی اس سے چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ مگر حاجی ابراہیم قیا کے الفاظ میں یہ تمام تاویلات ہیں جو ری پبلکن پارٹی کے حامیوں کی طرف سے گاہے بگاہے پھیلائی جاتی ہیں اور ان تاویلوں کی اب ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ مستقبل میں اگر ترکی میں اسلامی جمہوریہ بھی قائم ہو تو اس کا مرکز انقرہ ہی ہوگا۔ جس شہر نے الحاد اور لادینیت کا سرکاری طور پر اعلان کیا تھا وہی شہر انشاء اللہ اب خدا کی حاکمیتِ اعلیٰ کی منادی کرے گا۔ یہاں کے صنم خانوں کے ملبے پر ایوانِ توحید تعمیر ہوگا۔ انقرہ کو بلاشبہ زود یا بدیر استنبول سے معافی مانگنی ہوگی اور اپنی نافرمانی کا عذر پیش کرنا ہوگا، مگر انقرہ اب بوڑھے استنبول کی خاطر اپنی جوانی سے دست بردار نہیں ہوگا بلکہ اُس کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرے گا۔

کشت زارِ دعوت

نمازِ عشاء اور تراویح کے لیے سعید اُزدمیر صاحب ہمیں انقرہ کے ایک قدیم محلّے میں لے گئے۔ سعید اُزدمیر اس محلّے کی جامع مسجد میں روزانہ درسِ قرآن وحدیث دیتے ہیں۔ رات کا وقت تھا۔ ہماری موٹر کبھی اُوپر چڑھتی اور کبھی نیچے اُترتی۔ پُورا محلّہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچے پکے مکانات، ناپختہ سڑکیں۔ گویا ہم کسی دیہی آبادی میں اُتر گئے ہیں۔ کجا انقرہ کی رعنائی اور کجا اس محلّہ کی بیمارگی۔ سعید اُزدمیر نے بتایا کہ اس محلّے کی ظاہری پژمردگی اور اُداسی کو نہ دیکھیں۔ اس کے اندر بڑے قیمتی جوہر بستے ہیں۔ ہم اس محلّے میں مدّتوں سے خالص اسلامی دعوت کا کام کر رہے ہیں۔ یہاں کے بوڑھے اور بچّے اور مرد اور عورتیں سبھی ہماری دعوت سے آشنا ہیں۔

الیکشن کے زمانے میں اِس محلّے نے کئی سرفرازوں کو سرنگوں کر دیا۔ ۱۹۶۰ء میں محترم عصمت انونو نے الیکشن میں اپنی پارٹی کی ناکامی پر کہا تھا کہ مجھے نُور طلبہ نے برباد کیا ہے۔ بے شک اس محلّہ کی اکثریت غریب اور مفلس ہے یا متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ہے۔ مگر اسلامی جوش و جذبہ اور غیرت وحیا اور باہمی تعاون و تکافُل اس محلّے کی نمایاں خوبی ہے۔ ہم نے انقرہ میں دعوت و تبلیغ کے لیے جو مختلف حلقے بنا رکھے ہیں یہ اُن میں سے ایک ہے۔ اِس محلّے کا باشندہ اپنی جان دے سکتا ہے مگر اپنا ایمان نہیں بیچ سکتا۔ سعید اُزدمیر اس محلّے کے ذکر میں ایسے رطب اللسان ہوئے جیسے کوئی کاشت کار اپنی لہلہاتی کھیتی کو دیکھ کر پھولا نہ سما رہا ہو۔ قاآنی کے الفاظ میں:

فراز خاک و خشتها دمیده سبز کشتها
چه کشتها؟ بهشتها نه ده نه صد هزارها

گاڑی میں اُزدمیر اور ابراہیم قیا صاحب کے علاوہ اور بھی تین ساتھی تھے جو راستے میں سوار ہو گئے تھے۔ اس محلّے کا تعارف کرانے کے بعد یہ تمام حضرات جن میں خود سعید اُزدمیر بھی تھے جوش میں آ کر اپنا مخصوص نوری ترانہ بآواز بلند پڑھنے لگے۔ چند مفردات کے سوا میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ مگر پڑھنے والوں کی لَے اور جہاد، اسلام، خلافت اور نور و عرفان اور اسی نوعیت کے دوسرے الفاظ کا بار بار اعادہ بڑا وجد آور تھا۔ تُرک سُریلی آواز اور نغمگی کے رسیا ہیں۔ ہمارے نوری بھائیوں نے بھی اپنی دعوت میں اِن مؤثر ہتھیاروں کو شامل کر رکھا ہے۔

محلے کی مسجد

نماز سے پہلے مجھے تقریر کرنے کے لیے کہا گیا۔ مسجد نمازیوں سے اس قدر بھر رہی تھی کہ تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بوڑھوں کی اکثریت باریش۔ نوجوانوں میں بھی خاصی تعداد کے چہرے پر ڈاڑھی۔ پندرہ منٹ تک میں نے تقریر کی۔ سعید اُزدمیر میرے مترجم تھے۔ پہلے میں نے اپنے ترک بھائیوں کو پاکستان کے حالات اور مذہبی اور تحریکی سرگرمیاں بتائیں اور انہیں یقین دلایا کہ پاکستان میں ان شاء اللہ اِسلامی نظام قائم ہو گا۔ پھر مختصراً عرب قومیت، طورانی قومیت اور اسی طرح کے دوسرے جاہلی نعروں کی حقیقت بتائی اور یہ واضح کیا کہ عربوں کو اسرائیل کے ہاتھوں جو مصیبتیں پہنچ رہی ہیں یہ دراصل اللہ کی طرف سے انہیں اس بات کی سزا دی جا رہی ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد عربوں نے ترکوں کے مقابلے میں برطانوی سامراج کا ساتھ دیا تھا۔ اور یہ کہ اگر اب بھی عرب مسلمانوں کو نظر انداز کر کے اور اسلام سے بے نیاز ہو کر اسلام دشمن طاقتوں کے آلۂ کار بن کر اسرائیل کا مقابلہ کرنا چاہیں گے تو ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اسرائیل کا خاتمہ صرف جہاد اسلامی، اور اسلامی اتحاد اور رجوع الی اللہ پر موقوف ہے۔ آخر میں ترک حاضرین کو ان کی اسلام پسندی کی داد دی اور جس مختصر وقفے کے اندر ترک مسلمان نے اپنے ہاں کے حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا ہے اُس پر انہیں بتایا کہ مشرق و مغرب کے تمام مسلمان اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نمازِ تراویح کے بعد اس مسجد میں موئے مبارک کی زیارت کرائی گئی۔

طلبۂ نور کے ایک اجتماع میں

مسجد سے نکل کر ہم اُسی محلّے میں ایک رفیق کے مکان پر چلے گئے۔ یہاں نُور طلبہ کا اجتماع تھا۔ مختصر سے تعارف کے بعد سعید اُزدمیر نے اجتماع کی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اجتماع کی شکل یہ تھی کہ اکثر حاضرین کے ہاتھ میں بدیع الزماں نورسی مرحوم کی کتاب لمعات تھی۔ سعید اُزدمیر نے اس کتاب کے بعض حصّوں کو پڑھ کر سُنایا اور ان کی اپنی زبان میں تشریح کی۔ بدیع الزمان نورسیؒ کی جتنی تصنیفات ہیں وہ باقاعدہ کتابی شکل میں مدوّن نہیں کی گئیں بلکہ مرحوم کے درُوس اور خطبوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اور اُن میں شریعت کے تفصیلی احکام پر بحث کے بجائے اساساتِ دین اور اِسلامی عقائد و اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ سعید اُزدمیر جب فارغ ہوئے تو ایک دوسرے "نوری" اُٹھے اور انہوں نے زیرِ درس مباحث کو بدیع الزماں مرحوم کی بعض دوسری تشریحات سے مزید اُجاگر کیا۔ الغرض اکثر احباب نے متعلقہ موضوع پر اپنے اپنے مطالعہ کی مدد سے روشنی ڈالی۔ گو لوگوں نے ہاتھ میں ایک ایک کتاب اٹھا رکھی تھی مگر میں متحیّر تھا کہ ہر شخص نورسی مرحوم کے بیانات و افادات کو ازبر کیے ہوتے ہے اور صفحات کے صفحات زبانی سُنا رہا ہے۔ سعید اُزدمیر نے مجھے بتایا کہ بدیع الزماں نورسی مرحوم کے تمام چھوٹے بڑے رسائل کی مجموعی تعداد ۱۳۰ ہے۔ ان میں سے اہم رسالے ہم سب نے یاد کر رکھے ہیں۔ بلکہ بکثرت مطالعہ کی وجہ سے یاد ہو گئے ہیں۔ نُور طلبہ کو (سفید ریش بوڑھے بھی اپنے آپ کو "نورطالب" کہتے ہیں)

بدیع الزمان نورسی سے جو محبّت اور عقیدت ہے اگر میں اُسے عشق سے تعبیر کروں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اِس عظیم شخصیت نے نہ صرف اپنے شاگردوں اور پیروکاروں کے

عقائد و افکار کی اصلاح کی ہے بلکہ ان کی سیرت و کردار پر بھی اس قدر اثر ڈالا ہے کہ لادینیت اور الحاد اور فسق و فجور کے بحرِ متلاطم کے اندر رہ کر بھی وہ تر دامن نہیں ہوئے۔ اجتماع میں کچھ اور امور پر بھی اظہارِ خیال ہوتا رہا جو میری سمجھ سے باہر تھے۔ جب لوگ اپنے معمولات سے فارغ ہوئے تو اب میری باری آئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں جماعت اسلامی کی دعوت اور طریقِ کار پر مفصل تقریر کروں۔ تُرکی قہوہ کی ایک فنجان نوش کرنے کے بعد میں نے داستان سرائی شروع کر دی اور دو گھنٹہ تک اس موضوع کے مختلف گوشوں پر کلام کرتا رہا۔ جماعت کی تشکیل سے پہلے مولانا مودودی مدظلہٗ العالی کس طرح اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کرتے رہے۔ جماعت کی تشکیل کب اور کن حالات میں ہوئی۔ جماعت کا نظم اور دستور کیا ہے۔ جماعت اپنی دعوت کے چاروں اجزاء کو کس توازن اور اعتدال اور کن ذرائع و وسائل کیساتھ بروئے کار لا رہی ہے، یعنی تطہیر افکار و تعمیر افکار۔ صالح افراد کی تلاش اور تنظیم و تربیت۔ اصلاح معاشرہ۔ اور نظامِ حکومت کی اصلاح۔ اس ضمن میں مَیں نے جماعت کی وہ تمام اسکیمیں اور سرگرمیاں اور کوششیں ملخصًا بیان کر دیں جو جماعت انفرادی تربیت اور نظمِ جماعت کی حفاظت اور دیکھ بھال سے لے کر سیاست، تعلیم، صحافت، خدمتِ خلق اور دعوت و اشاعت کے باب میں سرانجام دے رہی ہے۔ اخوانِ نور نے یہ باتیں بڑی دلچسپی سے سُنیں۔ بلکہ دورانِ تقریر جہاں کہیں انہیں وضاحت درکار ہوتی مجھے روک کر وضاحت طلب کرتے۔ آخر میں جب مَیں اپنے طور پر یہ تقریر ختم کر چکا تو مجھ سے مطالبہ کیا گیا کہ مَیں جماعت کے بانی مولانا مودودی کے حالاتِ زندگی بھی تفصیل سے بیان

کروں۔ میں نے مختصراً مولانا محترم کی سوانح حیات بیان کی اور عرض کر دیا کہ اگر کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہو تو پوچھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سوالات و جوابات کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا جسے سعید اُزدمیر نے آخر کار حکماً بند کر دیا۔

سعید اُزدمیر نے اپنے اختتامی کلمات میں حاضرین کے سامنے یہ اشارہ کر دیا کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان کی جو دعوت ہمیں بتائی گئی ہے یہ عین وہی چیز ہے جسے بدیع الزمان نورسی مرحوم زندگی بھر پیش کرتے رہے ہیں اور جسے رُوبکار لانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ الفاظ اور ترتیب کا فرق ہو سکتا ہے، رُوح اور جوہر اور مدّعا یکساں ہے۔ طریقِ کار میں بھی قدرے تفاوت ہے مگر وہ بھی مقامی حالات کی وجہ سے ہے۔

طلبۂ نوُر سے میری جتنی بھی ملاقاتیں اور گفتگوئیں ہوتی ہیں اُن سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان لوگوں کے اندر ایمان اور اسلام کی محبت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ دین کی راہ میں ہر طرح کی قربانی کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ جذبات میں بڑی زندگی اور ہیجان ہے۔ مگر دین کے حقائق اور فلسفہ اور عمیق شعُور کی ان کے اندر کمی ہے۔ ان کے پاس اِسلام کے بارے میں جتنا لٹریچر ہے وہ ہلکا پھُلکا سا ہے۔ اُس میں یہ پہلو بے حد تشنہ ہے کہ اسلام کس طرح ہمیں ہر پہلو میں ایک مکمل ضابطۂ حیات دیتا ہے اور اس کے اصولوں کو موجودہ دَور کی سوسائٹی اور ریاست کے حالات پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ خود نورسی مرحوم کے مواعظ اور درس بھی ایمانیات تک محدود ہیں۔ اتحاد اور خلافتِ اسلامی اور نفاذِ شریعت کا وہ مطالبہ کرتے رہے ہیں مگر اجمالی انداز کے ساتھ۔ البتہ اب یہ لوگ اخوان المسلمون

کے رہنماؤں اور مولانا مودودی مدظلہٗ العالی کی تصنیفات بڑی تیزی کے ساتھ ترکی زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔ یہ تصنیفات اُن کے شعور کو پختہ تر کرنے میں کافی ممد ثابت ہو رہی ہیں اور تعلیم یافتہ طبقے میں برق رفتاری کے ساتھ پھیل رہی ہیں۔

یہ لیلۃ القدر ہے۔ یعنی رمضان المبارک کی ستائیسویں شب۔ یہاں کا ریڈیو اگرچہ ایک آزاد ادارہ ہے اور تجارتی بنیادوں پر قائم ہے مگر اس کا کنٹرول ملحد، لادین اور یہود نواز عناصر کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باوجود ستائیسویں شب کو اُس نے کوئی ایسا پروگرام نشر نہیں کیا جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ تمام رات اس کا پروگرام جاری رہا۔ مذہبی موضوعات پر تقریریں ہوتی رہیں۔ حمد و نعت پیش کی جاتی رہی۔ قرآن کی تلاوت ہوتی رہی اور مختلف ترکی قرّاء اپنے کمالاتِ فن سے دلوں کو گرماتے رہے۔ ترکی کے محکمۂ مذہبی امور کے سربراہ، اُن کے نائب، وزیر اعظم، پارلیمنٹ کے ارکان اور دوسری نمایاں شخصیتوں کے پیغامات نشر ہوتے رہے۔ ترکی کے تغیر پذیر حالات میں یہ چیز بسا غنیمت ہے۔ رات ہوٹل میں سونے کی بہت کوشش کی مگر نیند غائب ہو چکی تھی اور یہ فکر لاحق تھی کہ کب لندن پہنچوں اور مولانا محترم سے ملوں۔

سفارت خانہ پاکستان

آج ۱۹ دسمبر ہے اور جمعرات کا دن۔ حاجی ابراہیم قیّا صاحب کے صاحب زادے علاؤ الدین قیّا کو لے کر پاکستان کے سفارت خانہ میں گیا تاکہ لندن کی انڈورسمنٹ کراؤں اور پھر اوّلین فرصت میں لندن روانہ ہو جاؤں۔ جدّہ میں انڈورسمنٹ لینے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ ایوب صاحب نے اپنے

عہدِ حکومت میں اپنے مخالفین کے ساتھ جس تنگ نظری، ذاتی پرخاش اور کینہ توزی کا برتاؤ کیا ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ان کے دور میں پاکستان کے اکثر سفارت خانے مخالفین کے خلاف محکمۂ جاسوسی کا کام کرتے رہے۔ اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کرتے رہے۔ کجا یہ کہ مخالفین کے لیے غریب الوطنی میں سہولتیں فراہم کریں۔ اُمید ہے ان سفارت خانوں کا "موڈ" اب بدل چکا ہوگا۔ پاکستانی سفارت خانہ میں عصر تک اپنی درخواست لیے بیٹھا رہا۔ سفارت خانے کے عملہ کی طرف سے "خوش آمدید" کے جذبے کا اظہار تو نہیں ہوا البتہ مجموعی برتاؤ اور اندازِ گفتگو بُرا نہ تھا۔ انتظار گاہ میں دوسروں کے ساتھ وقت کاٹتا رہا۔ سفارت خانہ کی لائبریری میں اُردو ادب کا اچھا ذخیرہ موجود ہے مگر الماریوں کو تالے لگ رہے تھے اس لیے اس سے استفادہ بھی ممکن نہ رہا۔ ایک بجے کے قریب معلوم ہوا کہ اکثر ذمہ دار اصحاب لنچ کے لیے اُٹھ گئے ہیں۔ رمضان المبارک کے آخری ایّام اور لنچ !! یہ ایک مسلمان ملک میں اِسلامی جمہوریۂ پاکستان کی نمائندگی ہو رہی تھی۔

نئے انقرہ کی ایک مسجد

علاؤ الدین تیبا سے میری گفتگو اُنگلیوں اور آنکھوں سے ہوتی یعنی لغتہ الاشارہ ہمارا واحد سہارا تھی۔ ہم دونوں نمازِ ظہر کے لیے نکل گئے۔ ہمارا سفارت خانہ انقرہ کی بالکل نئی اور فیشن ایبل آبادی میں واقع ہے۔ جیسے کراچی کی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ اُمید نہ تھی کہ اس آبادی میں کوئی مسجد مِل جائے گی۔ مگر سفارت خانہ کی پُشت پر ہی چند قدم آگے چل کر ایک نئی خوبصورت اور صاف و شفّاف

مسجد مل گئی۔ نمازِ ظہر کی حاضری بھی خوب تھی۔ ترک نمازی جماعت کے انتظار میں بیٹھے سبحہ گردانی اور قرآن خوانی میں مشغول تھے۔ انقرہ کو جب دارالحکومت بنایا گیا تھا تو وہاں کوئی نئی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چند قدیم مسجدیں مثلاً جامع حاجی بیرم خاں، اور جامع علاؤالدین کیقباد سلجوقی موجود تھیں۔ مگر اُن پر بھی خزاں طاری ہو چکی تھی۔ اتاترک نے جسے اب تک ہمارے ہاں کے سادہ لوح لوگ غازی کہتے ہیں، جدید انقرہ کو مسجدوں سے بہ تشدد "پاک" رکھا تھا۔ عدنان مندریس نے پہلی مرتبہ اس پابندی کو اُٹھایا اور اپنی ذاتی رہائش گاہ کے قریب اپنے خرچ سے ایک مسجد تعمیر کروائی۔ ترک عدنان مندریس کو "مسجدوں اور سڑکوں کا وزیراعظم" کہتے ہیں۔ یہ پابندی اُٹھ جانے کے بعد اب انقرہ میں جابجا نئی مسجدیں بن رہی بلکہ خود محکمۂ امورِ مذہبی کی طرف سے سرکاری خرچ پر وسطِ انقرہ میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کی جا رہی ہے جس کا تخمینہ ۳ کروڑ ترکی پاؤنڈ ہے۔

مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے دفتر میں

علاؤالدین تپیا نے میری مایوسی اور اکتاہٹ کو دیکھ کر ایک اچھا حل نکال لیا۔ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے دفتر میں لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر سلیمان عطش سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف انقرہ یونیورسٹی کی الٰہیات فیکلٹی میں تفسیر کے پروفیسر ہیں۔ بڑے تپاک اور بے تکلفی سے ملے۔ نہایت شُستہ اور فصیح عربی بولتے ہیں۔ انگریزی اور فرنچ کے بھی عالم ہیں۔ مولانا محترم کی صحت و عافیت کے بارے میں دریافت کیا۔ فیڈریشن کے بارے میں بتایا کہ انقرہ کے علاوہ استنبول، قیصریہ، ازمیر اور قونیہ میں فیڈریشن کے بڑے اثرات

ہیں۔ یہ فیڈریشن اسلامی نظامِ تعلیم کی علمبردار ہے اور طلبہ کے اندر مغربیت کے آثار کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ پاکستان کے متعدد لوگوں سے ڈاکٹر عطش کا تعارف ہے۔ آرسی ڈی کی طرف سے سکالرشپ پر پاکستان آرہے ہیں۔" اسلام ۔ ت" نامی ماہوار رسالہ اسی فیڈریشن کی طرف سے نکلتا ہے۔ دفتر سے نکلے تو علاؤ الدین قیا کے اشارہ پر مَیں بھی اُن کے ساتھ پیدل چل پڑا۔ چلتے چلتے ہم انقرہ کی سب سے بڑی مارکیٹ میں پہنچ گئے۔ یہ بیس منزلہ عمارت ہے۔ اس میں ہر چیز دستیاب ہو سکتی ہے۔ ایک کواپریٹو سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ہے۔ ایک منزل میں ایک ہی نوعیت کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ فروخت کا کام لڑکیاں سرانجام دیتی ہیں۔ جنہوں نے اپنے بالوں کے ڈیزائن تیار کرنے میں یقیناً گاہکوں کی پسند کا لحاظ رکھا ہو گا۔ علاؤ الدین مجھے کئی منزلوں تک لیے لیے پھرتا رہا۔ مَیں اُسے یہ نہ سمجھا سکا کہ یہ فضا جس میں آوارگی انتہا پر ہے، عُریانی مذاقِ سنجیدہ کا مُنہ چِڑا رہی ہے اور چشم و ابرو اور ساق و سینہ کی بے باکانہ نمائش ہو رہی ہے مجھے پسند نہیں ہے۔ آخر کار مارکیٹ سے نکلتے وقت مَیں نے ایک سٹور سے ایک چھوٹی قینچی خریدنا چاہی۔ جب قیمت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ۳۰ ترکی لیرے۔ سعودی عرب میں ہوتا تو اسے ایک ریال میں خریدتا۔ اندازہ ہوا کہ تُرکی کا اقتصادی نظام غیر متوازن ہو رہا ہے اور انقرہ استنبول کی نسبت کئی گنا زیادہ گراں ہے۔ اور بھی کئی موقعوں پر اس اقتصادی ناہمواری کے ثبوت مِلے۔

واپس سفارت خانے آئے اور عصر کے وقت فارغ ہو کر الصدیاس (حسرت) واپس چلے گئے۔ مکتبۂ نُور پہنچے تھے کہ ہمارے عزیز دوست صالح

اوزجان کا آدمی آگیا اور مجھے ماہنامہ ہلال کے دفتر لے گیا۔ انقرہ آنے کا ایک مدعا صالح اوزجان سے ملاقات تھی۔ انقرہ ہوٹل میں ہم نے افطاری کی اور وہاں سے مشرقِ اوسط یونیورسٹی چل دیئے۔ یہ یونیورسٹی ترکی کے وزیرِ اعظم سلیمان بک ڈیمرل کے بھائی علی بک ڈیمرل نے قائم کی ہے۔ اور وہی اس کے مالک بھی ہیں اور چانسلر بھی۔

علی بک ڈیمرل اور ان کی یونیورسٹی

علی بک ڈیمرل کی یونیورسٹی گو پرائیویٹ ہے مگر ایک مکمل یونیورسٹی ہے۔ اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے تمام علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ طلبہ کی تعداد ۵ ہزار سے متجاوز ہے۔ ان میں ۳۰ کے قریب طلبہ علی بک صاحب کے خرچ پر پڑھتے ہیں۔ یونیورسٹی کی عمارت نئی ہے۔ یونیورسٹی کے نچلے حصے میں مسجد ہے۔ علی بک خود بھی نماز کے پابند ہیں اور طلبہ کے اندر بھی اس کا شوق پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یونیورسٹی دن کے علاوہ رات کو بھی کھلتی ہے۔ علی بک ہمارے دوست صالح اوزجان سے بڑی محبت کرتے ہیں اور ان کے جہاد اور تبلیغی مساعی کے بڑے قدردان ہیں۔ صالح اوزجان نے بتایا کہ علی بک ڈیمرل مولانا محترم سے خوب واقف ہیں، ہمیشہ مولانا کا ذکرِ خیر کرتے رہتے ہیں، انہیں بھی مولانا محترم کی ترکی میں آمد کا انتظار ہے، لہٰذا ان سے ملاقات کر لی جائے۔ علی بک اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ ہم اجازت لے کر اندر داخل ہوئے۔ صالح اوزجان صاحب نے جب میرا تعارف کرایا تو موصوف نے بڑی گرمجوشی اور خندہ روئی سے استقبال کیا۔ پہلا سوال یہ کیا کہ "مولانا مودودی

کی صحت کے بارے میں آخری اطلاع کیا ہے"؟ عرض کیا: "اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر ہے کہ مولانا محترم کے دونوں اپریشن کامیاب ہو گئے اور اب وہ تیزی سے رُو بصحت ہو رہے ہیں۔ پاکستان واپس تشریف لے جانے کے لیے پابہ رکاب ہیں۔" کہنے لگے: "مولانا محترم کی صحت اور شفایابی سے ہمیں بڑی مسرت ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو طویل عمر عطا فرمائے۔" واپسی کی تاریخوں کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ "انشاء اللہ ایک دو روز تک اُن کی طرف سے واپسی کی تاریخوں کی قطعی اطلاع آجائے گی۔ سابقہ اطلاع یہ ہے کہ ۲۶ر دسمبر کو وہ لندن سے روانہ ہو رہے ہیں۔" علی بک دُمیرل فرمانے لگے: "مولانا محترم کی ترکی میں آمد ہمارے لیے بڑے فخر و اعزاز کا باعث ہے۔ یہ ملک مولانا محترم کا اپنا ملک ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ مولانا محترم ترکی میں میرے مہمان ہوں اور سب سے پہلے میری یونیورسٹی میں خطاب کریں۔ میری طرف سے مولانا کو ضیافت کی پیش کش کر دیں۔" میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ آپ کا یہ پیغام میں مولانا محترم تک پہنچا دوں گا۔ مزید تاکید کرتے ہوئے علی بک کہنے لگے کہ "مولانا اس سفر میں بھی میرے مہمان ہوں گے اور آئندہ بھی جب ترکی تشریف لائیں تو میری ضیافت ریزرو ہے۔ اور اُن کی سب سے پہلی آواز شرقِ اوسط یونیورسٹی کے ہال سے بلند ہو گی۔ اس کے بعد دوسرے کسی ادارے کو اجازت ہو گی کہ وہ مولانا محترم کو مدعو کرے۔" موصوف نے ترکوں کی روایات کے مطابق بڑی بے تکلفی، ملنساری، تواضع اور عزت و تکریم کا مظاہرہ کیا۔ اور اسلام اور اسلامی اخوت کو باہمی محبت و اُلفت کا اصل رشتہ قرار دیا۔ آخر میں کہنے لگے:

"یہاں ہم اسلامی دعوت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسلام کے اندر ہماری بقا اور استحکام کا راز مضمر ہے۔ تُرک قوم کی رگ رگ میں اسلام کی محبت رچی ہوئی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ لوگ اس مہم کے اندر ہم سے تعاون کریں۔ اور ہم مِل جُل کر اسلام کو برتر کرنے کا فرض انجام دیں۔"

مَیں نے عرض کیا "جماعتِ اِسلامی کے قیام کا مقصد ہی دنیا کے اندر اِسلام کا غلبہ ہے۔ یہ جماعت ۱۹۴۱ء میں وجود میں آئی ہے۔ اُس وقت سے لے کر آج تک یہ برابر اسلام کے احیاء کے لیے کوشاں ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر اسلام کی پیش کردہ ہدایات کو اس نے اُجاگر کیا ہے۔ تعاون علی الخیر اس کا بنیادی مقصد ہے۔ تُرکی کے اندر آپ حضرات کی کوششوں سے اسلام کو جو زندگی نصیب ہو رہی ہے وہ ہمارے لیے بڑی حوصلہ افزا ہے۔ اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اسلام کے انحطاط کا آغاز بھی تُرکی سے ہُوا تھا، اور اس کا اعتلاء بھی ہمیں اُمید ہے تُرکی سے ہو گا۔" یہ وہ الفاظ ہیں جو علی بک دُمیرل صاحب کی دعوتِ تعاون کے جواب میں راقم الحروف کی زبان پر برجستہ آ گئے۔ صالح اوزجان گو مترجم تھے مگر مَیں نے دیکھا کہ صالح اوزجان خود بھی اس گفتگو سے بڑے محظوظ و مسرور ہو رہے تھے۔ ترکی میں اِسلام کے احیاء کے لیے جو کچھ کام ہو رہا ہے اُس میں صالح اوزجان کا خون پسینہ بھی بمقدارِ وافر شامل ہے۔ اس لیے دعوتِ اسلامی کے ذکر سے وہ جتنے شاداں و فرحاں ہوں انہیں حق پہنچتا ہے۔ تُرکی کی اِسلامی تحریک کو یہ فخر ہے کہ اُس کے ہم نواؤں میں علی بک دُمیرل

بھی شامل ہیں۔ علی بک ایک اچھے، سادہ اور بے لوث مسلمان ہی نہیں، تعلیم و تربیت کے میدان کے شاہسوار بھی ہیں۔ صالح اوزجان نے بتایا کہ علی بک بڑی سادہ بود و باش رکھتے ہیں۔ مغربی تہذیب کی خرافات سے دامن کش رہتے ہیں، نماز باجماعت کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اپنی پاک نفسی اور ملنساری کی وجہ سے انقرہ میں ان کا حلقۂ احباب بڑا وسیع ہے۔ ان کا دوست وہی ہو گا جو کم از کم نماز کا پابند ہو گا۔ غرور و استکبار ان کے اندر نام کو نہیں۔ اسلامی دعوت و تبلیغ کے معاملے میں جوش و خروش کے بجائے حکمت اور دور اندیشی کے قائل ہیں۔ راقم الحروف نے بھی ترکی کے چند روزہ قیام میں یہ محسوس کیا ہے کہ یہاں اسلامی تحریک جس برق رفتاری کے ساتھ اُبھر رہی ہے اُس سے نہ صرف ترکی کے اندر مخالفِ اسلام طاقتیں چوکنّی ہو رہی ہیں بلکہ بیرونی طاقتیں بھی اسے دیکھ کر دانت پیس رہی ہیں۔ اس لیے حالات حکمت و تدبر اور صبر و تحمّل کا تقاضا کرتے ہیں۔

نمازِ عشاء اور نمازِ تراویح اسی یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کی۔ مسجد اساتذہ اور طلبہ نمازیوں سے بھر گئی۔ سرکاری ملازمین کی ایک تعداد بھی باہر سے تراویح کے لیے یہاں آ گئی۔ صالح اوزجان صاحب نے بتایا کہ منصوبہ بندی وزارت کے اکثر بڑے بڑے آفیسر یہاں موجود ہیں۔ مسجد حاضرین کے لیے تنگ ہو گئی۔ یہ حاضرین تمام تر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ایک حافظ امام، ایک خطیب اور ایک مؤذن اس مسجد کے لیے مخصوص ہیں۔

محکمۂ امورِ مذہبی کے نائب صدر سے مُلاقات

صالح اوزجان انتھک اور درویش صفت آدمی ہیں۔ تراویح سے فارغ

ہوئے تو کہنے لگے محکمۂ امور مذہبی کے نائب صدر شیخ یشار تونا گور سے مل لیں۔ انقرہ کی نئی آبادی میں شیخ یشار کی رہائش گاہ ہے۔ یونیورسٹی سے سیدھے شیخ کے گھر پہنچے۔ سردی کی وجہ سے سڑکوں پر زیادہ رونق نہیں ہے۔ اِکّا دُکّا موٹر گزرتی نظر آجاتی ہے۔ اور یا پھر جگہ جگہ تجارت بنکاسی (کمرشل بنک) کے بجلی کے اشتہارات دمک رہے ہیں اور یا قدم قدم پر مصطفیٰ کمال کے مجسمے راہ گیروں کا سامنا کرتے ہیں۔ شیخ یشار کے گھر پر جب دستک دی تو قدیم ترکی روایت کے مطابق سب سے پہلے اُن کے چھوٹے چھوٹے بچے باہر نکلے۔ انہوں نے ہمارے ہاتھوں کو ترکی آداب کے مطابق بوسہ دیا۔ ہمیں گیلری میں لے گئے۔ اور کوٹ اُتار کر کھونٹیوں پر لٹکائے، بوٹ اُتارے اور سلیپر پہنائے۔ ہم کمرۂ ملاقات میں جاکر بیٹھے ہی تھے کہ شیخ یشار آگئے اور عربی زبان کے شستہ اور بلیغ اسلوب کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ مولانا محترم کی بار بار خیریت پُوچھی۔ اور ہر مرتبہ مولانا کے لیے "سماحة الاستاذ" کا لقب استعمال کیا۔ ابتدائی کلمات کے بعد اندر گئے اور جب آئے تو ان کے اپنے ہاتھ میں ترکی قہوہ کا ٹرے تھا اور بچے خشک اور تازہ پھلوں کی رکابیاں اُٹھائے ہوئے تھے۔ یوں تو ہر ترک کو تواضع اور مہمان نوازی کی عادت ابًا عن جدٍ ورثے میں ملی ہے، مگر خاص طور پر وہ گھرانے جن میں اصل ترکی تہذیب زندہ ہے اور جو تہذیبِ حاضر کی یلغار سے محفوظ رہے ہیں اس میں پیش پیش ہیں اور عثمانیوں کے دَور کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ شیخ یشار کا گھرانہ عثمانی اور کُردی دو خوبیوں کا سنگم ہے۔

شیخ یشار کی شخصیت

اس وقت ترکی کے اندر شیخ یشار نہایت اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ترکی میں اسلامی ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے بے حد مفید خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ محکمۂ امورِ مذہبی کا تمام نظم ونسق عملاً ان کے ہاتھ میں ہے اور جب سے انہوں نے اس محکمے کا چارج لیا ہے اس میں غیر معمولی شادابی اور حرکت پیدا ہو گئی ہے۔ شیخ یشار کی عمر ۶۵ سال سے زائد ہے۔ مگر ڈاڑھی میں سیاہی سفیدی پر غالب ہے۔ صحت اور توانائی قابلِ رشک ہے۔ قدرتی حسن پر علم کا غازہ بہارِ فزوں دکھا رہا ہے۔ قدیم ترکی کے بھی عالم ہیں اور جدید ترکی پر بھی عبور ہے۔ عربی زبان پر پوری دست گاہ حاصل ہے۔ حکیمانہ مشاغل کے باوجود مطالعہ میں کمی نہیں آئی۔ ذاتی لائبریری میں کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ صالح اوزجان اور ترکی کی اسلامی تحریک چونکہ لازم وملزوم ہیں اس لیے شیخ یشار صالح اوزجان کی نہ صرف ہمت افزائی کرتے ہیں بلکہ مفید مشورے بھی دیتے ہیں۔ مسجدوں اور ان کے اماموں، خطیبوں اور مفتیوں کا وسیع نظام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ محکمۂ امورِ مذہبی کروڑوں ترکی پونڈ کے بجٹ پر متصرف ہے۔ اس کے لیے ایسی ہی موزوں اور مخلص شخصیت کی ضرورت تھی۔ اس کے مقابلے میں اپنے ملک میں دیکھیے، اوقاف کے محکمہ کی سربراہی ایک سی ایس پی افسر کے حوالے کی گئی ہے جو دین کے علم سے کورا ہے، جس کے اشتراکی رجحانات کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، اور جسے ہر گمراہی کی ہمت افزائی کرنے اور علماء کی تذلیل و تضحیک کرنے میں کوئی باک نہیں ہے۔

ترکی میں "شیخ الاسلام" کا عہدہ اگرچہ مصطفےٰ کمال نے ختم کر دیا تھا، مگر ترک مسلمان شیخ یشار کو "شیخ الاسلام" ہی کے لقب سے پکارتے ہیں۔ شیخ یشار سے رات گئے تک گفتگو ہوتی رہی۔ یہ گفتگو اس قدر معلوماتی اور دلکش اور مطابقِ ذوق تھی کہ ہم تینوں اس میں محو ہو گئے۔ جب آدھی رات ہو گئی تو قصداً اس حدیثِ ذوشجون کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور باقی کل کے لیے اُٹھا رکھا۔ شیخ یشار نے پہلے تو مجھ سے مولانا محترم کے ذاتی اور تاریخی حالات سُنے۔ مولانا محترم کی عمر کیا ہے؟ تعلیم کتنی ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ کس کس زبان میں دسترس رکھتے ہیں؟ بچپن اور جوانی کا زمانہ کیسا تھا؟ اپنی دعوت کا آغاز کیسے کیا اور کن حالات میں کیا؟ ترجمان القرآن سے پہلے کیا کام کرتے رہے؟ تحریکِ خلافت اور دوسری تحریکوں کے بارے میں اُن کی کیا رائے تھی؟ خالدہ ادیب خانم پر اُن کی تنقید[1] نہایت صحیح ہے، ان تمام معلومات کا ماخذ کیا تھا جب کہ خود ترکی کے اکثر لوگ ان معلومات سے بے بہرہ تھے؟ تصنیفات کی کُل تعداد کیا ہے؟ کن کن زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے؟ تفہیم القرآن کتنی لکھی جا چکی ہے اور کتنی چھپ چکی ہے؟ کس فقہی مذہب کو ترجیح دیتے ہیں؟ یومیہ مشاغل کیا ہیں؟ جماعتِ اسلامی

---

[1] خالدہ ادیب خانم پر مولانا محترم کی تنقید "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" کے عنوان سے "تنقیحات" میں موجود ہے۔ تنقیحات کا عربی ترجمہ (نحن والحضارۃ الغربیۃ) کے نام سے چار سال ہوئے چھپ چکا ہے۔ شیخ یشار کا اشارہ اسی مضمون کی طرف ہے۔

کب وجود میں آئی؟ کس کس مرحلے سے گزری؟ کیا جماعت قیامِ پاکستان کے حق میں تھی؟ جماعت کا نظم کیا ہے؟ ملک کے اندر اس کے اثرات کتنے ہیں؟ ملک کے موجودہ حالات کیا ہیں؟ حالیہ ہنگاموں کا پس منظر کیا ہے؟ راقم الحروف اپنی معلومات کی حد تک ان تمام سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ اور شیخ یشار سے وعدہ کیا کہ جماعت کی مفصّل تاریخ کے بارے میں انہیں دو کتابیں مہیا کرے گا جن میں انہیں اکثر و بیشتر باتیں معلوم ہو جائیں گی۔[1]

زمین دوز عربی مدرسے

شیخ یشار کُردی الاصل ہیں۔ تُرکی کُرد دینداری اور شجاعت میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ تُرکی کا قوم پرست طبقہ (یعنی طورانی تُرک) کُردوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اِدھر کُرد بھی سلانیکی تُرکوں سے بیزار رہتے ہیں۔ کیونکہ وہی فری میسن اور دونمہ اور یہودی اثرات سے متاثر ہو کر تُرکی نسل پرستی کے علمبردار بنے، انہی کی حماقتوں سے سلطنتِ عثمانیہ کے ٹکڑے اُڑے، انہی نے خلافت کو ختم کیا اور وہی تُرکی کو لادینی اور مغربی تہذیب کے راستے پر زبردستی دھکیل دھکیل کر لے گئے۔ کُردی اور سلانیکی دو مختلف عصبیتوں کا عنوان بھی ہے اور پھبتی بھی۔ تُرکی کا ایک مشکوک اخبار شیخ یشار کو یہ طعنہ دیتا رہتا ہے کہ "یہ کُرد ہیں"

---

[1] ایک مولانا مسعود عالم مرحوم کی کتاب "تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند" اور دُوسرا ایک پمفلٹ "الجماعۃ الاسلامیہ فی پاکستان"۔ یہ دونوں عربی میں ہیں۔ اول الذکر بیروت میں چھپی ہے اور دوسری پاکستان میں۔

یعنی اِن سے بچو۔ شیخ یشار نے بتایا کہ انہوں نے ثانوی تک ترکی کے سیکولر اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اِس کے بعد انہیں دینی تعلیم اور عربی کا شوق پیدا ہؤا، مگر یہ شوق کیسے شرمندۂ تکمیل ہو؟ ملک کے اندر سیکولر تعلیم کا غلبہ تھا۔ اور دینی تعلیم کے حصول کے لیے ملک سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ یہ مشکل نہ صرف شیخ یشار کے لیے پریشانی کی موجب تھی بلکہ تمام ترک مسلمانوں کے لیے قلق و اضطراب کا سبب بن چکی تھی۔ مگر ترک مسلمان اس لحاظ سے غیر معمولی داد و تحسین کا مستحق ہے کہ اس نے "روزِ سیاہ" میں بھی "پیرِ کنعان" سے تعلق نہ توڑا اور اپنی ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیا۔ جب عربی اذان ممنوع تھی تو گھروں کے اندر چھُپ چھُپ کر عربی میں اذان دیتے اور نماز پڑھتے۔ شادی بیاہ کے قوانین اِسلامی شریعت کے خلاف دیکھے تو اس باب میں بھی بڑا دلچسپ راستہ پیدا کر لیا۔ دینی اور عربی تعلیم کے لیے بھی انہوں نے خطر پسندی کا ثبوت دیا اور زمین دوز دینی مدرسے قائم کر دیئے۔ زمین دوز دینی مدرسوں کا وسیع نظام تھا اور پولیس بڑی جدّ و جہد اور جبر و تشدّد کے باوجود اُن کا سراغ لگانے میں ناکام رہتی تھی۔ ان مدرسوں میں تعلیم دینے والے اور تعلیم حاصل کرنے والے دونوں اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ اُن پر کما حقہٗ صادق آتے تھے کہ "کالقابض علی النّار" (گویا آگ مٹھی میں لے رکھی ہے)۔ شیخ یشار نے بتایا کہ انہوں نے بھی ایسے ہی ایک مدرسے میں چار سال تک تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کی دینی معلومات اور عربی زبان کا ذوق اسی مدرسے کا رہینِ منّت ہے۔ شیخ بتانے لگے، ایک مرتبہ ایسا ہؤا کہ اندر درس ہو رہا تھا۔ استاذ

طلبہ کے سامنے فقہ کے کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ میں بھی ان میں شریک تھا۔ دریں اثناء یکایک باہر کا دروازہ کھٹکایا گیا۔ ہمیں متعلقہ آدمی نے اشارہ کر دیا کہ پولیس دروازے پر ہے اور وہ اس مدرسہ پر چھاپہ مارنا چاہتی ہے۔ چنانچہ ہم تمام طلبہ مع کتابوں کے ایک ایسے خفیہ دروازے سے نکل گئے جسے ہم "ایمرجنسی گیٹ" کہا کرتے تھے۔ ہمارے استاذ نے دروازہ کھولا۔ پولیس کے سپاہی دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بڑی چابک دستی کے ساتھ اِدھر اُدھر اُنہوں نے ہاتھ مارے۔ مگر انہیں کوئی ایسی چیز ہاتھ نہ لگی جس سے یہ ثابت کر سکیں کہ یہاں "رجعت پسندوں" اور "انقلاب دشمنوں" کا کوئی اڈا ہے۔ استاذ کو دھمکیاں دیں، مگر انہوں نے کہا کہ یہ ذاتی رہائش گاہ ہے، تم جس شُبہ کی بناء پر یہاں آئے ہو وہ درست نہیں ہے۔ آخر کار پولیس کا دستہ خائب و خاسر واپس لوٹ گیا۔ اگر اُس وقت ذرا بھی غفلت یا سُستی ہو جاتی یا "رصدگاہ" کا نظام ڈھیلا ہو جاتا تو یقیناً ہم سب پولیس کے قبضے میں ہوتے اور موت کی سزا سے لے کر عمر قید کی سزا تک سے دوچار ہوتے۔ شیخ کیشار اپنی یہ حکایت سُناتے ہوئے خیالات کی دنیا میں نہایت گہرے ڈوب گئے اور اُن کی آنکھیں یوں ایک جگہ پر مرتکز ہو گئیں جیسے وہ اپنی گزشتہ زندگی کی فلم کا بغور مشاہدہ کرتے کرتے یکایک یہ محسوس کرنے لگے ہوں کہ وہ فلم نہیں دیکھ رہے بلکہ حقیقتِ حال کے اسٹیج پر بیٹھے ہوں۔ بڑی گرجدار آواز اور فخریہ لہجے میں کہنے لگے کہ وہ دور سخت مشکلات کا دَور تھا۔ میں نے ان مشکلات کی طوفان خیز فضا میں چار سال گزارے ہیں۔ حکمرانوں کو ضد تھی کہ ترکی میں عربی کا ایک لفظ سُنائی نہ

دے اور ہم درویشوں کو ضد تھی کہ عربی سے ہمیں کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ یہ ہمارا سرمایۂ ایمان ہے۔ اور

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

پھر شیخ یشار نے کہا کہ وہ سابقہ نسل جو عربی سے دُور رکھی گئی ہے اور موجودہ نسل جسے اب عربی تعلیم کی پُوری آزادی اور سہولت حاصل ہو چکی ہے، دونوں کے درمیان ہم نقطۂ ماسکہ بنے ہوئے ہیں اور ہزار تشدد کے باوجود اس مقدس سلسلے کے اندر کُلی انقطاع نہیں پیدا ہونے دیا گیا ہے۔ شیخ نے اُس دَور کے بارے میں نہایت اچھا فقرہ بولا۔ کہنے لگے۔ "اُس وقت" اس سرزمین کا بطن اِس کے ظاہر سے بہتر تھا۔" کیونکہ ظاہر "بقول اتاترک" ترکوں کا باپ یہ کہتا ہے) پکار رہا تھا اور بطن "قال اللہ وقال الرسول" (خدا اور اس کے رسول نے یہ فرمایا) کہہ رہا تھا۔ شیخ یشار نے بتایا کہ زمین دوز خفیہ عربی مدرسے ارض روم اور مشرقی علاقے میں بکثرت پھیلے ہوئے تھے اور ان علاقوں میں آج بھی ایسے لوگ کثیر تعداد میں ملیں گے جنہوں نے ان مدرسوں میں تعلیم پائی ہے۔

مصطفیٰ کمال کے ایک ساتھی کی ہنگامہ خیز تالیف

شیخ یشار تونا کو اس کتاب کا راز افشا کرتے ہوئے بتانے لگے کہ اس کے مصنف کا نام ڈاکٹر رضا نور ہے۔ یہ صاحب مصطفیٰ کمال کے گہرے ساتھیوں میں سے تھے۔ لوزان کانفرنس تک دونوں کی گاڑھی چھنتی رہی۔ مگر جب لوزان کانفرنس میں مصطفیٰ کمال نے اپنے تمام وعدوں اور اعلانات کے برعکس ترکی

کو سیکولر ریاست قرار دینے اور مذہب کے خلاف تلوار کشی کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت ڈاکٹر رضا نور مصطفیٰ کمال سے متنفر ہو گئے۔ چونکہ ظاہری فضا میں مصطفیٰ کمال کا اچھا خاصا اثر تھا اور اس کے اچھے ساتھی بھی اس کی بعض خوبیوں کی وجہ سے اس کے خطرناک اقدامات تک سے چشم پوشی کر رہے تھے اس لیے اس کے خلاف کوئی مضبوط محاذ قائم کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ ڈاکٹر رضا نورؔ نے لوزان کانفرنس کے بعد مصطفیٰ کمال کے اصل حالات کی چھان بین شروع کر دی۔ اور اس چھان بین کے دوران جو اصل حقائق اُن پر کھلے وہ انہوں نے اس کتاب میں قلم بند کر دیئے۔ کتاب کا نام ہے "میری زندگی اور میری یادداشتیں"۔ یہ چار جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کا اصل مسوّدہ جو ڈاکٹر رضا نورؔ نے اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا تھا برٹش میوزیم میں موجود تھا۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر رضا نورؔ نے خود اپنے طور پر یہ مسوّدہ حفاظت کے لیے برٹش میوزیم کی تحویل میں دے دیا ہو۔ مسوّدے کی پیشانی پر یہ تحریر ہے کہ اس کتاب کو آج سے پچاس سال بعد شائع کیا جائے۔ حال ہی میں ایک صاحب برٹش میوزیم گئے تو اس کتاب پر اُن کی نظر پڑی۔ انہوں نے اس کی مائیکرو فلم حاصل کر لی اور اسے لاکر چھاپ دیا۔

شیخ بشار اس کتاب کو اپنی الماری میں سے نکال لائے، اور اس کے مختلف صفحات کا ترجمہ مجھے سنانے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مفصّل کتاب نہ صرف ترکی کے اُس دَور کی اصل تاریخ پیش کرتی ہے جب خلافت کا خاتمہ ہو رہا تھا اور سیکولر ترکی کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں، بلکہ یہ کتاب حیرت انگیز

اور "سنسنی خیز" انکشافات بھی کرتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب خود ترکی میں چھپ چکی ہے اور کثیر تعداد میں اس کے نسخے پھیل چکے ہیں اور اس پر ابھی تک ترکی حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی ہمارے علم کی حد تک نہیں کی گئی ہے اس لیے اس کے بعض مندرجات کا یہاں ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہے کہ مصطفیٰ کمال انگریزوں کا ایجنٹ تھا[1]۔ اس کے صفحہ ۱۵۶ پر

---

[1] جناب محمد امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"کمال بک اودخری مصطفیٰ کمال کے قریبی رفقاء میں سے تھا۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں برلن میں تھا تو کمال بک اودخری کے ساتھ میری متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ کمال بک اودخری نے مجھے ثقہ ذرائع کے حوالے سے بتایا کہ برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن اور مصطفیٰ کمال پاشا اور جناب عصمت انونو کے درمیان ترکی کی اسلامی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ معاہدہ ہوا۔ لارڈ کرزن کو برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج نے اس کام کے لیے باقاعدہ مقرر کیا تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے ایک مرتبہ عصمت انونو سے کہا تھا: "ہم تم ترکوں کو اب آزاد نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے کہ تم پھر دوبارہ مسلمانوں کے اتحاد کا مرکز بن جاؤ گے۔ اور "مسئلہ مشرق" جسے ہم پہلے مدتوں بھگت چکے ہیں دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔" چنانچہ ۱۹۲۱ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے انگریزوں کے ساتھ نئی جنگ چھیڑنے کے بجائے مصالحت کی گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اور عصمت انونو صاحب کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ عصمت انونو صاحب مصطفیٰ کمال سے مشورہ کے لیے بار بار لندن سے انقرہ جاتے تھے۔ ترکی اس وقت بلقان، لیبیا کی جنگوں اور عالمی جنگ کی وجہ سے بری طرح نڈھال ہو چکا تھا۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال پاشا انگریزوں کے دباؤ کے آگے جھک (باقی صفحہ ۱۹۴ پر)

مصنّف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مصطفیٰ کمال حقیقت میں ترک نہا ہی نہیں۔
میں نے شیخ بیشار سے پوچھا کیا فی الواقع یہ کتاب ترکی میں چھپ کر تقسیم ہو رہی ہے؟ موصوف مسکرا کر کہنے لگے یقین کیجئے، اس کے دس ہزار نسخے اب تک پھیل چکے ہیں اور صرف ۲-۳ ماہ کے اندر اندر اس کی یہ اشاعت ہوئی ہے۔ اسی مصنّف کی ایک اور کتاب بھی ترکی کی تاریخ پر برٹش میوزیم میں موجود ہے، اُس کی مائیکرو فلم بھی حاصل کر لی گئی ہے اور وہ بھی عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ شیخ بیشار کی گفتگو سے یہ امر صاف جھلک رہا تھا کہ ترکی میں تبدیلی کی رفتار بہت تیز ہے اور پچھلے چند سالوں تک ترکی پر جن لیڈروں کا رعب چھایا ہوا تھا اور جس نظام کی پرستش ہو رہی تھی وہ جادو کافور ہو چکا ہے۔ ماضی کی قیادت

(بقیہ حاشیہ صلا ۱۹۳ سے) گیا۔ اور لارڈ کرزن کی طرف سے جو چار شرطیں پیش کی گئی تھیں وہ من وعن تسلیم کر لیں۔ وہ چار شرطیں یہ ہیں:

۱۔ ترکی اسلام سے اپنے تعلق کو منقطع کرلے۔

۲۔ اسلامی خلافت کو منسوخ کردے۔

۳۔ خلافت کے حامی اگر کوئی تحریک چلائیں تو اُسے کچل دیا جائے۔

۴۔ ترکی عثمانی دستور کے بجائے جو شریعتِ اسلامی کے احکام پر مبنی ہے منسوخ سیکولر دستور نافذ کرے۔

یہ چاروں شرطیں مزید اضافوں کے ساتھ مصطفیٰ کمال نے نافذ کر دیں۔"

(بحوالہ مجلہ فلسطین شمارہ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

پر تنقید شروع ہو چکی ہے۔ اگر بیرونی طاقتوں کی دسیسہ کاری اور اندر کے ملحد اور یہود نواز عناصر کا سیاسی اور اقتصادی دباؤ انتہائی حد کو نہ پہنچ رہا ہو تو ترکی مستقبل قریب ہی میں غیر معمولی تبدیلی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

رات کافی گزر گئی۔ شیخ بیشار سے اجازت لی جو انہوں نے اس شرط پر دی کہ مَیں اور صالح اوزجان کل اُن کے ہاں افطاری کریں اور مزید تفصیل کے ساتھ تبادلۂ خیالات کریں۔ شیخ بیشار فصیح عربی میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے والد سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانے میں سرائے سلطان میں کسی عہدہ پر فائز تھے۔

انقرہ میں مواصلات کا قابلِ تقلید نظام

کڑاکے کی سردی اور نصف شب کی بے پناہ تاریکی۔ سڑکوں پر مکمل سکوت۔ سوچا کہ اب کافی دیر پیدل چلنا پڑے گا اور پھر جا کر کہیں سواری ملے گی۔ مگر صالح اوزجان نے سڑک پر آتے ہی کھمبے کا رُخ کیا اور کھمبے پر لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ مَیں نے اس معنی خیز حرکت کی وجہ دریافت کی۔ مگر شاید وہ میری کمزوری اور پریشانی کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ میری پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے کہنے لگے یہاں کھڑے رہتے ہیں، شاید کوئی ٹیکسی مل جائے۔ مَیں نے کہا اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے کہ اتنے میں ٹیکسی آگئی۔ ٹیکسی کے اندر بیٹھ کر کہنے لگے کہ "یہ میری اُس حرکت کا نتیجہ ہے جو کھمبے کا بٹن دبا کر مَیں نے ابھی ابھی کی ہے، لاہور میں تو ہمیں ایک مرتبہ دن کو بھی ٹیکسی نہیں مِل تھی۔ مگر انقرہ میں دیکھیے رات کو بھی بلا تاخیر ٹیکسی مل گئی ہے۔ نئی آبادیوں کے کھمبوں پر لگے ہوئے بٹنوں کو دبا دیجیے، ٹیکسی سٹینڈ میں اطلاع ہو

جائے گی اور ٹیکسی مقامِ مطلوب تک فوراً پہنچ جائے گی "۔ یہ نظام انقرہ کی تمام نئی آبادیوں میں قائم ہے ۔ یہ انقرہ کی حسنات میں سے ایک ہے ۔ لاہور کا باشندہ اس نظام پر عش عش کر اٹھا ۔

آج ۲۹ رمضان المبارک ، جمعۃ المبارک کا دن ہے ۔ جمعۃ الوداع کی نماز علی بک ڈیمرل کی یونیورسٹی میں ادا کی ۔ یونیورسٹی میں چھٹی تھی ۔ نمازیوں کی غالب اکثریت سرکاری ملازمین پر مشتمل ہے ۔ صالح اوزجان نے بتایا کہ منصوبہ بندی وزارت کے تقریباً تمام بڑے عہدیدار نمازیوں میں موجود ہیں ۔ خطیب صاحب نے قیامت کے موضوع پر تقریر کی ۔ یہ اندازہ مجھے ان احادیث اور آیات سے ہوا جو انہوں نے بار بار تقریر میں بیان کیں ۔ نماز کے بعد صالح صاحب نے اکثر حضرات سے میرا تعارف کرایا ۔ یہ سب لوگ خوب محبت ، گرم جوشی اور تواضع سے ملے ۔ اور یوں محسوس ہوا کہ سب ہی مولانا مودودی مدظلہ العالی سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہیں ۔ صالح اوزجان سے مَیں نے دریافت کیا کہ کیا یہ لوگ مولانا محترم اور جماعت سے واقف ہیں ؟ بتانے لگے کہ ان حلقوں میں ہم مولانا کی تصانیف (ترکی تراجم) پھیلاتے رہتے ہیں ۔ اس لیے واقفیت نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ صالح صاحب نے بتایا کہ مولانا محترم کی کتاب " اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی " اسلامیات کے نصاب میں منظور ہو چکی ہے اور مجھ سے تقاضا ہو رہا ہے کہ مَیں جلد از جلد اسے چھاپوں [1] ۔

---

[1] رابطۂ عالمِ اسلامی مکۂ معظمہ کے حالیہ اجلاس میں صالح اوزجان نے بتایا کہ یہ کتاب چھپ چکی ہے ۔ انہوں نے اس کا ایک نسخہ بھی مولانا محترم کو پیش کیا ۔

عید کی تیاریاں

نماز جمعہ کے بعد صالح اوزجان مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر سنجان چلے گئے جہاں اُن کی رہائش ہے۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے آئیں گے تاکہ شیخ بشار کے ہاں افطاری کے لیے جا سکیں۔ میں نے ہوٹل میں یہ وقت گزارنے کے بجائے بازاروں میں گردش شروع کر دی۔ تاکہ انقرہ کی عید کی چہل پہل بھرپور دیکھ لی جائے۔

انقرہ کے بارے میں بار بار یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ شہر ہے تو مسلمانوں کا مگر اُسی تضاد سے لبریز ہے جو کراچی، قاہرہ، عمان اور طرابلس میں نظر آتا ہے۔ مسجدوں میں جا کر طبیعت خوش ہوتی ہے کہ حاضرین میں نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت ہے۔ بازاروں میں معاملہ بالکل اُلٹا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے نیم عریاں لباس، نوجوانوں کی آوارہ گردی، مردوں اور عورتوں کا باہوں میں باہیں ڈال کر چلنا، یہ سب وہ مظاہر ہیں جو بے خدا قوموں کی اجتماعی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں دیکھ کر ذہن شدید اُلجھن سے دوچار ہو جاتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اگر استنبول اور انقرہ پر اسی تہذیب کا غلبہ رہا تو ترکی صحیح اسلامی تہذیب کا گہوارہ کیسے بن سکے گا اور اسلامی تہذیب کو بحال کرنے کے لیے اُسے کتنے شدید کام اور طویل محنت کی ضرورت ہو گی۔ جو عورتیں صحیح معنوں میں مسلمان ہیں وہ گھروں سے ہی نہیں نکلتیں، اور گھروں سے نکل کر بازاروں اور دفتروں اور محفلوں میں اگر رونق پیدا کرنے والی عورتیں یا تو مسلمان ہی نہیں ہیں، بلکہ یہودی ہیں یا ارمن، عیسائی ہیں یا دونمہ۔ اور اگر مسلمان ہیں تو ان خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جنہوں نے دنیا کی ہر بُری بھلی چیز کو اہمیت دی ہے مگر اسلام

کو اہمیت نہیں دی۔

البتہ ایک پہلو اس تاثر کا یہ بھی ہے کہ عید یا کسی دوسرے تہوار کے جھگڑوں پر لاہور اور کراچی میں پاکستانی نوجوان جس غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ انقرہ جیسے مغرب پرست شہر میں نہیں نظر آتے۔ ترک نوجوانوں کے لباس میں ٹیڈیوں کا چھچھورپن نہیں ہے۔ ہے تو سوٹ مگر باوقار ہے۔ چہروں سے شرارت نہیں ٹپکتی بلکہ تمکنت اُجاگر ہے۔ لبنانیوں اور شامیوں کی طرح ترفّع اور خودپسندی نہیں پائی جاتی بلکہ تواضع اور محبت پائی جاتی ہے۔ نفاستِ ذوق، محبت اور اخلاص ان کے قومی خصائل ہیں۔

افطاری حسبِ وعدہ شیخ یشار کے ہاں کی۔ افطاری اور نماز کے بعد کھانا کھا رہے تھے کہ شیخ یشار نے بتایا کہ یہ آخری روزہ ہے۔ کل کو عید ہوگی۔ خاکسار نے دریافت کیا کہ کیا چاند ہو گیا ہے۔ شیخ یشار نے بتایا کہ ترکی میں عید چاند دیکھنے پر نہیں ہوتی بلکہ فلکی حساب کے تحت ہوتی ہے۔ ہمیں پہلے ہی معلوم ہوتا ہے کہ فلاں روز عید ہوگی اور ہمارا یہ فلکی حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ شیخ یشار کا دسترخوان نہایت پُرتکلف اور وسیع و عریض تھا۔ خصوصاً ترکی پلاؤ میں چلغوزوں کی بہتات خوب تھی۔ اور بھی متعدد چیزیں ایسی تھیں جن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مگر خاکسار بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ پاکستان کے دسترخوان کا مقابلہ مشکل ہے۔ کھانا لانے کی خدمت شیخ یشار کی ایک صاحب زادی سرانجام دیتی رہی جس نے مکمل ساتر لباس پہن رکھا تھا۔ صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ کھانے کے بعد اطمینان سے مجلس جم گئی۔ اب تراویح کی مشغولیت

باقی نہ رہی تھی۔

تُرک حاجیوں کے لیے سرکاری انتظامات

باتیں تو ہشت پہلو تھیں۔ ترکی حاجیوں کا قصہ چھڑا تو شیخ یشار نے بتایا کہ اب حکومت ہر سال حج کی سہولتوں میں اضافہ کرتی جا رہی ہے۔ اور جتنے لوگ چاہیں حج پر جائیں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تُرکی حجاج کی تعداد تمام دنیا کے حاجیوں سے زیادہ ہوتی ہے[1]۔ شیخ یشار نے بتایا کہ ہر حاجی پر پابندی ہے کہ وہ دو سو ڈالر کا انتظام کرے۔ کم از کم دس رومال اور دس جرابیں اس کے پاس ہوں تاکہ صاف ستھرے لباس کا مظاہرہ ہو۔ حج فلائٹوں میں یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ ایئر ہوسٹس اسکرٹ نہ پہنیں بلکہ ٹخنوں تک پُورا لباس پہنیں۔ ان کے صرف چہرے اور ہاتھ کُھلے ہوں۔ ہر فلائٹ میں حکومت کی طرف سے ایک مفتی کا انتظام ہوگا جو حاجیوں کو موقع محل کی مناسبت سے حج کے مسائل سے آگاہ کرے گا[2]۔ شیخ یشار نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اس مرتبہ شام کی حکومت خشکی کے راستے سے تُرکی حاجیوں کو گزرنے کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ اگر حاجیوں کی بسیں شام سے گزر کر جائیں تو انہیں صرف دو ہزار کیلومیٹر کا فاصلہ

---

[1] ترکی حاجیوں کی تعداد چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہوتی ہے۔ تُرکی کی مجموعی آبادی ۴ کروڑ سے کم ہے۔ یعنی پاکستان کی تہائی آبادی سے کچھ زیادہ۔

[2] اِس مرتبہ تُرکی حکومت نے ان انتظامات کو مزید ترقی دیدی ہے۔

طے کرنا پڑتا ہے مگر اب یہ بسیں عراق اور کویت سے ہو کر سعودی عرب میں داخل ہوں گی۔ اور انہیں سات ہزار کیلومیٹر کا سفر کرنا پڑے گا۔

قُبرُص کی حالت

عالمِ اسلامی کے مسائل کا ذکر چھڑا تو میں نے قُبرص کے بارے میں شیخ بیشار سے بعض سوالات کر دیئے۔ ترکی کے لیے قُبرص کا مسئلہ وہی اہمیت و نزاکت رکھتا ہے جو پاکستان کے لیے کشمیر کو حاصل ہے۔ قُبرص کی سیاسی صورتِ حال سے تو پاکستان کے مسلمان ناواقف نہیں ہیں۔ قُبرصی ترکوں اور قُبرصی یونانیوں کی باہمی کشیدگی اور قُبرصی یونانیوں کے تُرک آبادی پر مظالم کی داستان کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ یہ جزیرہ طویل مدّت تک عثمانی خلافت کے تحت رہ چکا ہے۔ اِس صدی کے اوائل تک اس میں اسلامی تعلیم کا بڑا چرچا تھا۔ مگر جب سے انگریزوں نے قُبرص میں قدم رکھا وہاں کا مسلمان بھی انگریزی تہذیب کا شکار ہوتا چلا گیا۔ شیخ بیشار نے بتایا کہ ہم قُبرصی ترکوں کے لیے آخر دم تک لڑیں گے، مگر جہاں تک قُبرص کے مسلمانوں کا حال ہے وہ اسلام سے بہت دُور ہو چکے ہیں۔ بگاڑ ان کے اندر وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے۔ اِسلامی شعائر اور نماز و روزہ کا وہاں نام و نشان نہیں ہے۔ اس مرتبہ رمضان المبارک کے آغاز پر ہم نے چار واعظ بھیجے۔ دو اس بنا پر واپس آ گئے کہ انہوں نے جب اِسلامی اخلاق اور اسلامی احکام کی تبلیغ شروع کی تو لوگوں نے اسے ناپسند کیا، اور اِن باتوں کو سُننے سے انکار کر دیا۔ باقی دو بھی وہاں سے مسلسل خطوط لکھ رہے ہیں کہ ہماری تبلیغ سے لوگ ناخوش ہیں۔ اور مغربی تہذیب پر کسی قسم کی تنقید

انہیں اچھی نہیں لگتی۔ بلکہ شیخ لیشار نے رازدارانہ طور پر کہا کہ مفتی قبرص کا حال بھی بہت پتلا ہے۔ ان کے گھر کی تمام خواتین مغربی عورتوں کا لباس پہنتی ہیں۔ شیخ کہنے لگے کہ ایک طرف جنگی نقطۂ نظر سے قبرص کی اہمیت کو دیکھیں اور دوسری طرف وہاں کے مسلمانوں کی یہ غفلت دیکھیں کہ انہیں اپنے قومی تشخّص کا احساس تک نہیں ہے۔ شیخ لیشار سے معلوم ہوا کہ قبرص کے ترک بہت بڑی تعداد میں روزگار کے لیے لندن اور جرمنی جا رہے ہیں۔ صرف لندن میں ۴۰ ہزار کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ جہاں تک قبرص کے مسئلہ کا تعلق ہے ہم سو فیصد وہی احساس رکھتے ہیں جو ہمارے ترک بھائیوں کے ہیں۔ مگر شیخ لیشار سے وہاں کے اخلاقی بگاڑ اور دینی کمزوری کا حال معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا۔ قبرص کے عیسائی صدر میکاریوس کو دنیا بھر کے صلیب پرستوں کی حمایت حاصل ہے۔ مگر قبرص کے مسلمان کے لیے صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی کا سہارا ہے۔ اگر وہ اس سہارے کو بھی چھوڑ دیں تو یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہو گی۔ اگر اُن تمام مسلمان قوموں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے جو ظالم اور کافر طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہیں تو یقیناً یہ مشترک نتیجہ برآمد ہو گا کہ یہ قومیں اخلاقی اور مذہبی ضعف میں مبتلا ہیں اور اُن کے ابتلاء کے اسباب میں سے اہم سبب انہی دونوں پہلوؤں میں غیر معمولی کوتاہی ہے۔

میں نے شیخ لیشار سے آخری سوال یہ کیا کہ آپ کے محکمۂ امورِ مذہبی کی سرگرمیوں کی تفصیل کیا ہے۔ نیز ترکی میں دینی تعلیم کے احیاء کا کام کس حد تک ہو رہا ہے۔ موصوف نے کہا اگر مختصر جواب درکار ہے تو میں ابھی بتاتے دیتا ہوں اور اگر جملہ تفصیل پیشِ نظر ہے تو پھر ایک روز میرے دفتر میں آ جائیں،

میں تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال دوں گا۔ میں نے مؤخرالذکر صورت کو ترجیح دی۔ اور ایک طویل سوالنامہ تیار کرنے کی اسکیم سوچ لی۔ چنانچہ شیخ یشار سے ہم نے اجازت لی، اور خاکسار برلن ہوٹل کی طرف اور صالح اوزجان اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔

نمازِ عید

عید کی پوری رات ریڈیو سے قرآن پاک کی تلاوت اور مذہبی تقریریں ہوتی رہیں۔ تُرکی انداز کی دلچسپ نعتیں اور قصیدے بھی سُناتے جاتے رہے۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی توپیں چلنی شروع ہو گئیں۔ گنتی تو یاد نہیں ہے لیکن دس گیارہ سے کم نہیں تھیں۔ یہ اس امر کا سرکاری طور پر اعلان تھا کہ آج انقرہ عید منا رہا ہے۔ جامع بیرم برلن ہوٹل سے کافی دُور ہے۔ اس لیے میں نے نمازِ فجر ہوٹل ہی میں ادا کی۔ اور پاکستانی رواج کے مطابق خیال کیا کہ سورج طلوع ہو جانے پر عیدگاہ کی طرف نکل پڑوں گا۔ طلوعِ آفتاب کے بعد کپڑے تبدیل کیے، چائے پی اور جامع بیرم کی طرف چل پڑا۔ قیاس تھا کہ لوگ کثرت کیساتھ ہاتھوں میں جانماز لیے عیدگاہ کی طرف جا رہے ہوں گے اور یہ اس امر کی علامت ہو گی کہ کچھ وقفے کے بعد نمازِ عید کھڑی ہو جائے گی۔ مگر عیدگاہ کی طرف جانے والوں کی تعداد بہت کم تھی مجھے یقین ہو گیا کہ تُرک دیر سے نمازِ عید پڑھتے ہیں۔ مجھے اب عجلت کی حاجت نہ تھی۔ مگر خراماں خراماں جب جامع بیرم کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ مسجد کا بیرونی صحن بھی پوری طرح بھر رہا ہے اور اب لوگ مسجد سے باہر اپنے لیے جگہ بنا کر بیٹھ رہے ہیں۔ اور لاؤڈ اسپیکر سے قرآن کی تلاوت

ہو رہی ہے۔ سردی سخت تھی، اتنی سخت کہ دماغ چکرانے لگا۔ جانماز اس لیے ساتھ نہ لی کہ چونکہ جلدی میں نکل رہا ہوں اس لیے مسجد کے اندر صفِ اول میں جگہ مِلے گی۔ مگر اب نماز کھُلے صحن میں پڑھنا ہو گی اور وہ بھی کیونکہ تُرک آ رہے تھے۔ عام لوگ ہاتھوں میں جانماز لیے آتے اور بچھا کر بیٹھ جاتے۔ اور جس کے پاس جانماز نہ ہوتی وہ اوورکوٹ اُتار کر اُسے بچھا لیتا۔ میں کیا کروں۔ "اتحاد" اخبار بِک رہا تھا اُسے جانماز کی نیت سے خریدا اور بچھا لیا۔ مگر سخت تکلیف اور پریشانی۔ ایک تُرک نے مجھے یوں مبہوت دیکھ کر اپنے پاس بُلا لیا۔ اور اپنے گرم کمبل پہ مجھے بٹھا لیا۔ فوج کا ایک باوردی دستہ آیا۔ اُن میں سے کسی کے پاس کوئی جانماز یا کمبل نہ تھا۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنا بھاری بھرکم فوجی کوٹ اُتارا اور اُسے بلا تکلف بچھا لیا۔ صحت مند اور سردی کے عادی تُرکوں کے لیے یُوں کر لینا معمولی بات ہے۔ مگر اپنے تو کوٹ کے باوجود دانت بج رہے تھے۔ خطیب صاحب نے ۲۰ منٹ تک تقریر کی معلوم نہیں کیا بات وہ کہتے رہے مگر فلسطین اور پاکستان اور اسلام اور جہاد اور شریعت اور حق و باطل کے کلمات بار بار استعمال کرتے رہے۔ یہ وہی خطیب ہیں جن کا ذکر میں پیچھے کر چکا ہوں۔ تقریر کے بعد نماز کھڑی ہوئی اور خطبہ عید پڑھا گیا۔ اور لوگ ایک دوسرے سے "بیرم مبارک" (عید مبارک) کہتے اور مصافحہ اور تقبیل سے اظہارِ محبت کرتے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اور میں رُک گیا کہ خطیب سے بیرم مبارک کرتا جاؤں۔

حافظ ذکائی خطیب مسجد سے معلوم ہوا کہ عید کے روز لوگ نمازِ فجر کے وقت ہی مسجد میں آنے شروع ہو جاتے ہیں اور اُس وقت تک قرآن مجید کی تلاوت

اور دُعا و ذکر میں مشغول رہتے ہیں جب تک عید سے فارغ نہیں ہو جاتے۔ مسجد کے اندر کا کشادہ و طویل صحن نماز فجر کے وقت ہی پُر ہو گیا تھا۔ البتہ باہر کی زائد صفوں کے لوگ بعد میں آتے ہیں۔ ان میں سے مَیں بھی ایک ہوں۔ جامع بیرم چونکہ انقرہ کی قدیم ترین مسجد ہے اس لیے لوگوں کا اکثر و بیشتر رجوع اسی مسجد کی طرف رہتا ہے۔ نماز کے معاملے میں ترکوں کا اہتمام ہر بات سے عیاں ہے۔ حاضرین میں ہر طبقے کے لوگ موجود تھے۔ ایک اور بات دیکھ کر طبیعت کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ ہے گداگروں کی کمی۔ صرف چار یا پانچ گداگر نظر آئے۔ ورنہ جتنا بڑا یہ مذہبی اجتماع تھا پاکستان کے تناسب کے مطابق یہاں سینکڑوں گداگر ہونے چاہیئے تھے۔ مگر پورے تُرکی میں گداگری کم ہے۔ تُرک محنت کو گداگری پر ترجیح دیتا ہے۔ اور جو گداگر ہے وہ یقیناً مستحق ہے۔ مجھے اس موقع پر قاہرہ یاد آیا۔ قاہرہ گداگروں سے بھرا ہوا ہے۔ اچھا بھلا تنومند آدمی آپ کے پاس ہاتھ پھیلا کر کہے گا اللہ یودیك المطلوب یا عمّی (چچا، اللہ تیری مُراد پوری کرے گا)۔ کچھ عنایت ہو۔ اور اگر آپ نے "اللہ کریم" اور "اللہ یُعطیک" کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی تو وہ آپ کے کپڑوں کو ہاتھ لگا لگا کر الحاح جاری رکھے گا۔ اس کی وجہ غربت بھی ہو سکتی ہے اور پیشہ ورانہ عادت بھی۔

نماز کے بعد تُرکی کا اسلامی ہفت روزہ "اتحاد" بکثرت بکا۔ بلکہ ایک صاحب نے اتحاد کا ایک پُورا انبار خرید لیا اور بیچنے والے لڑکے سے کہا کہ اسے لوگوں میں مفت تقسیم کرتے جاؤ۔ اتحاد کا یہ عید نمبر تھا اور اس میں کئی اِسلامی مضامین درج تھے۔

عید ملاپ

عید ملاپ کا طریقہ تمام اسلامی ممالک میں تقریباً یکساں ہے۔ عرب ممالک میں عید ملنے کا رواج یہ ہے کہ ایک دوسرے کو "من العائدین" (خدا کرے کہ آپ کو یہ عید بار بار نصیب ہو) یا "کل عام و انتم بخیر" (آپ کا ہر سال خیر و عافیت سے گزرے) کہیں گے۔ پاکستان اور ہندوستان میں مصافحہ اور معانقہ کا رواج ہے۔ ترکی میں مصافحہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی "بیرم مبارک" کہتے ہیں۔ جو شخص عید ملنے کے لیے آئے گا وہ بیرم مبارک اور علیک سلیک کے بعد محفل میں بیٹھ جاتے گا۔ مٹھائی اور قہوہ اُسے پیش کیا جائے گا، اور جب واپس جانے لگے گا تو صاحبِ خانہ کے رخسار کو بوسہ دے گا۔ سعودی عرب میں صاحبِ خانہ کی طرف سے رخصت ہونے والوں کے ہاتھوں پر خوشبو بھی لگائی جاتی ہے۔ صالح اوزجان صاحب ہوٹل میں آگئے اور مجھے ساتھ لے لیا تاکہ دوستوں سے عید ملنے کے لیے جائیں۔ میں نے بھی یہ موقع غنیمت سمجھا۔ لوگوں سے ملاقات بھی ہو گی۔ ترکی رسوم کا مشاہدہ بھی ہوگا اور حالات و نظریات کی جھلک بھی ملے گی۔ سب سے پہلے سعودی سفیر کے ہاں گئے۔ سعودی سفیر کے ہاں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ دو عرب خواتین بھی ملنے کے لیے آگئیں۔ سفیر صاحب اور تمام دوسرے اصحاب کے ساتھ انہوں نے مصافحہ کیا۔ صالح اوزجان اور میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ خواتین کو غالباً اور حاضرین کو بھی شاید ہماری یہ "رجعت پسندانہ" حرکت ناگوار گزری۔ سفیر صاحب نے خندۂ استہزا کے ساتھ اس کی فوری توجیہ یہ کر دی کہ "ہم دونوں شافعی ہیں" اس لیے اضطراراً عورتوں سے ہاتھ نہیں ملا

رہے۔ صالح اوزجان نے بعد میں مجھ سے پوچھا کہ کیا تم اس توجیہ کا مطلب سمجھ گئے تھے؟ اور پھر خود ہی بتانے لگے کہ شافعی مسلک کے مطابق اگر کوئی باوضو شخص عورت کو چھو لے تو اُس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی مسلک کا سہارا لیتے ہوئے سفیر صاحب نے حاضرین کو یہ تاثر دیا ہے کہ چونکہ ہم وضو سے ہیں، اور مسلکاً شافعی ہیں اس لیے وضو ٹوٹ جانے کے خطرے کی بنا پر عورتوں سے مصافحہ نہیں کر سکے۔" میں نے کہا کیا حنفی یا حنبلی مسلک میں غیر عورت سے ہاتھ ملانا جائز ہے؟ جدید تہذیب نے مسلمانوں کو جن روگوں میں مبتلا کر دیا ہے اُن سے قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ کہیں انسان بچ نکلتا ہے اور کہیں ملوّث ہو جاتا ہے۔ عید کے روز یہی دُعا دِل و زبان پر رہی کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے روزوں کو قبولیت و اجر سے نوازے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کروائے جو کیے کرائے پر پانی پھیر دے۔

ترکی کی کسان پارٹی کے نائب صدر اسماعیل حقّی بھی سعودی سفیر سے عید ملنے کے لیے آئے۔ عدالت پارٹی میں شامل تھے۔ مگر اب قوم پرستوں سے مل گئے ہیں۔ ترکی زبان میں اپنی نئی تصنیف انہوں نے سفیر صاحب کو پیش کی۔ اس کتاب میں انہوں نے بتایا ہے کہ یہودیوں نے کس طرح تُرکی کو نقصان پہنچایا ہے۔ فری میسن اور دیگر یہود نواز اداروں پر کتاب میں مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے۔ صالح اوزجان اسمٰعیل حقی کی گفتگو کا عربی ترجمہ کرتے رہے۔ اسی مناسبت سے ترکی کی تاریخ حاضر پر گفتگو چل نکلی۔ سفیر صاحب نے ایک نہایت پتے کی بات کہی وہ یہ کہ ترکوں کے مقابلے میں ہم نے انگریزوں سے مدد حاصل کی اور نتیجۃً ہم انگریزی استعمار کے

غلام ہو کر رہ گئے۔ اب پھر ہم اپنے داخلی مسائل حل کر لینے کے لیے روس کے ہاتھ میں تکمیل دے رہے ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ روسی سامراج مسلط ہو گیا تو اُس سے نجات پانے کے لیے کتنی مدّت درکار ہو گی۔

سعودی سفیر کے ہاں سے فارغ ہو کر انڈونیشی سفیر صاحب کے ہاں آ گئے۔ انڈونیشی سفیر بہت پکے مسلمان ہیں۔ بڑی بے تکلفی اور محبّت سے ملے۔ مجھے بتانے لگے کہ جکارتا میں میرا گھر ہے۔ وہاں میرے پاس مولانا مودودی کی تمام عربی تصانیف موجود ہیں۔ مَیں نے انہیں بار بار پڑھا ہے۔ یہاں انقرہ میں بھی اُن کے پاس مولانا محترم کی عربی کتابوں کا ایک سیٹ موجود ہے۔ بڑے برادرانہ انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ اور بار بار مولانا محترم سے عقیدت و محبّت کا اظہار کرتے رہے۔ مجھے تاکید کی کہ مَیں ہر نئی عربی کتاب سے انہیں مطلع کر دیا کروں۔ خریدنے کا انتظام وہ خود کر لیں گے۔ عیسائیت اور قادیانیت کے ردّ میں انہیں لٹریچر کی شدید ضرورت ہے۔ عربی میں ہو یا پھر بدرجۂ آخر انگریزی میں۔ عید کی چہل پہل پر انڈونیشی سفیر بھی بڑے خوش تھے۔ بتانے لگے کہ تُرکی کا نوجوان طبقہ نماز کی طرف خوب مائل ہو رہا ہے۔ انہوں نے محلّہ سفراء کی مسجد میں نماز پڑھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اُلٹرا ماڈرن لوگوں کا محلّہ ہے۔ مگر حاضری پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ دُور دُور تک سڑکیں رُک گئیں۔ سفیر صاحب کے بیان کے مطابق ان حاضرین میں ۷۰ فی صد نوجوان تھے۔ مولانا محترم کے دَورۂ تُرکی کے منتظر ہیں۔ اس بارے میں انہوں نے بعض تجاویز بھی مجھے نوٹ کروائیں۔ انڈونیشی سفیر کے ہاں سے نکل کر تونسی سفیر کا رُخ کیا۔ ان کا نام احمد بن عرفہ ہے۔ تونس کے مشہور امام و

محدث ابن عرفہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اپنی گفتگو میں اجتہاد اور روشن خیالی پر زور دیتے رہے۔ تونس اس وقت جس قدر "روشن خیال" ہو چکا ہے اُس کے بعد اب معلوم نہیں مزید کتنی روشن خیالی درکار ہے۔ صالح اوزجان صاحب حال ہی میں تونس کا دورہ کر کے آئے ہیں اور تونس کی بے حیائی اور اخلاقی انحطاط کا ذکر کرتے وقت کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ یہ سب اُسی روشن خیالی اور اجتہاد کی برکت ہے جس کی مزید ضرورت کا اظہار سفیر صاحب نے کیا۔ سفیر صاحب خود ہی کہنے لگے کہ مَیں نے اسلام کا بنیادی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ میرے لیے ایسی کتابیں تجویز کی جائیں جو اسلام کو سمجھنے میں مدد دیں۔ ان ملاقاتوں کے اصل خواہش مند صالح اوزجان تھے۔ مَیں تو صرف عید گزارنے کے لیے ان کے ساتھ منسلک تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے الگیہ یکلچرل انجینئر استاد احمد کے ہاں کھایا۔ موصوف نے بتایا کہ وہ ترکی کو چھوڑ کر مکہ معظمہ جانا چاہتے ہیں۔ وہاں اپنی ملازمت کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ مَیں نے عرض کیا کہ ترکی میں حق اور باطل کی جو کشمکش برپا ہے اُسے چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔ بتانے لگے میری بچیاں جوان ہو رہی ہیں، موجودہ ماحول کے اندر ان کی اِسلامی تربیت نہیں کی جا سکتی۔

عید کے بعد برلن ہوٹل چھوڑ کر صالح اوزجان صاحب کے مکان پر منتقل ہو گیا جو انقرہ سے ۱۵۔۲۰ میل دُور سنجان نامی آبادی میں واقع ہے اور ان کا دفتر اور مکتبہ انقرہ میں ہے۔ بڑے درویش آدمی ہیں۔ ان کا مکان بھی نہایت تنگ اور سادہ سا ہے۔ بارشوں کی وجہ سے راستہ کیچڑ سے اَٹا ہوا اور خاصا دشوار گزار۔ بس سے اُتر کر جب گھر کے قریب پہنچے تو صالح اوزجان نے میرا سامان بامرار اپنے سر پر اُٹھا لیا۔

ان کی یہ محبت اور روشِ عشقی کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ڈاکٹر ہیں۔ ماہنامہ ہلال کے ایڈیٹر ہیں۔ ایک اچھے اسلامی مکتبے کے مالک ہیں۔ طب کا پیشہ کرتے تھے مگر اسلامی تحریک کی ضرورت کے پیشِ نظر پریکٹس چھوڑ دی اور اب شبانہ روز تحریک کی خدمت کے لیے وقف ہیں۔ جفاکشی اور تیز روی کے پیکر ہیں۔ مولانا محترم کو اپنا استاذ اور مُرشد کہتے ہیں۔

ترکی میں مولانا مودودی کی کتابوں کی اشاعت

شبِ سنجان بڑی مفید ثابت ہوئی۔ صالح اوزجان کے بچے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اب مَیں تھا اور صالح اوزجان۔ برف آمیز رات نے اپنے تاریک سائے پھیلا دیئے۔ سُرخ کھپریل کے چوکور چھوٹے چھوٹے مکانات پر سنّاٹا چھا گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا تو پُوری آبادی بحرِ ظلمات میں غرق پائی۔ کہیں اِکّادُکّا کسی روشندان سے بجلی کی روشنی جھلکتی۔ صالح اوزجان نے اپنے ہاتھ سے "امام بایلدی" (ایک تُرکی کھانا) تیار کیا اور ہم دونوں نے مِل کر کھایا۔ نمازِ عشاء کے بعد مَیں نے صالح اوزجان سے ایک سوال کر دیا جس کا جواب وہ آدھی رات تک دیتے رہے۔ میرا سوال یہ تھا کہ آج تک آپ نے ہماری کتنی کتابیں شائع کی ہیں اور ان کی رفتارِ اشاعت کیا ہے؟ صالح صاحب نے جواب کا آغاز اس تمہید سے کیا کہ تمہیں معلوم ہے مَیں نے مولانا مودودی کی کتابوں کے ترجمے اور اُن کی طباعت کا کام اُن حالات میں شروع کیا تھا جب یہاں کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ کوئی اسلامی کتاب چھاپے۔ آج سے ۱۲ سال قبل تک ترکی پر وہ ہولناک فضا طاری تھی جو مصطفیٰ کمال کے عہد سے چلی آ رہی تھی۔ عدنان مندریس نے پہلی مرتبہ مذہب کو تھوڑی بہت آزادی

دی اور ہم لوگوں نے اپنے کام کی داغ بیل ڈالی۔ مگر اس کے باوجود کسی ایسی کتاب کو چھاپنا جو اسلام کے سیاسی اور دستوری نظام سے بحث کرے محال تھا۔ اور اگر ایسی کتاب چھاپ دی جائے تو ناشر کو خطرہ رہتا تھا کہ وہ ضبط کر لی جائے گی اور ناشر جیل کی ہوا کھائے گا۔ ۱۹۵۶ء میں ہم نے پہلی مرتبہ مولانا محترم کا ایک چھوٹا سا رسالہ "کلمہ طیبہ کے معنی"[1] دس ہزار چھاپا۔ اس کے بعد لوگوں کی طرف سے اس مصنف کی مزید تحریروں کی مانگ پیدا ہوئی۔ چنانچہ ۵۷ء میں ہم نے "دین حق" نامی پمفلٹ ۵ ہزار شائع کیا۔ دین حق کی اشاعت سے ہمارے حوصلوں میں بے حد اضافہ ہوا کیونکہ اسے پڑھے لکھے طبقے نے بڑا پسند کیا اور سرگوشیوں کے انداز میں جا بجا محفلوں میں ہمیں مبارک باد دی گئی۔ ہمارے پاس وسائل بہت کم تھے۔ میں تنہا اپنی جیب سے جو کچھ بنتا خرچ کرتا تھا۔ اسی زمانے میں مَیں نے اپنا ماہنامہ "سلام" جاری کر لیا تھا۔ موجودہ ماہنامہ "ہلال" اسی کا جانشین ہے۔ اپنے ماہنامے میں مَیں نے بعض مضامین شائع کیے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ مجھ پر بارہا ان کتابوں کے چھاپنے پر مقدمات دائر ہوئے مگر الحمد للہ ہم ان مقدمات میں کامیاب ہوتے رہے۔ ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ ہم پر دوبارہ سختیوں کا پیغام لے کر آگیا اور ہماری فکری تحریک کی رفتار ماند پڑ گئی۔ اب دوبارہ ہماری کوششیں بحال ہو رہی ہیں اور ہم تہیہ کر چکے ہیں کہ ترکی میں اسلامی فکر میں جو کمزوری پائی جاتی ہے اُسے دُور کریں۔ ترکی ان دنوں سخت دھچکوں سے دوچار ہے مگر ہمیں یا ہیں ہم

---

[1] خطبات کی ایک تقریر۔

اپنے کارواں کو آگے نکالنے کے لیے ہر طرح کی بازی لگانی ہے۔

صالح اوزجان جب بات کرتے ہیں تو ان کا چہرہ اُن کے اندرونی تلاطم کی مکمل غمازی کرتا رہتا ہے۔ بالعموم وہ ہنس ہنس کر بات کرتے ہیں۔ ان کی پیشانی پر ہمیشہ خندہ روئی بکھری رہتی ہے۔ اپنے بارہ سالہ کام کی رُوداد سُناتے وقت بے انتہا خوشی کا اظہار کرتے جاتے تھے۔ اس بات کی خوشی کہ موجوں کی ہزار کشاکش کے باوجود وہ سفینۂ دعوت کو آگے ہی بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک ہماری جو کتابیں شائع کی ہیں، ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔ کلمۂ طیبہ کے معنی۔ دو ایڈیشن۔ ہر ایڈیشن دس ہزار

۲۔ دینِ حق

۳۔ اِسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟

۴۔ سُود

۵۔ تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں۔

۶۔ اِسلام کا نظامِ حیات

۷۔ اسلام کا اقتصادی نظام

۸۔ اسلام کا سیاسی نظام

۹۔ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

۱۰۔ رسالۂ دینیات

۱۱۔ تجدید و احیائے دین

۱۲۔ اِسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

یہ تو وہ کتابیں ہیں جو صالح اوزجان نے خود شائع کی ہیں۔ مگر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب ہماری جدّ وجہد سے مولانا محترم کی کتابوں کی خوب مانگ پیدا ہو گئی اور ہم نے اپنا راستہ لٹھ بھڑ کر ہموار کر لیا تو دوسرے کاروباری لوگوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور ہماری اجازت کے بغیر متعدد کتابیں شائع کر دیں۔ مثلاً ضبطِ ولادت، اسلام اور جدید معاشی نظریات اور جہاد فی سبیل اللہ دوسرے مکتبوں کی طرف سے چھپ چکی ہیں۔ صالح اوزجان اس بات پر مُصر تھے کہ میرے سوا یہاں کسی کو مولانا محترم کی کتابیں چھاپنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ مَیں دعوت کے نقطۂ نظر سے یہ کام کرتا ہوں اور دوسرے کاروباری ذہن کے ساتھ۔ صالح صاحب نے بتایا کہ خلافت و ملوکیت کا ترجمہ ہو چکا ہے ، نظر ثانی ہو رہی ہے۔ "پردہ" کا جھگڑا جاری ہے[1]۔ تنقیحات زیرِ ترجمہ ہے۔ تفہیم القرآن بالاقساط ماہنامہ ہلال میں شائع ہو رہی ہے۔

راقم الحروف نے چند فقروں میں جو داستان زینتِ قرطاس کر دی ہے، اس کی تفصیلات دلچسپ بھی ہیں، حیرت انگیز اور المناک بھی۔ صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ صالح اوزجان ان کتابوں کی اشاعت کی وجہ سے مہینے میں کئی مرتبہ سیکورٹی پولیس کے دفتر اور عدالت میں طلب کیے جاتے ہیں[2]۔ مگر ہیں دھڑتے کے

---

[1] اس جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب یہ کتاب بھی صالح اوزجان ہی شائع کریں گے۔

[2] اب ان پر نیا مقدمہ یہ قائم ہو چکا ہے کہ انہوں نے ماہ نامہ ہلال میں مولانا مودودی کا وہ مختصر سا پیغام چھاپ دیا تھا جو مولانا محترم نے قرآن مجید کے چودہ سو سالہ جشن منعقدہ راولپنڈی میں ڈاکٹر فضل الرحمان کو بھیجا تھا۔

مجاہد۔ جیل جا چکے ہیں۔ شہر بدر ہو چکے ہیں۔ ہر طرح سے زچ کیے جا چکے ہیں۔ مگر وہ اس عزم کے مالک ہیں کہ ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

جماعت کے لٹریچر کی اشاعت کے سلسلے میں صالح اوزجان صاحب نے یہ واقعہ بھی سُنایا کہ جب مَیں نے "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" پمفلٹ شائع کیا تو یہ طے کر چکا تھا کہ اگر اس کی خاطر جیل بھی جانا پڑے تو دریغ نہ کروں گا۔ اِس عزمِ صمیم کے ساتھ مَیں نے پُوری احتیاطی تدابیر کے ساتھ یہ پمفلٹ چھاپ کر تقسیم کر دیا۔ چھ ماہ بعد تُرکی کے اٹارنی جنرل کے علم میں جب یہ پمفلٹ آیا تو اُس نے ایک تقریب کے موقع پر مجھ سے کہا، صالح، اگر چھ ماہ کے اندر اندر یہ پمفلٹ میرے ہاتھ لگ جاتا تو مَیں اسے ضرور ضبط کرا دیتا، مگر تُرکی قانون کی رُو سے اگر کسی مطبوعہ چیز کو چھ ماہ گزر جائیں تو وہ قانون کی زد سے باہر ہو جاتا ہے[1]

---

[1] صالح اوزجان کے خلاف مقدمات کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ اب بیروت کے ہفت روزہ الشہاب سے ان پر مقدمات کی تازہ تفصیل ملی ہے۔ الشہاب لکھتا ہے: "صالح اوزجان پر ایک مقدمہ استنبول میں اور دوسرا انقرہ میں چل رہا ہے۔ ان پر الزام یہ ہے کہ انہوں نے سیّد قطب کی کتاب "المستقبل لهٰذا الدین" (اس دین کا مستقبل) کا ترکی ترجمہ شائع کیا ہے اور اس میں ایک مذہبی ریاست قائم (باقی صفحہ ۲۱۴ پر)

افکارِ نورسی

بدیع الزماں نورسی مرحوم صالح اوزجان سے بڑا مشفقانہ برتاؤ رکھتے تھے۔ ان کے جذبہ جہاد کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ صالح اوزجان نے نورسی مرحوم کو منہاج الانقلاب الاسلامی ("اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کا عربی ترجمہ) پڑھ کر سُنائی۔ مرحوم نے اسے بالاستیعاب سُن کر فرمایا: یہ کتاب میرے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ اِسے خوب پھیلاؤ۔ چنانچہ طلبائے نُور اسے نہایت اہتمام سے پڑھتے ہیں۔ صالح اوزجان کے بیان کے مطابق یہ کتاب طلبائے نور کا دستور العمل ہے۔ بدیع الزماں نورسی مرحوم کے شاگرد ان سے بے پناہ محبّت کرتے ہیں۔ مرحوم کے مواعظ اور مقولے اُن کے نوکِ زبان رہتے ہیں۔ صالح اوزجان نے مجھے مرحوم کے بے شمار شذرات سُنائے، جن

(بقیہ حاشیہ صـ۲۱۳ سے) کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ اس وقت کورٹ آف اپیل میں ہے۔ نچلی عدالت سے صالح اوزجان کے خلاف فیصلہ صادر ہو چکا ہے۔ جس کی رُو سے انہیں چھ ماہ قید اور چھ ماہ کی بلنگسر کے مقام پر جلاوطنی کی سزا سنائی گئی ہے۔ بلنگسر انقرہ سے ۳۶۰ میل دُور ہے۔ اُن کے خلاف اور بھی متعدد مقدمات چل رہے ہیں۔ ایک مولانا مودودی کا چودہ صد سالہ جشنِ قرآن سے متعلق ایک پیغام چھاپنے پر، اور مولانا مودودی کی ایک کتاب جہاد فی سبیل اللہ اور سیّد قطب کا الجہاد کے عنوان پر ایک مضمون چھاپنے کی وجہ سے (الشہاب یکم دسمبر ۱۹۶۹ء) دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو ثابت قدم اور سرفراز رکھے۔

میں سے چند ایک ابھی تک میرے ذہن میں گونج رہے ہیں:

- دین زندگی کی روح، اس کا نور اور اس کی بنیاد ہے۔
- ملّت اسلامی کا احیاء دین کے احیاء کے بغیر نہ ہو سکے گا۔
- یہ دَور مریض ہے، یہ انسان مریض ہے، اس کا علاج قرآنِ کریم کا اتباع ہے۔
- تفرقہ قبلہ کے اتحاد سے دُور ہو سکتا ہے اور قبلہ قرآن ہے۔
- یہ زمانہ طریقت کا زمانہ نہیں ہے بلکہ حقیقت کا زمانہ ہے، اور حقیقت تمام تر قرآن و سُنّت میں موجود ہے۔
- عہدِ حاضر کی تمام اسلامی تحریکیں ہماری جماعت ہیں۔ ہم میں اور اُن میں صرف طریقِ کار کا فرق ہے۔
- فرد فنا ہو جائے گا تحریک باقی رہے گی۔ شخصیت پرستی سے بچو۔ شخصیت تو وہ برف ہے۔ اس تودے کو جماعت کے حوض میں ڈال دو تاکہ سارا حوض اُس کی صفت سے متصف ہو جائے۔
- اگر یک جہتی اور مساوات ہو تو ایک کا ہندسہ تین بار برابر لکھنے سے ۱۱۱ بن جاتا ہے اور چار کا ہندسہ چار مرتبہ برابر لکھنے سے ۴۴۴۴ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر چار کے ہندسے کو چار مرتبہ اوپر نیچے کر کے لکھا جائے تو یہ چار صرف ۱۶ بن کر رہ جائیں گے۔ جب کہ پہلی صورت میں یہ چار ہزار چار سو چوالیس تھے۔ پہلی

صورت یک جہتی اور ہم آہنگی اور ہمقدمی سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری اُونچ نیچ سے۔

- اگر آپ اپنے بھائی کو بات کرنے کا موقع دیں گے تو آپ خود بھی لذّت اندوز ہوں گے۔
- رفیقو، ہنگامہ پرور نہ بنو بلکہ افہام و تفہیم کو شعار بناؤ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے تعلیم و تفہیم کے ذریعہ یہ عظیم انقلاب برپا کیا تھا۔
- دارارقم وہ پہلا مدرسہ تھا جس میں چرواہے، ساربان اور غلام داخل ہوئے اور دنیا کے قائد بن کر نکلے۔ یہ تعلیمی طریقِ کار کا کرشمہ تھا۔"

مَیں نے صالح اوزجان سے کہا کہ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ نورسی مرحوم کی تعلیمات کو دوسری زبانوں میں منتقل کریں اور عالمِ اسلامی کی دوسری اسلامی تحریکوں کو بھی اُن سے روشناس کرائیں۔ جواب ملا کہ ہم مولانا محترم کی تعلیمات کو ترکی میں عام کر رہے ہیں، آپ نورسی کے افکار سے اہلِ پاکستان کو متعارف کرائیں۔ مَیں چُپ ہو گیا کہ جواب تو خوب ہے مگر ؎

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

دیارِ سلاجقہ و رُومی

سفرِ قونیہ

آج دل کی قدیم آرزو پوری ہو رہی ہے۔ مثنوی مولانا روم بڑی عقیدت و شیفتگی سے پڑھی تھی۔ "بشنو از نے چوں حکایت میکند" میں اپنی ہی فطرت کی صدا سنائی دیتی تھی۔ ناشتہ کے دوران صالح اوزجان نے تجویز کر دیا کہ میں مولانا رومی کے شہر قونیہ جاؤں۔ وہاں طلبائے نور کا نہایت مضبوط مرکز ہے اُن سے ملاقات مفید رہے گی۔ صالح اوزجان نے ٹیلیفون سے قونیہ کے ذمہ دار رفیق کو میری آمد کی اطلاع کر دی۔ مکان سے باہر نکلے تو بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سردی گو شدت اختیار کر چکی تھی مگر لطافت آمیز ہو رہی تھی۔ سفر بذریعہ بس تھا۔ مگر پریشانی اس لیے نہ تھی کہ ترکی بسوں کو اندر سے گرم رکھا جاتا ہے اور سیٹیں ریزرو ہوتی ہیں۔ صالح اوزجان کے دو ساتھی مسٹر کمال الدین اور محمد نجاتی میرے رفیقِ سفر تھے۔ اوّل الذکر انگریزی خوب جانتے ہیں اور ثانی الذکر عربی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ دونوں نوری تحریک کے شیدائی ہیں۔ اور بڑے متحرک اور سرگرم کارکن ہیں۔

ترکی میں چار شہروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انقرہ، استنبول، بورصہ اور قونیہ۔ استنبول کی فتح سے پہلے عثمانیوں کا دار الحکومت بورصہ تھا۔ اور

قونیہ سلاجقہ روم کا دارالحکومت تھا۔ انقرہ سے قونیہ ۱۵۶ میل ہے۔ تاریخ کا یہ عجب فیصلہ ہے کہ قونیہ سلاجقہ روم کی عظیم سلطنت کا تین سو سال (۱۰۷۷ء سے ۱۳۰۰ء) تک مرکز رہا مگر آج اُس کی شہرت مسعود بن قلیج ارسلان کی وجہ سے نہیں جس نے قونیہ کو سلجوقیوں کا دارالحکومت بنایا، نہ غیاث الدین کیخسرو اوّل کی وجہ سے ہے جس نے بازنطینیوں سے کامیاب جنگیں لڑ کر انطاکیہ کو قلمرو اسلام میں شامل کرلیا، اور نہ عزالدین کیکاؤس اور علاؤالدین کیقباد کی بدولت ہے جن کا دورِ حکمرانی سلاجقہ روم کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے بلکہ اُس کی شہرت ایک دلق پوش اور بوریا نشین صوفی جلال الدین رُومیؒ کی وجہ سے ہے جس کا مزار آج بھی قونیہ میں مرجع خلائق ہے اور رومی کی عظمت و رفعت کا دنیا کے اندر صدیوں سے نقش ثبت کر رہا ہے۔ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

راستے کے مناظر

بارش نہ ہوتی تو ہم انقرہ سے قونیہ تین گھنٹوں میں پہنچ جاتے۔ سڑک بہت عمدہ ہے جو ۱۹۳۹ء تک موجود نہ تھی۔ ترکی ڈرائیور اُس رفتار کی اہتمام سے پابندی کرتا رہا جو سڑک کے کنارے جگہ جگہ تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔ جدّہ اور مکّہ یا ریاض اور طائف کے درمیان سفر کرتے وقت سو سو کیلومیٹر بھی گزر جائیں تو آبادی نہیں ملتی۔ مگر ترکی آباد ملک ہے۔ قونیہ کے راستے میں جگہ جگہ آبادیاں ہیں، انسانوں کی آمد و رفت ہے، طعام گاہیں اور تفریح گاہیں ہیں، سیاحوں کے خیمے اور

استراحت کے ہوٹل ہیں، کچھ دُور تک طویل پہاڑی سلسلہ ملے گا جس کے دامن شاداب اور سبز پوش ہیں۔ کھیت اور باغات ہیں۔ کلّہ کوہ کو دیکھیں تو وہ برف کی سفید چادر اوڑھے ہوتے ہے اور دامنِ کوہ پر نظر ڈالیں تو کھیتوں کی سبز و خوش رنگ چادر بچھی ہوئی۔ شکر پنجراسے لدے ہوئے ٹرک بار بار ہماری بس سے آگے نکلتے۔ تُرک شکر پنجراسے چینی پیدا کرتے ہیں اور یہ ٹرک چینی کے کارخانوں کی طرف جا رہے ہیں۔ کمالی دَور میں زراعت پر جو غیر معمولی توجہ دی گئی تھی اور جنگلات کی افزائش کی جو زبردست تحریک چلائی گئی تھی وہ اب بھی برق رفتار سے جاری ہے۔ زراعت کی موجودہ ترقی میں مشینی آلات کو دخل حاصل ہے۔ یہ بھاری بھرکم امریکی اور فرانسیسی ٹریکٹر جو سڑک کے اِردگرد چلتے نظر آتے ہیں عثمانیوں کے دَور میں نہ تھے۔ راستے میں ہم اناطولیہ کے "قلبِ مُردہ" میں سے گزرتے ہیں۔ پھر اک کھاری پانی کی جھیل آتی ہے جسے ترغولو کہتے ہیں اس میں سے نمک بھی نِکالا جاتا ہے۔

تُرک خانم

اپنے تُرک دوستوں سے استنبول اور انقرہ میں یہ سُن چکا تھا کہ تُرکی کی دیہاتی عورت بڑی خوبیوں کی مالک ہے۔ انقرہ اور قونیہ کے دیہات میں وسطِ ایشیا سے آنے والے تُرکوں کا خالص خون موجود ہے۔ تُرکی کی دیہاتی عورت ابھی تک وہی ڈھیلا ڈھالا اور تہ بہ تہ لباس پہنتی ہے جو وہ صدیوں سے پہنتی چلی آرہی ہے۔ اُس کا صرف چہرہ اور ہاتھ ننگے ہوں گے۔ مگر جب وہ غیر مرد کا سامنا کرے گی تو مُنہ چھپالے گی یا دوسری طرف پھیر لے گی۔ اس کا لباس کاشت یا

کٹائی میں مردوں سے تعاون کرنے میں حائل نہیں ہوتا۔ راستے میں ایک مقام پر بس کھڑی ہوگئی۔ باہر ترک عورتوں کا ایک گروہ کسی کام کے سلسلے میں جمع تھا۔ سب نے ایک سا لباس پہن رکھا تھا۔ بعض عورتوں نے چہروں کے اُوپر بھی ایسا سیاہ رومال باندھ رکھا تھا جس سے صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ مَیں نے مسٹر کمال الدّین سے پُوچھا کہ یہ لباس سن رسیدہ عورتیں ہی پہنتی ہیں یا جوان لڑکیاں بھی۔ مسٹر کمال الدّین نے بتایا کہ اکثر نوجوان لڑکیاں بھی اِسی لباس کی پابندی کرتی ہیں۔ مگر قصبوں میں رہنے والی لڑکیاں اسکرٹ پہنتی ہیں اور جی میں آئے تو سر پر ایک رُومال باندھ لیتی ہیں۔ مسٹر کمال الدین نے بتایا کہ مصطفٰے کمال کی یہ "اصلاح" کہ عورتیں حجاب ترک کر دیں شہروں اور قصبوں تک محدود رہی۔ اناطولیہ (اناضول) کی دیہاتی آبادیاں اس سے متاثر نہیں ہو سکیں۔ دیہات کے لوگ جب شہروں میں آتے ہیں تو وہ عورتوں کے عُریاں اور نیم عریاں لباس دیکھ کر سخت چیں بجبیں ہوتے ہیں۔ مسٹر کمال نے بتایا کہ ان کے ایک عزیز انقرہ آئے، اور دو روز بمشکل گزارنے کے بعد واپس گاؤں چلے گئے۔ کیونکہ انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ انقرہ کی عُریانی خدا کے غضب کو دعوت دے رہی ہے۔ مسٹر کمال الدین کے بیان کردہ حجابی نمونے راستہ بھر نظر آتے رہے۔ دیہاتی عورت کے بارے میں مجموعی طور پر یہی تأثر قائم ہوا کہ یہ فی الواقع موم کی ناک نہیں ہے۔ قانون کے ذریعے اسے بے نقاب کرنے والے شکست کھا گئے ہیں مگر اس نے شکست نہیں کھائی۔ تُرک دیہاتی عورت کے اندر یہ احساس بہت گہرا ہے کہ وہ ترکمان ہے۔ اس کے اسلاف وسطِ ایشیا سے اُٹھ کر یہاں آئے اور حکومت کرتے رہے ہیں۔ اس کے آباؤ

اجداد نے بازنطینی طاقتوں کو سرنگوں کیا ہے۔ صلیبی حملہ آوروں کا منہ توڑا ہے۔ وہ غازی عثمان کی بیٹی ہے وہ آل سلجوق کی نشانی ہے۔ وہ اس قوم سے تعلق رکھتی ہے جس نے یورپ اور ایشیا کے بہت بڑے حصّہ پر حکومت کی ہے۔ اور کسی بیرونی طاقت کی غلامی اُس نے نہیں کی۔ وہ آج بھی اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ اپنے قومی اور نسلی خصائل و عادات کو بچوں کے اندر کُوٹ کُوٹ کر بھر دے۔

عمامہ۔ ٹوپی اور ہیٹ

۴۵۔۵۰ برس کا ایک تُرک میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھی پچھلی سیٹوں پر اپنے بعض جاننے والوں کے پاس چلے گئے۔ تُرک نے اپنی زبان میں لگاتار اظہارِ خیال کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ دیکھ کر کہ مَیں اس کی بات کو نہیں سمجھ رہا ہوں اُس نے اشاروں سے باتیں شروع کر دیں۔ کسی قصبے کا معمولی پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے میری ٹوپی (سیاہ رنگ کی قراقلی) اُتار لی اور اپنے سر پر رکھ لی۔ اور بڑی خوشی کا اظہار کیا اور میری ٹوپی کو خوب داد دی۔ پھر میری گرم شیروانی کو بھی "عقیدت" سے چھُونے لگا۔ یہاں تک تو مَیں یہ سمجھا کہ وہ مجھے یہ بتانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا لباس اُسے پسند ہے یا اُسے ایسی ٹوپی اور شیروانی درکار ہے۔ مگر اس ایجابی انداز کے بعد اُس نے اب سلبی اسلوب بھی اختیار کیا۔ اُس نے اپنی کنارہ دار فوجی طرز کی ٹوپی سر سے اُتاری اور اُسے بڑی غضب آلود نگاہوں کے ساتھ ہاتھوں میں مسلنے لگا۔ اُس کے ٹوپی کو بار بار جھٹکنے سے مَیں سمجھ گیا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سرپوش جو ہمارے سروں پر جبراً ٹھونسا گیا ہے یہ اُسے سخت

ناپسند ہے اور اُس کا بس چلے تو آج ہی اِسے تُرکی سے دیس نکالا دے دے۔ مَیں نے دیکھا کہ کوئی تُرک مسجد کے اندر سرپوش (خواہ وہ ہیٹ ہو یا کپڑے کی فوجی ٹوپی) لے کر نہیں جاتا۔ بلکہ اُسے مسجد کے دروازے پر محافظ کے حوالے کر دے گا اور نماز کے لیے سر پر سبز رنگ کی کپڑے کی بنی ہوئی ٹوپی اوڑھ لے گا۔ ایک مرتبہ انقرہ میں ایک صاحب سرپوش سمیت مسجد میں داخل ہو گئے۔ اس پر محمد نجاتی صاحب نے (جو میرے رفیقِ سفر ہیں) بڑا واویلا کیا۔ مَیں نے کہا یہ معمولی بات ہے۔ کہنے لگے جسے آپ معمولی سمجھتے ہیں وہ ہمارے ہاں کا بڑا نازک مسئلہ ہے۔ تُرکی میں سرپوش کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ غازی اُورخاں (غازی عثمان خاں کے لڑکے) نے مجاہدین کی ایک خصوصی فوج تیار کی اور اپنے عہد کے ایک صوفی بزرگ شیخ بکتاش سے درخواست کی کہ وہ مجاہدین کی اس فوج کے لیے دعا فرمائیں۔ شیخ بکتاش نے پہلے دُعا مانگی اور پھر اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین ایک سپاہی کے سر پر ڈالی اور فرمایا: "اس فوج کا نام نیکیتی چری (نئی فوج) رکھا جائے۔ خدا اس فوج کو سُرخ رو رکھے، اس کے بازو مضبوط، اس کی شمشیر قاطع اور اس کے نیزے بُرکار رہیں۔ اور یہ کامیاب و کامران لوٹا کرے۔" نیکیتی چری بعد میں ینی چری سے تبدیل ہو گیا۔

فوج کے سپہ سالار امیر علاؤ الدین نے شیخ بکتاش کی بابرکت آستین کی یاد تازہ رکھنے کے لیے فوجیوں کے سروں کے عمامے پر شملے کا اضافہ کر دیا۔ بعد میں اس نوعیت کے عماموں کا رواج علماء اور فقہاء اور اعیانِ حکومت میں بھی پھیل گیا۔ سُلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء - ۱۸۳۹ء) نے جب ینی چری کی مسلسل بغاوتوں

اور خرابیوں سے تنگ آ کر اس کا خاتمہ کر دیا تو یہ عمامہ بھی تبدیل کر دیا اور اُس کی جگہ لال تُرکی ٹوپی کو رواج دیا۔ البتہ شیخ بکتاش کی آستین کی یاد تازہ رکھنے والے شملے کی جگہ تُرکی ٹوپی کے اُوپر پھندنے کا اضافہ کر دیا۔ بعض اربابِ تحقیق یہ بیان کرتے ہیں کہ ینی چری کا سفید عمامہ " اخی تحریک " کا شعار تھا۔ یہ تحریک اناطولیہ کے تُرکوں کے اندر بھائی چارہ اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے علماء اور صوفیاء نے جاری کی تھی (عثمان خاں بھی اس کا ایک رُکن تھا۔ یہ تحریک اُس دَور کی صحیح اسلامی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کے اندر جہاد کی رُوح پھونکی۔ غازی عثمان خاں نے تحریک کے سفید عمامے یا سفید ٹوپی کو ینی چری کا سرپوش قرار دیا۔ بہر حال سلطان محمود ثانی کے بعد عمامے کے بجائے لال ترکی ٹوپی جاری ہوئی جسے ہمارے ہاں فیض کیپ (صحیح نام ہے فاس کیپ) کہا جاتا ہے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۳۵ء کو مصطفٰے کمال نے ایک قانون جاری کر کے تُرکی ٹوپی کو ممنوع قرار دے دیا اور ہیٹ پہننے کا حکم دے دیا۔ اب سمجھ میں آگیا کہ محمد نجاتی کے نزدیک سرپوش کا مسئلہ کیوں نازک اور جذباتی ہے۔

اپنی روایتی ٹوپی سے ترکوں کے لیے دست بردار ہو جانا آسان نہ تھا۔ یہ ایک گول، بے کنارہ اور تقریباً مخروطی ٹوپی تھی۔ نماز ادا کرتے وقت سجدے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی، اور پیشانی بے تکلف زمین پر رکھی جا سکتی ہے۔ اتاترک کی رائے تھی کہ یہ قدیم اسلامی رواجوں کا نشان ہے اور وہ ترکوں کو ایسے نشانوں سے الگ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ پھر وہ اور چند افسر قسطمونی گئے جسے قدامت پسندی میں خاص شہرت حاصل تھی۔ خود اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے

ہیٹ پہن رکھے تھے۔ اتاترک نے خوف زدہ اہلِ شہر سے کہا: دیکھو، میں تمہارے لیے عمدہ تحفے لے کر آیا ہوں۔ یہ ہیٹ ہیں اور تُرکی ٹوپی کے مقابلے میں دھوپ سے بچاؤ کا بدرجہا بہتر ذریعہ ہیں۔ اس اعلان کے بعد یہ تحفہ زبردستی لوگوں کے سروں پر ٹھونسنے کا حکم جاری ہوا۔ اناطولیہ میں ہیٹ پہن لینے کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مذہب چھوڑ دیا ہے۔ سالوں تک حکومت کی پروپگنڈا مشینری یہ ثابت کرتی رہی کہ تُرکی ٹوپی حقیقتاً تُرکی نہیں ہے بلکہ اہلِ وینس سے لی گئی ہے تاکہ غیر موزوں اور بوجھل دستار کی جگہ لے سکے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ روپے اور طاقت کے بے پناہ استعمال کے باوجود اناطولیہ کا یہ تُرک جو مجھ سے متعارف بھی نہیں تھا ہیٹ اور فوجی سرپوش سے بے پناہ نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔

اتاترک کے مجسّمے

انقرہ اور استنبول میں اتاترک کے مجسمے دیکھ کر میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف شہروں تک محدود ہیں، مگر انقرہ سے لے کر قونیہ تک ڈیڑھ سو میل کے سفر کے دَوران کوئی قابلِ ذکر جگہ ایسی نہ تھی جہاں اتاترک کا مجسّمہ نصب نہ ہو۔ کہیں کسی سیاہ رنگ کی دھات کا مجسّمہ اور کہیں پتھر کا۔ بلا مبالغہ یہ مجسّمے سینکڑوں ہوں گے اور خدا معلوم "جمہوریہ ترکیہ" کے خزانے میں سے عوام کی "بہبود" کے لیے ان مجسّموں پر کتنا روپیہ صَرف کیا گیا ہوگا۔ مَیں تو صرف ڈیڑھ سو میل کے ایک ٹکڑے کی بات کر رہا ہوں۔ اناطولیہ کی دوسری سڑکوں کی حالت کیا اس سے مختلف ہوگی؟ مَیں نے اپنے رفیق محمد نجاتی سے اس پر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ نجاتی صاحب نے بتایا کہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اتاترک نے اِس پورے علاقے میں تحریکِ

آزادی کی قیادت کی ہے۔ اور ۱۹۳۷ء تک وہ کامیاب غازی کی حیثیت سے متعارف رہا ہے۔ اس لیے اس خطّے میں شروع شروع میں اُسے خوب مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جس فوجی جرنیل کو اتاترک نے اس علاقے کا گورنر بنایا تھا وہ سخت مغرب زدہ اور اتاترک کا زبردست حامی اور معتقد اور وفادار تھا۔ یہ مجسّمے اُسی نے جگہ جگہ نصب کروائے ہیں۔

محمد سُبحانی صاحب سے یہ بھی پتہ چلا کہ غازی اتاترک نے اپنے مجسّمے ترشوانے کے لیے خاص طور پر جرمنی کے مجسّمہ سازوں کی خدمات حاصل کیں۔ اور متعدد قوی ہیکل مجسّمے تراش کر تمام شہروں میں نصب کیے گئے اور انہیں سلامی دی گئی۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ ترکی فنونِ لطیفہ کو ترقی دے رہا ہے۔ عثمانیوں نے صرف فنِ تعمیر یا کتابوں کی جلد سازی پر توجہ دی تھی (حالانکہ یہ غلط ہے) اور ہم اس میں ہمہ جہت ترقی کر رہے ہیں۔ نیز ترکی کے مذہب پرست عناصر پر یہ واضح کر دینا مقصود تھا کہ جدید ثقافت اسلام کے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرے گی کہ بُت تراشی اور بُت پرستی حرام ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد جب عدنان مندریس برسرِ اقتدار آیا تو لوگوں نے یکایک اِن مجسّموں پر حملہ کر دیا اور اُن میں سے کئی ایک توڑ ڈالے یا اُن کی توہین کی۔ اس پر حکومت کو مجسّموں کے احترام کے لیے خاص قانون نافذ کرنا پڑا جو اب تک نافذ العمل ہے۔

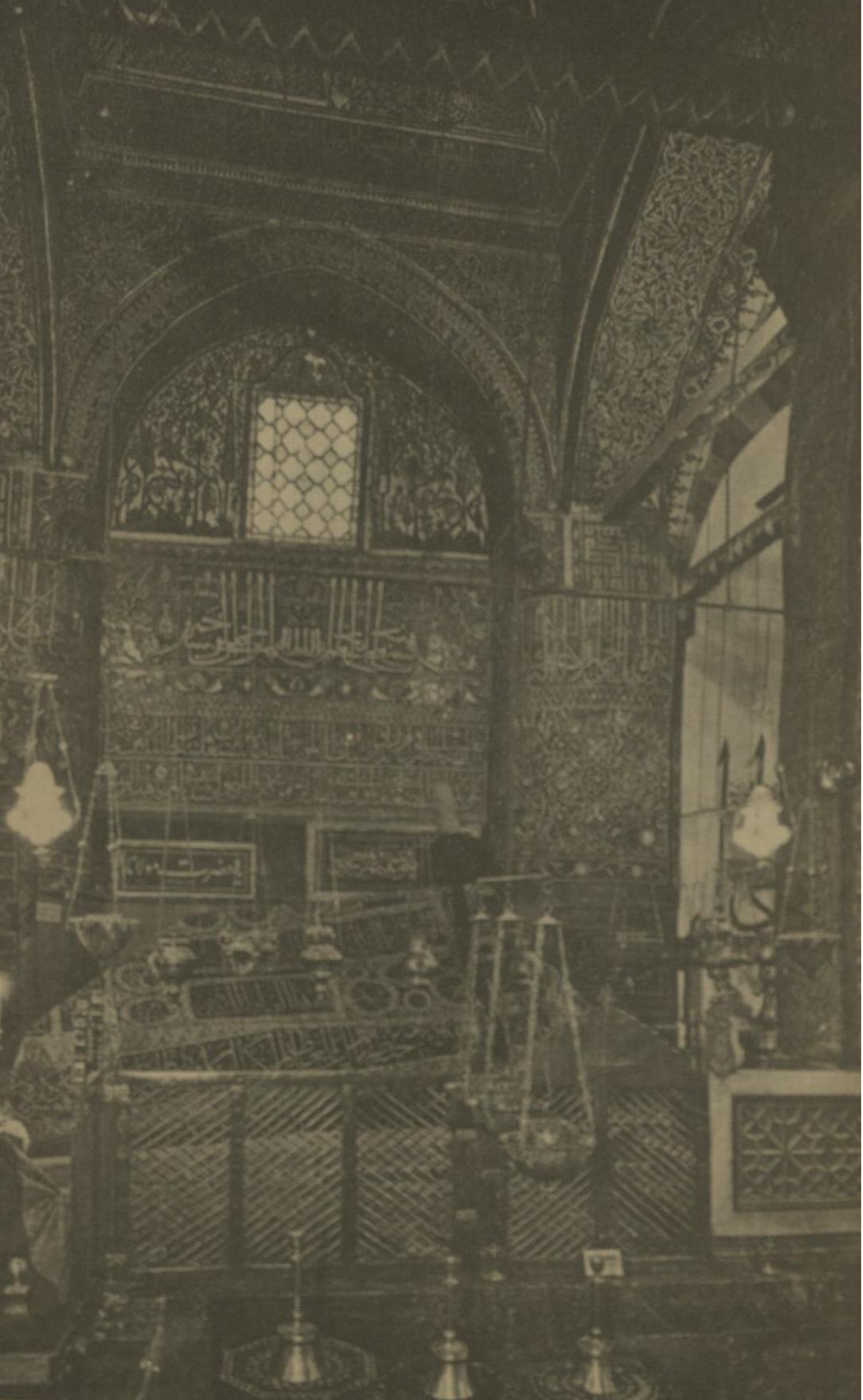
قونیہ کے راستے میں جہاں جہاں آبادیاں ہیں مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو ڈرائیور نے ایک ایسے مقام پر بس روک دی جہاں مسجد سڑک کے بالکل قریب تھی۔ بس کے بعض مسافروں نے ہمارے ساتھ مِل کر

مسجد میں نماز ادا کی۔ میں نے دیکھا کہ ترک ہر نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جرابوں پر مسح نہ خود کرتے ہیں، نہ دوسرے کے مسح کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ سخت سردی کے اندر یخ بستہ پانی سے وضو کریں گے مگر جرابوں پر ہرگز مسح نہ کریں گے، خواہ وہ کتنی ہی موٹی کیوں نہ ہوں۔ عصر کی نماز بھی ہم نے راستے ہی میں ادا کی۔ مغرب سے ایک گھنٹہ قبل ہم قونیہ میں داخل ہوئے۔

قونیہ میں داخل ہونے سے پیشتر یکایک نگاہیں ایسی قدیم عمارات پر پڑتی ہیں جو استنبول کی تاریخی عمارات سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ یہ سلجوقی عمارات ہیں۔ اپنے زمانے میں یہ سرائیں تھیں یا اسلامی مدرسے تھے۔ سلجوقیوں کے دور میں شہر کے ارد گرد نگرانی کے لیے بلند برج بنے ہوتے تھے جن پر چوکیدار پہرہ دیتے تھے۔ شہر کے ارد گرد فصیل بنی ہوئی ہے جس میں داخلے کے دروازے تنگ ہیں۔ بسوں کے اڈے میں اتر کر ہم پیدل چلتے رہے اور قونیہ کی نوری تحریک کے ایک ممتاز کارکن کی بیکری میں چلے گئے۔ مغرب کے بعد مولانا روم کا مزار بند ہو جاتا ہے اس لیے ہمارے میزبان نے تجویز کیا کہ مولانا کی قبر پر فاتحہ پڑھ لی جائے اور ان کا عجائب گھر دیکھ لیا جائے۔

تربتِ رومی

مزار کے زائرین کی اکثریت یورپی سیاحوں پر مشتمل تھی۔ اور وہ روحانی عقیدت کے اظہار کے بجائے فنِ تعمیر اور تاریخی آثار و تبرکات میں منہمک رہے۔ مولانا روم کی قبر، ان کے والد، اور ان کے خلفاء، اور دوسرے سلجوقی بزرگوں کی قبریں بہت وسیع و عریض عمارت کے اندر ہیں جن کے پہلوؤں میں حجرے بنے



مزار مولانا رومؒ کا اندرونی منظر ۔ قونیہ

ہوتے ہیں۔ بیرونی صدر دروازے کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں: "حضرت مولانا"
تُرک جب مولانا کہیں گے تو اس سے اُن کا اشارہ مولانا رومی کی طرف ہو گا
اور مولوی سے اُن کی مراد مولانا رُومی کے مریدین ہوتے ہیں۔ مولانا رومی کے
سلسلۂ تصوّف کو طریقۂ مولویہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ علماء کے لیے تُرک مولانا یا
مولوی کے لفظ کے بجائے "حضرت" کہیں گے۔ چنانچہ میں پُورے قیامِ تُرکی میں
"حضرت مودودی" کا لفظ سنتا رہا ہوں۔ جیسے سعودی عرب میں "شیخ مودودی"۔

تعلیماتِ رُومی اور راحی تحریک

حضرت علی ہجویریؒ نے جس طرح تعلیم و تزکیہ اور دعوت و ارشاد کی مہم جاری
کی تھی اُسی طرح مولانا رُومی نے بھی اپنے عہد میں اصلاح و تربیت کی تحریک
چلائی۔ مگر پیرو کاروں نے مرُورِ زمانہ سے دونوں بزرگوں کے بارے میں عقیدت
کے جذبات تو مبالغہ کی حد تک دکھائے مگر اصل دعوت کو فراموش کر دیا۔ مولانا
روم کی مثنوی جسے "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا گیا، کیا ہے؟ ایک دفترِ
بے پایاں ہے جس میں اسلامی اخلاق، رُوحانی اوصاف، معاشرتی آداب، حکمتِ
قرآن، حکیمانہ طرزِ اصلاح، جہاد و قتال، فرائضِ حکمرانی، دنیا پرستی سے نفرت،
صحیح علم، حقیقی معرفت، مقامِ عبدیت اور حقیقتِ توحید کا درس دیا گیا ہے۔
مولانا روم کی یہ تصنیف اُس ماحول کو سامنے رکھ کر پڑھنی چاہیئے جب اناطولیہ
میں سلجوقی سلطنت دم توڑ رہی تھی، تاتاری طوفان مشرقی اناطولیہ میں داخل ہو
چکا تھا۔ سلجوقی امراء آپس میں دست و گریباں تھے۔ اور مختلف امراء نے اپنی
چھوٹی چھوٹی مستقل ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ جن کی تعداد ۹ تک پہنچ چکی تھی۔

سلجوقیوں کے بعد اُبھرنے والی نئی اسلامی طاقت (ترکانِ عثمانی) ابھی میدانِ کار میں نہیں آئی تھی۔ اس داخلی سیاسی انتشار کے ہوتے ہوئے تاتاری طوفان کی یلغار نہ صرف مولانا رومی کو پریشان کر رہی تھی بلکہ ہر بہی خواہ ملت سراسیمگی میں مبتلا تھا۔ تاتاری حملوں سے ترکانِ اناطولیہ کو زبردست جانی، مالی اور روحانی نقصان پہنچ رہے تھے۔

مولانا رومی نے اپنے حکیمانہ مواعظ سے اناطولیہ میں جو اثرات چھوڑے انہیں کے نتیجہ میں بعد میں اخی تحریک کے نام سے اسلامی اتحاد کی زبردست تحریک برپا ہو گئی۔ صوفی سرداروں نے مذہبی رنگ دینے کے لیے اخی کا نام دیا۔ علماء اور صوفیائے کرام نے اس کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور روحانی اقدار کو بیدار کرنے کی مہم چلائی۔ سلجوقی زوال کے بعد یہ تحریک پورے اناطولیہ میں پھیل گئی۔ اور اس نے سماجی اور اقتصادی تنظیم کی شکل اختیار کر لی۔ عثمان خاں نے بھی اس میں شرکت کی۔ اس تحریک کے لوگ خود محنت کرتے، دوسروں کی مدد کرتے اور راہِ خدا میں تاتاریوں کے خلاف جہاد کرتے۔ اس تحریک کے باعث اتراکِ رُوم میں جان پڑ گئی اور عوام الناس کے مایوسی کے خیالات ختم ہو گئے۔ انقرہ کے علاقوں میں اس تحریک کی حکومت قائم ہو گئی۔ غازی عثمان خان اس تحریک کا ایک رکن تھا۔ بعد میں جب عثمان خان نے عثمانی سلطنت کی بنیاد رکھی تو اس تحریک نے اُس کے قیام میں نمایاں حصّہ لیا۔ بلکہ تحریک کے زیرِ اقتدار علاقے عثمانی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ اس عظیم الشان کارنامے کو نظر انداز کر کے مولانا رومی کی تعلیمات کو وجد و سماع اور رقص و نغمہ کی دعوت کہنا صحیح نہیں ہے۔ دمشق اور قونیہ میں



جامع سلیمیہ اور مزار مولانا روم رح (بائیں طرف)

مولوی طریقہ کے درویش آج تک جو رقص کرتے چلے آرہے ہیں وہ ان کی اپنی ایجاد ہے۔

رُومی عجائب گھر

مولانا روم کی قبر کی ساخت میں بھی اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ سرا اونچا ہو اور پائنیتی کا رُخ پست رہے۔ تمام قبریں ریشمی غلافوں سے مستور ہیں اور اُن پر سونے چاندی کے تاروں سے قرآن کریم کی آیات اور بیل بُوٹے کڑھے ہوتے ہیں۔ تمام قبروں کے سرہانے عمامے رکھے ہوتے ہیں۔ جن کے شملے نیچے لٹک رہے ہیں۔ مَیں نے اپنے ساتھیوں سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ دَورِ جہاد کا رواج ہے۔ صوفیاء، علماء اور مجاہدین اپنے کفن کا کپڑا عماموں کی شکل میں سر پر باندھے رکھتے تھے۔ مگر مرنے کے بعد اُن کے ورثاء اسے کفن کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے قبر کے اوپر رکھ دیتے تھے۔ راقم الحروف نے دمشق میں غازی صلاح الدین ایوّبی کی تُربت پر بھی غازیؒ کا عمامہ اِسی حالت میں رکھا ہوا دیکھا ہے۔ یہ تُربت جامع اموی کے پہلو میں واقع ہے۔ مولانا رومی کی تُربت کے پاس ہر وقت میوزک بجتا رہتا ہے۔ بجانے والا نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے ٹیپ ریکارڈر سے یہ خدمت لی جاتی ہو۔ اس میوزک میں مولانا رومی کی مثنوی کو بڑی سُریلی اور وجد آور دُھنوں میں ڈھال کر اندرونی ماحول کو مسحور کیا جاتا ہے۔ مقبرے کی ساخت اور اندرونی اور بیرونی نقوش کی ہم آہنگی بھی بڑی دِل آویز ہے۔ مولانا روم کا مقبرہ سلجوقی سلطان علاؤالدّین کیقباد نے تعمیر کروایا تھا۔

ملحقہ حجرے عجائب گھر کا کام دے رہے ہیں - پہلے یہ درویشوں کے مطالعہ و مراقبہ کے لیے وقف تھے - ایک چھوٹی سی مسجد بھی اندر ہی بنی ہوئی ہے - ایک بڑا سا صحن بھی ہے جس میں وجد و رقص کی محفلیں جمتی چلی آ رہی ہیں - مولانا روم کا خود نوشت مثنوی کا نسخہ، مثنوی کی شروح، مولانا کے اپنے اور خلفاء کے جبے، ہزار دانہ تسبیحیں، قرآن کریم کے قدیم نسخے جن میں ایک نسخہ ایک ہزار سال پرانا ہے، مختلف ساز جو رقص کے دوران بجائے جاتے تھے، الغرض فرقہ مولویہ سے متعلق بہت کچھ اس عجائب گھر میں موجود ہے - عقیدت مندوں کا یہ حال ہے کہ میں نے ایک صاحب کو عین مولانا کی قبر کے سامنے نماز پڑھتے دیکھا اگرچہ قبلے کا رخ بھی اسی طرف تھا - قبر کے سامنے سربسجود غرقِ مراقبہ بہت لوگوں کو دیکھا - اور نکلتے وقت مسٹر کمال الدین نے مجھے اشارہ کیا کہ فارسی شعر کا یہ کتبہ بھی پڑھ لیں جو دیوار پر آویزاں ہے - وہ شعر تو مجھے پورا یاد نہیں رہا۔ مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ "مولانا کی قبر کا ایک طواف سات ہزار سات سو ستر حجوں کے ثواب سے بہتر ہے" یہ ہے بے جا عقیدت -

مولانا روم کے مزار سے متصل ہی جامع سلیمیہ ہے - مزار سے نکلے اور مغرب کی نماز کے لیے جامع سلیمیہ چلے گئے - جامع سلیمیہ سلطان سلیم ثانی (۱۵۶۶-۱۵۷۴ء) نے بنوائی تھی - دو میناروں والی یہ انتہائی خوبصورت مسجد قونیہ کے اندر عثمانی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے - اور اسی عظمت و شکوہ کی حامل ہے جو استنبول میں اسی نام سے اس عظیم سلطان کی یادگار ہے - ان دونوں کا معمار بھی ایک ہے - وہ ہے سنان پاشا جسے عثمانی فنِ تعمیر کا موجد اور روح کہا جاتا ہے - ترکی کی مشہور

مسجدیں اور قصر اُسی کے کمالِ فن کا مظہر ہیں۔ مسجد میں حاضری خوب تھی۔ اور یہ شک دُور ہو گیا کہ رمضان کے بعد لوگ مسجد کا رُخ نہ کریں گے۔

موجِ نُور

شب باشی نوری تحریک کے ایک انتھک کارکن حسن صاحب کے ہاں طے ہوئی۔ نماز عشاء کے بعد اُن کے مکان پر اخوانِ نُور کا بہت بڑا اجتماع منعقد ہو گیا۔ دوستوں نے بتایا کہ وقت کم ہونے کی وجہ سے تمام احباب کو اطلاع نہیں ہو سکی ورنہ حاضری دو گنی ہوتی۔ یہ سب لوگ چیدہ اور نمایاں ہیں۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ہے۔ اُن کے روشن اور دمکتے چہرے ایمان و اخلاص کی منہ بولتی تصویر تھے اور نورٌ علیٰ نور کی شان جلوہ گر تھی۔ گفتگو کے لیے میرے ترجمان آیدین کے ایک رفیق کو منتخب کیا گیا جو نہایت شستہ اور رواں عربی بولتے تھے اور قونیہ کے ہائر اسلامک انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آیدین وہی شہر ہے جہاں عدنان مندریس مرحوم پیدا ہوئے۔ حاضرین میں عربی زبان جاننے والوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اُن سوالوں سے ہوا جو متعدد لوگوں کی طرف سے عربی زبان میں کیے گئے۔

مجھ سے مطالبہ کیا گیا کہ میں جماعتِ اسلامی کی دعوت اور طریقِ کار پر مفصل روشنی ڈالوں۔ اِس موضوع پر گو میں استنبول اور انقرہ میں اخوانِ نُور کے اجتماعات میں تقریریں کرتا رہا ہوں، مگر قونیہ میں کچھ زیادہ ہی اس بارے میں تشنگی اور طلب کا اظہار کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قونیہ خالصتہً مشرقی شہر ہے اور استنبول و

انقرہ کی نسبت یہاں کے ماحول پر اسلامی روایات کی چھاپ زیادہ مضبوط اور گہری ہے۔ اس لیے یہاں تحریکی جوش وخروش بھی بڑھ چڑھ کر ہے صالح اوز جان مجھے پہلے باخبر کر چکے تھے کہ اِزمیر کے بعد ہماری دعوت کا دوسرا مضبوط مرکز قونیہ ہے۔ مَیں نے جماعت کی دعوت کے چاروں نکات بیان کیے۔ اور بتایا کہ اِن میں سے ہر ہر نکتہ پر اب تک کس حد تک کام ہو چکا ہے اور اُسے بروئے کار لانے کے لیے کیا کیا وسائل اختیار کیے گئے ہیں۔ کوشش کی کہ اختصار تو ہو مگر بات ادھوری نہ رہے اور اُکتا دینے والی طوالت سے بھی بچوں۔ بانئ تحریک کی سوانح حیات اور جماعت کی تاریخ بھی بیان کی۔ جماعت نے زندگی کے مختلف گوشوں میں جو کچھ جدّوجہد کی ہے اس کی کسی حد تک وضاحت کر دی۔ اس طرح کے مواقع بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ راقم الحروف نے پوری کوشش کی کہ یہ حضرات ہماری دعوت، نصب العین اور طریقِ کار سے کم از کم بُنیادی طور پر واقف ہو جائیں۔ یہ ایک فرض ہے جسے ادا کرنا ترکی کی اِسلامی تحریک اور پاکستان کی اِسلامی تحریک دونوں کا مشترک تقاضا ہے۔ اس اجتماع میں یہ سوال خاص طور پر کیا گیا کہ جماعت نے خواتین کے حلقے میں کیا کام کیا ہے اور کیسے؟ استنبول و انقرہ میں مَیں نے اِس پہلو پر دو چار لفظوں میں اظہارِ خیال کیا تھا مگر یہاں تفصیل طلب کی گئی اور جواب بھی تفصیل کے ساتھ دے دیا گیا۔ سائل نے جواب سُن کر کہا کہ قُونیہ میں بعض نوری خواتین بڑا قابلِ رشک دعوتی کام کر رہی ہیں اور ترکی کی مشہور داعیۂ اسلام شعلۂ یوکسل نے قونیہ کے بار بار دورے کر کے یہاں کی خواتین میں بیداری کی لہر

دو ٹرادی ہے[1]۔ یہ سُن کر طبیعت میں بڑی مسرت پیدا ہوئی۔ نحمد اللہ علی ذالک۔

حسن صاحب جن کے ہاں قُونیہ میں شب باشی کی ہے ایک مسجد کے امام ہیں۔ امامت کے علاوہ اپنا ذاتی کاروبار بھی کرتے ہیں۔ یہ انکشاف مجھے صبح کی نماز میں ہُوا۔ موصوف نے ہمیں اذانِ فجر سے پہلے بیدار کر دیا، قہوہ پلایا اور پھر اپنی مسجد میں لے چلے۔ یہ مسجد ان کے گھر سے کافی دُور ایک روایتی محلے میں واقع ہے۔ جب ہم نے مسجد میں قدم رکھا تو حاضری گنتی کی تھی مگر دس منٹ کے اندر مسجد بھر گئی۔ نماز کے بعد اہلِ محلہ سے تعارف ہُوا۔ محبت و بشاشت سب میں مشترک تھی۔ اور قُونیہ کی روحانی چھاپ اس پر مستزاد۔ حسن صاحب کو مصلّائے امامت پر دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اب تک اُن کے لباس، رہن سہن اور چہرے مہرے سے میرا یہی قیاس تھا کہ موصوف اچھے گریڈ کے سرکاری ملازم ہیں۔ مگر وہ ایک آزاد امام ہیں۔ خوش گلو قاری اور حافظ ہیں۔ شخصیت بارُعب ہے،

---

[1] شُعلہ یوکسل کے بارے میں پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن اب تازہ اِطلاع یہ مِلی ہے کہ موصوفہ کو اِزمیر کی فوجداری عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے بندرما شہر میں "اسلام میں عورت کے فرائض" کے موضوع پر تقریر کی ہے۔ تقریر کے فوراً بعد ہی بندرما کے ڈپٹی کمشنر نے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے اور پولیس انہیں گرفتار بھی کرنے گئی مگر عوام کے جمِّ غفیر نے موصوفہ کو گرفتار نہیں کرنے دیا۔ دراصل ملک کے طول و عرض میں شُعلہ نے تقریروں کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور ہزاروں مرد اور خواتین ان سے متاثر ہو رہی ہیں اُسے روکنا مقصود ہے۔

لباس میں وضعداری ہے۔ ۴ ۱/۲ ۳ سو ترکی لیرہ اُن کی تنخواہ ہے۔ یہ تنخواہ تو زیادہ نہیں ہے۔ مگر انہوں نے امامت کے منصب کو پُر تمکین اور باوقار بنانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ امامت کی تحقیر ہندو پاک ہی میں دیکھی ہے۔ دوسرے ملکوں میں یہ بڑے ٹھاٹھ کا وظیفہ ہے۔

قونیہ کا ہائی اسلامک انسٹی ٹیوٹ

ناشتہ کے بعد قونیہ کی قابل دید جگہوں کو دیکھنے نکل گئے۔ سب سے پہلے ہائی اسلامک انسٹی ٹیوٹ گئے۔ یہ کالج کی سطح کی درس گاہ ہے۔ مدارس امام و خطیب سے فارغ ہونے والے طلبہ اِس میں داخل ہوتے ہیں۔ اس وقت پُورے ترکی میں اس طرح کے چار انسٹی ٹیوٹ ہیں۔ ایک استنبول میں، دوسرا قونیہ میں، تیسرا اِزمیر اور چوتھا قیصریہ میں۔ قونیہ کا انسٹی ٹیوٹ شہر کی کُھلی فضا میں ہے اور وسیع و عریض علاقہ میں واقع ہے۔ عمارت بالکل نئی اور پُر شکوہ ہے۔ چھٹی کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ صرف دو تین اساتذہ مِلے جو قونیہ ہی میں رہتے ہیں۔ اُن سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمارت جو بجائے خود ایک یونیورسٹی کا عکس پیش کرتی ہے، قونیہ کے باشندوں نے اپنے خرچ سے بنوائی ہے۔ حکومت کا صرف اتنا کرم ہے کہ اُس نے انسٹی ٹیوٹ کو منظور کر لیا ہے۔ بلکہ انہوں نے یہ بتایا کہ ترکی میں امام و خطیب کے جتنے مدارس ہیں اور جتنے ہائی اسلامک انسٹی ٹیوٹ ہیں انہیں ترک مسلمانوں نے اپنے چندوں سے بنایا ہے اور حکومت کو صرف یہ "تکلیف" کرنی پڑی ہے کہ وہ انہیں منظور کر لے۔ متعدد مثالیں ایسی بھی موجود ہیں کہ مدرسہ کی عمارت تیار ہے

مگر حکومت منظوری دینے میں ٹال مٹول کر رہی ہے۔ چونکہ یہ قانون پاس ہو چکا ہے کہ اگر کسی شہر کے باشندے اپنے خرچ پر مدرسہ امام و خطیب قائم کر لیں تو حکومت اُسے منظور کر لے گی اس لیے حکومت کو طوعاً یا کرہاً یہ تلخ گھونٹ پینا پڑتا ہے۔ ایسے مدارس کے قیام میں عوام الناس بھی بے پناہ جوش و جذبہ دکھا رہے ہیں۔ اور حکومت پر حجت پوری کرنے کے لیے مدرسہ کی عمارت نہایت عالی شان، کشادہ اور ہمہ پہلو مکمل بنائیں گے کہ حکومت کو کوئی ایسا عذر ہاتھ نہ آئے جو مدرسہ کی منظوری سے فرار کا جواز بن سکتا ہو۔ ان مدارس کا نظام اور دوسری تفصیلات ہم آئندہ بیان کریں گے۔

قُونیہ یا اِکونیم

اگر آپ اناطولیہ میں ایک متساوی الاضلاع مثلث کھینچیں جس کا ایک زاویہ انقرہ پر ہو اور دوسرا قیصریہ پر تو تیسرا زاویہ لازماً قونیہ پر ہوگا۔ قونیہ ترکی شہروں میں سب سے زیادہ مشرقی اور اسلامی نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شہر جب بنا ہو تو اس میں منصوبہ بندی کو بھی دخل ہو مگر اب یہ مسجدوں، میناروں اور مسطح چھت والے مکانوں کا ایک بے قاعدہ سا مجموعہ ہے۔ قدیم یونانی اور لاطینی ماخذوں میں اکونین (Ikonion) اور اکونیم (Iconium) کہا گیا ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے صلیب پرست اسے یکونیم کہتے تھے۔ اور مسلمان جغرافیہ دانوں نے اسے کونیہ (Kuniyye) لکھا ہے۔ مگر اب عربی رسم الخط میں اسے اردو، فارسی اور عربی میں قُونیہ لکھا جاتا ہے۔ یہ وسطی اناطولیہ کا قدیم ترین شہر ہے۔ حِتّی قوم کو اس شہر سے بڑی دلچسپی تھی۔ حِتّیوں نے اسے اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔

حِتّیوں کے بعد فرجینیا اور لیڈیا والوں کے قبضہ میں آ گیا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران کے ساتھ اس کا الحاق ہوا۔ ۱۳۳ قبل مسیح میں یہ روما کی سلطنت کا حصّہ بنا اور دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ سینٹ پال نے ۴۷، ۵۰ء اور ۵۳ء میں قونیہ کا دورہ کیا۔ گیارھویں صدی مسیحی کے بعد مذہبی مرکز کی حیثیت سے اسے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۰۷۰ء میں اِسے سلجوق نے فتح کیا۔ اور اب یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قونیہ اب تک خالصتًہ سلجوقی شہر ہے۔ اس کی زیادہ تر عمارتیں تیرہویں صدی کی ہیں۔ علاؤالدین کیقباد ایک سلجوقی فرمانروا نے اسے "نیا روما" بنانا چاہا تھا۔

مسعود بن قلیج ارسلان سلجوقی نے ۱۰۹۰ء میں قونیہ کو سلجوقی سلطنت کا پایۂ تخت بنا کر گرتی ہوئی سلجوقی سلطنت کو سنبھالا۔ علاؤالدین کیقباد (۱۲۱۹ء تا ۱۲۵۶ء) کے دَور میں یہاں امن و امان کا دَور دَورہ ہوا۔ اور مشرقی علاقوں کے بہت سے اہلِ علم و فن ہجرت کر کے قونیہ میں آباد ہو گئے۔ محی الدّین ابنِ عربی، مولانا جلال الدین رومی اور صدر الدّین قونوی جیسے نامور علماء اور صوفیا اس دَور میں قونیہ میں پہنچے۔ یہ زمانہ قونیہ کا عہدِ زرّیں کہلاتا ہے۔ تیرہویں صدی کے وسط تک قونیہ کی درخشانی اور رونق عروج پر رہی۔ سلجوقی سلطنت کے خاتمہ کے بعد قرہ مان اس شہر کے حکمران بنے۔ ۱۴۶۷ء میں سلطان محمد فاتح کی قیادت میں عثمانی فوجوں نے اس شہر کو فتح کر لیا۔

سلجوقیوں کی یادگاریں

جب ہم ہائی اسلامک انسٹی ٹیوٹ دیکھ کر باہر نکلے تو شہر کے دُوسرے



مینار مسجد سلجوق۔ قونیہ۔ سلجوقی طرزِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ

مقامات کی سیاحت کو بھی نکل گئے۔ راستے میں سلجوقی اور عثمانی آثار قدم قدم پر دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ شہر پر رُوحانی فضا کا غلبہ ہے۔ استنبول کی طرح یہاں بھی مسجدوں کی بہار ہے۔ نوکیلے میناروں اور سبز گنبدوں والی مسجدیں بڑی شانِ دلرُبائی دکھا رہی ہیں۔ "حضرت مولانا" (یعنی مولانا جلال الدین رومیؒ) کے مقبرہ کے پاس قونیہ کی سب سے مشہور مسجد جامع سلیمیہ ہے۔ اسے سلطان سلیم ثانی نے شہزادگی کے زمانے میں تعمیر کروایا تھا۔ بہت خوبصورت مسجد ہے۔ اس کے دو مینار ہیں۔ قونیہ میں عثمانیوں کی تعمیرات کا اگر نادر اور حسین ترین نمونہ دیکھنا ہو تو جامع سلیمیہ کو دیکھ لیا جائے۔

بارش کی بوندا باندی میں ہماری موٹر ایک کشادہ چوک میں پہنچ گئی۔ یہاں بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ یہ چوک ایک مصنوعی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس پہاڑی کو "جبلِ کیقباد" کہا جاتا ہے۔ اس پر ایک پبلک باغ ہے۔ سلطان علاؤالدین کیقباد کے محل کے آثار بھی اس پر نظر آتے ہیں۔ اس محل کو "قصرِ سلجوق" کہا جاتا ہے۔ اسے قلیچ ارسلان ثانی نے بنوایا تھا۔ مگر اس کی تکمیل علاؤالدین کیقباد نے کروائی۔ اس تاریخی محل کی صرف ایک دیوار باقی ہے۔ ۱۵ویں صدی میں عثمانیوں کی فتح کے بعد عثمانی گورنر اِس محل میں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹ویں صدی میں نئی سرکاری عمارت تعمیر ہو گئی اور اُسے گورنر ہاؤس بنایا گیا۔ جبل کیقباد پر واقع پبلک باغ کو سلجوقیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن پھولوں کے ایک تختے پر ایک چھوٹی سی تحریر ملتی ہے جس سے قدیم ترکوں اور جدید ترکوں کے ذوقِ نفیس کا نشان ملتا ہے۔ اس تحریر کا مفہوم یہ ہے کہ: "پھولوں کے

بغیر باغ ایسا ہی ہے، جیسا بچوں کے بغیر گھر"۔

قصرِ سلجوق کے پاس ایک مسجد بھی ہے۔ یہ دراصل محل کی مسجد تھی۔ اس کی تعمیر سلطان رکن الدین مسعود سلجوقی (۱۱۱۶ء تا ۱۱۵۶ء) کے عہد کے اواخر میں ہوئی۔ اور کیقباد اوّل نے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس لیے اسے جامع کیقباد کہا جاتا ہے۔ یہ مسجد اب بھی آباد ہے۔ ترک اس میں بڑے شوق و ذوق سے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے پتھریلے فرش پر چمکیلے حاشیوں والے مصلّے بچھے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک دینی مدرسہ بھی ہے جسے اتاترک کے زمانے میں بند کر دیا گیا۔ قونیہ کی کچھ اور تاریخی مساجد کا مختصر تعارف یہ ہے:

الیکس مسجد: اسے شمس الدین التینا پا ایک سلجوقی وزیر نے بنوایا۔ اس کی پُشت پر ایک دینی مدرسہ تھا۔ اس کا صرف ایک کمرہ باقی رہ گیا ہے۔ مسجد کے نہایت خوبصورت منبر کے کچھ نشان باقی رہ گئے ہیں۔

خاتون مسجد: یہ قونیہ کے مہمندر محلہ میں واقع ہے۔ اسے دولت خاتون نے ۱۲۱۳ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کا صرف ایک مینار ہے۔

جامع شریف الدین: اسے شیخ شریف الدین نے ۱۳ ویں صدی میں تعمیر کرایا۔ اس کا صحن کشادہ ہے۔ اس کا ڈیزائن نہایت خوبصورت اور دِلآویز ہے۔ عثمانیوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔

کاپی مسجد: یہ قونیہ کی مارکیٹ کے اندر واقع ہے۔ اسے پیر حسین چلپی نے ۱۶۵۸ء تا ۱۶۵۹ء میں تعمیر کروایا۔ بعد کے ادوار میں اس میں متعدد تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

عزیزیہ مسجد: یہ بھی قونیہ مارکیٹ میں ہے۔ اسے ۱۷ویں صدی میں محاسب مصطفےٰ پاشا نے تعمیر کروایا۔ ۱۹ویں صدی کے نصف ثانی میں عثمانی فرمانروا سلطان عبدالعزیز کے حکم سے اس کی دوبارہ مرمت ہوئی۔

بشاربے کی چھوٹی مسجد: یہ قونیہ کے فرحونیہ محلہ میں واقع ہے۔ اسے امیر زین الدین بشار بے نے ۱۲۱۳ء میں بنوایا تھا۔

حسن صاحب اور قونیہ کے دوسرے دوستوں کی معیت میں قونیہ کی تاریخی مسجدوں اور متعدد دوسرے تاریخی مقامات دیکھے۔ عثمانیوں کی طرح سلجوقیوں کو بھی مسجدیں تعمیر کرنے کا شوق تھا۔ اور تقریباً ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی بنایا جاتا تھا۔ سلجوقی فرماں روا غیاث الدین کیخسرو ثانی کے زمانے میں قونیہ میں ایک عظیم اسلامی درس گاہ قائم کی گئی۔ اسے سراجلی مدرسہ کہا جاتا ہے۔ اور اس کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔ اس مدرسے کے بانی بدرالدین مصلح تھے۔ اس کا معمار طوس کا ایک فن کار محمد بن عثمان تھا۔ قرہ طائی کا دینی اور تاریخی مدرسہ بھی قونیہ کی خاص یادگاروں میں سے ہے۔ یہ جبل علاؤالدین کے شرق میں ہے۔ اسے سلجوقی وزیر جلال الدین قرہ طائی نے ۱۲۵۱ء میں بنوایا تھا۔ مدرسہ کی عمارت کے بہت سے گنبد ہیں۔ یہ نیلگوں ٹائلوں اور ایرانی طرز کی گلکاری کا نادر نمونہ ہے۔ دیواروں پر قرآن کی آیات، آیت الکرسی اور سورۂ بقرہ کی بعض آیات کوفی خط میں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ تحریر بڑی خوبصورت اور دلکش ہے۔ اس مدرسہ کا دروازہ بھی پتھر کے کام کا نہایت شاہکار نمونہ ہے۔ مدرسہ میں کتبوں کا میوزیم بھی ہے۔ اس میں سلجوقی، قرہ مانی اور عثمانی دور کے کتبے رکھے ہوتے ہیں۔

اگر وقت ہو تو قونیہ کے اندر اور قونیہ کے گرد و نواح میں بہت سی چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ سلجوقی آرٹ کا ایک بہترین نمونہ یلدزی گنبد ہے۔ آتا قلیسی مسجد بھی آرٹ کے لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ رواروی میں ہم نے جو چیزیں دیکھیں ان میں قونیہ لائبریری بھی ہے۔ یہ لائبریری بڑی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ ۱۷۹۵ء میں اسے یوسف آغا نے قائم کیا تھا۔ اس میں ۲۹۱۷ مخطوطے اور ۷۵۹ مطبوعہ کتابیں ترکی، عربی اور فارسی زبانوں میں موجود ہیں۔ خود مولانا رومی کے مقبرے کا کتب خانہ بھی بڑے قیمتی اور نادر علمی ذخیرے پر مشتمل ہے۔ اس کتب خانے کو سید ہمدان چلپی نے ۱۸۵۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس میں ۱۹۲۲ مخطوطے اور ۴۸۶۲ مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔

آثارِ قدیمہ کا عجائب گھر اور چوبی نوادر کا عجائب گھر جو النسی مینار کی مسجد میں واقع ہے قابلِ دید ہیں۔ النسی مینار کی مسجد سائیں پتہ فرح الدین علی ایک سلجوقی وزیر نے ۱۲۶۴ء میں بنوائی تھی۔

قونیہ کے باہر بہت سی محفوظ سرائیں ہیں۔ ان میں سب سے بڑی شہر کی شمالی سمت میں واقع ہے۔ اور اتنی وسیع ہے کہ اس میں متعدد تجارتی قافلے سما سکتے ہیں۔ اس کی دیواریں ان گھڑ پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ سلجوقیوں کے دَور میں اس کے اندر نگرانی کے لیے بلند برج بنے ہوتے تھے جن پر چوکیدار پہرے دیتے رہتے تھے۔ داخلے کا دروازہ محرابی ہے اور اس پر نہایت خوبصورت عربی رسم الخط میں ایسی دلچسپ عبارتیں مرقوم ہیں جن سے تھکے ہارے مسافر کو معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ بسلامت پہنچ گیا ہے اور اسے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ قونیہ کے ارد گرد

فصیل بنی ہوئی ہے۔ داخلہ کے راستے زیادہ کشادہ نہیں ہیں۔ اگر سامنے سے بگھی آرہی ہو تو اس وقت تک انتظار کیجیے جب تک بگھی گزر نہیں جاتی۔

سلجوقی آرٹ اور عثمانی آرٹ کا فرق

قونیہ اور استنبول دونوں دو اسلامی تہذیبوں کے مرکز رہے ہیں۔ قونیہ سلجوقی تہذیب اور استنبول عثمانی تہذیب کا آئینہ ہے۔ سلجوقی فنِ تعمیر اور عثمانی فنِ تعمیر میں اگر ہم امتیازی خط کھینچنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ سلجوقی فن میں "جلال" کو غلبہ حاصل ہے اور عثمانی فن میں "جمال" کو۔ دونوں فنوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ عثمانی سلجوقیوں کے وارث ہیں۔ عثمانیوں نے زمامِ اقتدار سلجوقیوں سے چھین کر حاصل نہیں کی، بلکہ خدماتِ حسنِ کردار اور اخلاص کی بدولت طبعی طریقے سے حاصل کی ہے۔ سلجوقی مطمئن تھے کہ وہ مسندِ حکومت اپنے سے بہتر قوم کے لیے خالی کر رہے ہیں۔ اس لیے عثمانیوں نے سلجوقی فن و ادب کو نفرت و حقارت سے نہیں بلکہ محبت و قدردانی کی نظر سے دیکھا۔ اور اُسے مسخ و محو کرنے کے بجائے ترقی دی۔ سلجوقیوں نے اونچے ستون بنائے اور عثمانیوں نے اونچے ستونوں پر گنبدوں کی پیچ دار قطاریں کھڑی کر دیں۔ سلجوقیوں نے طویل مینار اُٹھائے اور عثمانیوں نے اُن میناروں کے کلس پتلے اور نوکیلے کر دیئے تاکہ وحدانیت زیادہ نمایاں ہو جائے۔ یوں تہذیب و فن کے دریا نے عثمانی دور میں اپنا دھارا بدلنے کے بجائے اپنا پاٹ وسیع کر لیا۔

انقرہ کو واپسی

سفر میں فریضۂ تبلیغ

قونیہ مختصر سا شہر ہے مگر تاریخی اور مذہبی آثار سے لبریز ہے۔ بارش کی رِم جھم کے اندر ہی ہم نے قونیہ کے نمایاں مقامات کی طائرانہ زیارت کر لی۔ اور پروگرام کے موجب انقرہ واپس روانہ ہو گئے۔ نماز ظہر ہم نے راستہ میں ادا کی۔ حسبِ معمول ڈرائیور نے نماز کے وقت بس روک لی۔ پاس کوئی مسجد تو نہ تھی۔ البتہ ایک دکاندار نے ہماری مدد کی۔ پانی فراہم کیا اور نماز کے لیے اندر جگہ دے دی۔ انقرہ سے قونیہ آمد کے وقت میرے ساتھ محمد نجاتی اور کمال الدین صاحب تھے مگر واپسی کے وقت قونیہ کے بھی ایک رفیق شامل ہو گئے۔ اور یوں یہ سفر ہلکا پھلکا اور پُرلطف بن گیا۔ راستہ بھر بارش کا سامنا رہا۔ پہاڑیاں اور کھیت دُھل جانے سے اناطولیہ کی شان دوچند ہو گئی۔ البتہ ہمارے رفیق محمد نجاتی صاحب حسبِ عادت دُنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنی وعظ و تبلیغ میں مصروف رہے۔ ان کی پند و نصیحت کا ہدف ایک مرد اور ایک عورت تھے۔ ان دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور وہ کسی کام سے قونیہ سے انقرہ جا رہے ہیں۔ نجاتی صاحب نے انہیں نماز کی تلقین سے لے کر بُرقع پہننے کی اہمیت تک اِسلام

کے تمام احکام سُنا ڈالے۔ وہ دونوں بڑی نجابت اور عقیدت مندی کے ساتھ نجاتی صاحب کی گفتگو سراپا گوش بن کر سُنتے رہے اور وقتاً فوقتاً درمیان میں تسلیم و رضا کا اظہار بھی کرتے رہے۔ نجاتی صاحب نے انہیں میری موجودگی کی مناسبت سے پاکستان کے حالات، پاکستانی مسلمانوں کی اسلام دوستی اور پاکستان کی گوناگوں خوبیاں بھی بتادیں۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ نجاتی صاحب نے اس سفر کے اندر اِس تُرک جوڑے کے ذہن و ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور انہیں قائل کر لیا کہ وہ اسلام کو عملی زندگی میں اختیار کریں اور منکرات سے اجتناب کریں اور خصوصاً انقرہ کی غیر شریفانہ فضا سے بچ کر رہیں۔ جب ہم بس سے اُترے تو ہم نہ صرف اس تُرک جوڑے کی عقیدت و محبّت کا مرکز بن چکے تھے بلکہ اور بھی متعدد مسافروں نے ہمیں محبّت سے الوداع کہا۔ ہو سکتا ہے بس کے کچھ مسافر ایسے بھی ہوں جو محمد نجاتی کی طویل وعظ سے اُچاٹ ہوتے ہوں مگر اکثریت مستفید ہوئی۔ اور خود راقم بھی، ترکی زبان نہ سمجھنے کے باوجود، کم ازکم محمد نجاتی کی اس کوشش سے بڑا متاثر ہوا کہ اُس نے مُہر بلب رہنے کے بجائے سفر کو دعوت کا رنگ دے دیا۔ اور اصلاح و تبلیغ کا فرض ادا کر کے اجر بھی حاصل کر لیا اور حامی بھی پیدا کر لیے۔

انقرہ میں صالح اوزجان ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم ہلال کے دفتر میں پہنچے صالح اوزجان نے پہلی خوشخبری یہ سُنائی کہ مولانا مودودی مدظلہ العالی کا لندن سے تار موصول ہوا ہے۔ مولانا ۲۶ دسمبر کو بروز جمعرات لندن سے پاکستان روانہ ہو رہے ہیں۔ استنبول سے ان کا جہاز گزرے گا اور ۴۰ منٹ کے لیے

وہاں رُکے گا۔ آج ۲۳ر دسمبر ہے۔ آج سے تیسرے روز مولانا کی واپسی ہو رہی ہے۔ چنانچہ یہ اطلاع ملنے کے بعد راقم نے بھی طے کر لیا کہ استنبول تا کراچی مولانا محترم کی رفاقت کی سعادت حاصل کی جائے۔ محمد نجاتی صاحب دفتر میں داخل ہوتے ہی کام کی میز پر بیٹھ گئے۔ انہیں نہ سفر کا احساس تھا اور نہ اُس کی تکان۔ مگر میرے لیے اب آرام کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ایک نُوری تربیت گاہ

مغرب کی نماز کے بعد ہم "نور مدرسہ" کی زیارت کو نکل گئے۔ یہ مدرسہ ایک وسیع عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ صالح اوزجان اور دوسرے رفقاء گو اسے مدرسہ کہتے ہیں مگر یہ دراصل ہوسٹل ہے۔ طلبہ کے لیے رہائش کے متعدد کمرے ہیں، مطبخ ہے اور ایک وسیع ہال ہے جس سے مسجد اور اجتماع گاہ اور لیکچر روم کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک معقول تعداد بیرونِ انقرہ کے طلبہ کی ہے۔ اور خود انقرہ کے کئی طلبہ بھی مدرسہ کی مخصوص فضا اور ماحول سے استفادہ کی خاطر یہاں رہتے ہیں۔ تنہا انقرہ میں ایسے پانچ "مدارس نور" ہیں۔ نُوری تحریک کے لوگوں نے انہیں قائم کر رکھا ہے۔ طلبہ اور نوجوانوں کے اندر اسلام کی تبلیغ، ان کی اسلامی تربیت اور تعلیمی و فکری ترقی کے لیے یہ اسکیم حد درجہ کامیاب ہو رہی ہے۔ ہر طالب علم اپنا خرچہ برداشت کرتا ہے۔ مگر اُسے یہاں ایسا ماحول نصیب ہو جاتا ہے کہ انقرہ کی اباحیت زدہ زندگی اور لادینی کے سمندر میں اُس کے لیے یہ ایک جزیرۂ امن سے کم نہیں ہے۔ جس وقت ہم اس مدرسہ میں داخل ہوئے تو ہال کمرے میں طلبہ، اساتذہ اور بعض دیگر حضرات کی بہت بڑی تعداد جمع تھی۔

استاذ بیرم کی نگرانی میں اجتماع ہو رہا تھا۔ ایک کم سن طالب علم جس کی عمر ۱۰-۱۲ سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ ترکی زبان میں رواں تقریر کر رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ وہ بدیع الزماں نورسی مرحوم کی ایک کتاب حاضرین کو زبانی سُنا رہا ہے۔ اس بچّے کا انداز خواندگی، اسلوبِ ادا اور روانی بڑی دلنشیں تھی۔ پوری خود اعتمادی کے ساتھ وہ کتاب کے ورق کے ورق سُنائے جا رہا تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش بیٹھے رہے تھے مگر اُس کی روانی میں کوئی ٹھیراؤ یا اٹکاؤ نہ تھا۔ اُس نے جب مجوّزہ باب سُنا لیا تو دوسرا بچہ شروع ہو گیا اور اُس نے قرآن کریم کے ایک رکوع کی تلاوت کی۔ اس طرح تیسرے بچّے نے بھی تُرکی زبان میں کچھ پیش کیا۔ نماز عشاء تک یہ محفل جاری رہی۔ نماز کے بعد نوری رفقاء نے اپنا دعوتی اجتماع شروع کر دیا۔ استاذ بیرم بدیع الزماں نورسی مرحوم کے رفیقِ خاص رہے ہیں۔ انہوں نے قید و بند کی بھی بے پناہ صعوبتیں اٹھائی ہیں اور ان کی پیٹھ پر اب بھی تازیانوں کے نشان باقی ہیں۔ وہ ان مدارس کے انچارج ہیں اور ان کے ذریعہ وہ نوجوان نسل کے اندر اسلامی فکر و ذوق کو فروغ دے رہے ہیں۔ وہ خود بھی بڑے خدا پرست اور مجاہد اور درویش آدمی ہیں اس لیے ان کی تقریریں اور درس بھی سوزِ عشق سے لبریز ہوتے ہیں اور دل و جان کو مسحور کر لیتے ہیں۔ ۴۵ برس کے لگ بھگ ان کی عمر ہے۔ بدیع الزماں نورسی مرحوم کے مواعظ اور دروس انہیں ازبر ہیں۔ وہ ان کی خلوت و جلوت کے ساتھی رہے ہیں۔ ان کے سامنے زانوئے تلمّذ طے کیا ہے۔ تنگی و خوش حالی میں اُن کا ساتھ دیا ہے۔ اِس لیے نُوری اخوان ان کی بات کو بڑی اہمیت دیتے

ہیں۔

استاذ بیرم نے مجھ سے جماعتِ اسلامی کی دعوت اور طریقِ تبلیغ کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے انہیں حسبِ سابق تفصیل کے ساتھ ہر چیز بتائی۔ انہوں نے بھی نوری دعوت کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقصد ذہن و فکر کی اِصلاح، شریعت کی تنفیذ اور خلافتِ اسلامی کا احیاء ہے۔ اس مقصد کو روبعمل لانے کے لیے انہوں نے سرِدست تعلیمی اور تربیتی وسائل اختیار کر رکھے ہیں۔ ترکی قانون کی رُو سے وہ مذہبی بنیادوں پر کوئی سیاسی تنظیم نہیں قائم کر سکتے۔ البتہ مدرسوں اور ہوسٹلوں اور عارضی تربیتی کیمپوں کی انہوں نے زوردار مہم چلا رکھی ہے۔ عارضی تربیتی کیمپوں سے مراد وہ تربیت گاہیں ہیں جو گرمیوں کی چھٹیوں میں بحرِ اسود، بحرہ مرمرا اور باسفورس کے ساحلوں پر قائم کی جاتی ہیں۔ دُنیا کے اطراف سے انسانوں کی کثیر تعداد ان سمندروں کے ساحلوں پر تفریح و تعیش کے لیے آتی ہے۔ مگر نوری بھائی اس موقع کو سنہری سمجھ کر تذکیر باللہ کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ جب دوسرے لوگ صہبائے عشرت میں مدہوش ہوتے ہیں ان کے کیمپوں میں قرآن و حدیث کا درس ہو رہا ہوتا ہے۔ اور اخلاق و روح کے تزکیہ کی مہم سر کی جا رہی ہوتی ہے۔ زبانی درسوں کے ساتھ ساتھ وہ مطبوعہ لٹریچر سے بھی اِصلاحِ فکر کی مہم میں کام لے رہے ہیں۔ مگر یہ "ٹھنڈا" اور "غیر سیاسی" اندازِ دعوت بھی ایک طبقے کو گوارا نہیں ہے۔ ؎

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

استنبول کی عثمانیت اور قونیہ کی سلجوقیت دیکھنے کے بعد انقرہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یہاں کے دورِ قدیم کو یاد کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ پرانے رومن آثار دیکھ لیجئے، آگسٹس کی قبر پر نظر ڈال لیجئے، ملکہ جولیانہ کے ستونوں کا مشاہدہ کر لیجئے، رومن حماموں کی باقیات سے عبرت حاصل کر لیجئے۔ دورِ جدید کو سامنے رکھیں تو ہر چوک اور ہر نکڑ پر اتاترک کے جہازی مجسمے دیکھ لیں، اتاترک کی دوسری بعض یادگاروں کا جائزہ لے لیں، وہ عمارت دیکھ لیں جس میں اتاترک نے پہلی اسمبلی کو خطاب کیا تھا۔ اور طبعی پہلو سے انقرہ کے نغمہ ریز باغات اور خاص طور پر انقرہ کا گنجلک پارک آپ کے دیدہ و دل کو خاص طراوت بخشے گا۔ بعض جمگھٹے اِندر کا اکھاڑا معلوم ہوتے ہیں اور جام نہ ملے تو اوک سے ہی پی لیتے ہیں۔ مگر انقرہ بہر حال اب ترکی کا دارالحکومت ہے اُسے شاہ رگ کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہی امتیاز اُس کے لیے بس ہے۔

محکمہ امورِ مذہبی کے نائب صدر سے مفصّل انٹرویو

۲۴ر دسمبر ۱۹۶۸ء انقرہ میں خاکسار کا آخری دن ہے۔ اس روز سب سے اہم ملاقات ترکی کے محکمہ امورِ دینیہ کے نائب صدر (جو شیخ الاسلام کے لقب سے معروف ہیں) شیخ یشار تونا گور سے ہوئی۔ پہلے بھی ان سے ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ اور ان کا ذکر پیچھے آ چکا ہے۔ دوپہر کا کھانا شیخ یشار تونا گور کے ساتھ کھایا۔ اور اس مرتبہ گھر کے بجائے ایک ہوٹل میں انہوں نے دعوت کا اہتمام کیا۔ مَیں تھا، صالح اوزجان تھے اور خود شیخ یشار۔ یہ ہوٹل انقرہ

ممتاز اور نظیف ہوٹلوں میں سے ہے۔ شیخ یشار داخل ہوئے تو ہوٹل کے تمام لوگ احتراماً ان کی جانب لپکے۔ کھانے کی میزوں پر ترکی پارلیمنٹ کے سابق اور موجودہ ارکان، سرکاری افسران اور سیاست دان جمع تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے گروہ کے ساتھ آیا اور کھانے میں منہمک ہو گیا۔ شیخ یشار کو ہر شخص نے عزت و احترام سے دیکھا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ آرام کرنے کے بجائے سیدھے محکمۂ امورِ دینیہ میں چلے گئے جہاں شیخ یشار کا دفتر ہے۔ شیخ یشار اب مستعد تھے کہ میرا یہ وعدہ پورا کریں کہ وہ محکمۂ امورِ دینیہ کی خدمات اور خاص طور پر ترکی میں مذہبی تعلیم کو پھیلانے کے لیے کیا کیا کوششیں سرانجام دی جا رہی ہیں۔

سوالات تو میں پہلی ملاقاتوں میں اُن کے کان میں ڈال چکا تھا، اور وہ بخوبی سمجھ گئے تھے کہ میں کس پہلو سے موجودہ مذہبی تعلیم کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ سوالات دُہرا دوں؟ فرمانے لگے اکثر و بیشتر سوالات میرے ذہن میں ہیں۔ میں محکمۂ امورِ دینیہ کی سرگرمیوں کا خلاصہ بیان کرتا ہوں اگر کسی مقام پر وضاحت کی ضرورت ہو تو سوال کر لیا جائے۔

شیخ یشار اپنی سادہ سی میز پر بیٹھ گئے۔ "سادہ میز" میں نے اس لیے کہا کہ سعودی عرب کے مشائخ و اکابر کے دفاتر اگر دیکھے جائیں اور دفتری ساز و سامان، فرنیچر، قالین، صوفے، قندیلیں اور قہوہچیوں کا نظارہ کیا جاتے تو ان دفاتر کی طلسماتی فضا اور زرق برق منظر کے مقابلے میں شیخ الاسلام ترکی کا دفتر

بڑا سادہ ہے۔ شیخ لیشار کی نشست کی جانب سر کے عین اُوپر اتاترک کی بڑے حجم کی تصویر آویزاں تھی۔ اگر اس تصویر میں جان ہوتی تو وہ شیخ لیشار اور اُن کے ساتھیوں اور زائرین سے پُوچھتی کہ کیا میں نے ترکی سے مذہب پرستی کو اس لیے دیس نکالا دیا تھا کہ ۲۵ — ۳۰ سال کے بعد پھر اُسے سینے سے لگالو۔ اور میری آنکھوں کے سامنے، حقیقی آنکھیں نہ سہی تصویری آنکھیں ہی سہی، یہ کھیل دوبارہ رچانے لگو۔ یہ مجھ سے سراسر بے وفائی ہے۔ مگر کیا کہا جائے، شیخ الاسلام کے دفتر میں اتاترک کی تصویر یہ تمام تبدیلیاں دیکھ کر بھی ساکت و جامد ہے اور بے بس۔

محکمہ امور مذہبی: ڈھانچہ اور فرائض

شیخ لیشار تونا کور کے بیانات سے معلوم ہوا:

محکمۂ امور دینیہ کے صدر جناب لطفی ہیں۔ اور شیخ لیشار تونا کور ان کے نائب ہیں۔ یہ محکمہ براہ راست وزیر اعظم کے تابع ہے۔ حکومت کا کوئی اور شعبہ یا وزارت اس میں دخل نہیں دیتے۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ترکی میں جمہوریت کے قیام کا اعلان ہوا۔ مصطفےٰ کمال پاشا صدرِ جمہوریہ منتخب ہوا۔ خلیفہ صرف مذہبی امور کے لیے مخصوص رہ گیا۔ مگر ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو یہ برائے نام ادارۂ خلافت بھی ختم کر دیا گیا۔ جس اجتماع میں خلافت کی تنسیخ کا فیصلہ ہوا اسی اجتماع میں یہ قرارداد بھی صادر کی گئی کہ وزارت امورِ شرعیہ اور وزارتِ اوقاف کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ دونوں وزارتیں منسوخ کر دی گئیں۔ شیخ الاسلامی کا منصب ختم کر کے امورِ دینیہ کا ایک سربراہ

مقرر کر دینے پر اکتفا کیا گیا جو براہِ راست ترکی کابینہ کے تابع تھا۔ اس کا کام صرف مساجد کی نگرانی اور واعظین اور مؤذنین کا تقرر تھا کیونکہ شرعی عدالتوں کو بھی ختم کر کے انہیں سول عدالتوں میں شامل کر دیا گیا۔ اگلا قدم یہ تھا کہ ملک بھر میں مذہبی مدرسے اور مذہبی ادارے بند کر دیئے گئے اور دین مجموعی طور پر سخت بحران سے دوچار ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء تک مدارس میں دینی تعلیم قانوناً ممنوع رہی۔ ۱۹۵۰ء میں ترکی حکومت نے محکمہ امور دینیہ قائم کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ایک خاص قانون کے ماتحت اس محکمہ میں توسیع کر دی گئی ہے۔

محکمہ امور دینی کے چار بڑے شعبے ہیں:

۱۔ شعبۂ تفتیش: یہ شعبہ ملک میں بکھرے ہوئے مفتی، مساجد کے ائمہ، خطباء، مؤذنین اور دوسرے ملازمین کی دیکھ بھال اور تحقیق و تفتیش کا فرض سرانجام دیتا ہے۔ اس کا سربراہ احمد بیگ نامی ایک نوجوان ہے۔

۲۔ شعبۂ ملازمت: یہ شعبہ مختلف مناصب اور مہمات کے لیے ملازمین بھرتی کرتا ہے۔

۳۔ شعبۂ تعلیم: تعلیم و تربیت اور حفظِ قرآن کے مدارس کے قیام و انصرام اس کے ذمہ ہے۔ اس کا سربراہ شوقی بیگ ہے۔ اس کی عمر ۵۰ سال ہے۔ اور نہایت فاضل شخص ہے۔

۴۔ شعبۂ نشر و اشاعت: یہ شعبہ اسلامی علوم کی نشر و اشاعت اور مذہبی نظریات کو ملک کے اندر فروغ دیتا ہے۔

محکمۂ امورِ دینی کی ترقی و انتظام کے لیے ایک کونسل بھی مقرر ہے۔ جسے

"اعلیٰ مذہبی مجلسِ شوریٰ" کہا جاتا ہے۔ اس کونسل کا ایک صدر اور دس رکن ہیں۔ محکمہ کا صدر اپنے منصب کی رُو سے اس کونسل کا صدر ہوتا ہے۔ اس کونسل کا کام مذہبی فتاویٰ کا اجراء، دینی کتابوں کی نشر و اشاعت کی رفتار کا جائزہ، عام نگرانی اور دیکھ بھال اور محکمہ کے لیے انتظامی قوانین و ضوابط کی تدوین۔ محکمہ امورِ دینی کے کام کا مکمل جائزہ لینے سے پہلے ہم ترکی میں موجودہ دینی تعلیم کے نظام پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔

مذہبی تعلیم کے مختلف پہلو

ترکی میں مذہبی تعلیم چار قسموں پر مشتمل ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مدارس امام و خطیب: یہ مدرسے سکنڈری سکولز کے درجہ کے ہیں۔ ان مدارس کے فارغ طلبہ اب جس کالج میں چاہیں داخلہ لے سکتے ہیں۔ (استنبول کے ایک مدرسہ امام و خطیب کے حالات ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں)۔ ان مدارس کی تعداد ۹۶[1] ہے۔ اور مجموعی طور پر ان میں اس وقت ۴۲ ہزار طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اب تک ۳ ہزار، ۹۰۸ طلبہ ان سے فارغ ہو چکے ہیں۔ ان مدرسوں میں تعلیم کی مدت ۷ سال ہے۔ پرائمری پاس طالب علم ان میں داخلہ لیتا ہے۔ ان سے فارغ ہونے والے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کالجوں میں بھی داخلہ لے سکتے ہیں۔ اور اگر تعلیم کو آگے جاری نہ رکھنا چاہیں تو محکمہ امورِ دینی میں امام، خطیب

---

[1] اب تو اس تعداد میں مزید اضافہ ہو چکا ہوگا۔ کیونکہ ہر سال ایسے مدرسے جگہ جگہ کھل رہے ہیں۔

اور واعظ کی حیثیت سے ملازمت کر سکتے ہیں۔ اس وقت محکمہ امور دینی کے زیر اہتمام ترکی میں جتنے امام اور خطیب اور واعظ کام کر رہے ہیں وہ ان مدرسوں کے فارغ شدہ ہیں۔ بلکہ ان تینوں مناصب میں سے کسی بھی منصب کے امیدوار کے لیے ضروری ہے کہ وہ مدرسہ امام وخطیب کا فارغ ہو۔

۲۔ اعلیٰ اسلامی ادارے (ہائی اسلامک انسٹی ٹیوٹ)۔ یہ ادارے کالج کی سطح کے ہیں۔ انہیں اسلامیہ کالج کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس وقت ان کی تعداد چار ہے۔ ایک استنبول میں، دوسرا قیصریہ میں، تیسرا قونیہ اور چوتھا ازمیر میں۔ ان کالجوں میں اس وقت ڈھائی ہزار طلبہ پڑھ رہے ہیں۔ اور اب تک (یعنی ۲۴ر دسمبر ۱۹۶۸ء تک) ان کالجوں سے ۷۶۵ طلبہ ڈگریاں لے کر ترکی کے اندر خدمتِ دین کر رہے ہیں۔ اِن کالجوں کے فارغ شدگان دو طرح کے کام کر سکتے ہیں۔ محکمہ امورِ دینی میں بطور مفتی ملازمت کر سکتے ہیں یا مدارس امام وخطیب میں ٹیچر بھرتی ہو سکتے ہیں۔ محکمہ امور دینی نے یہ لازم کر رکھا ہے کہ جو شخص بھی مفتی کا منصب حاصل کرنا چاہے وہ لازماً اس ادارے کا ڈگری یافتہ ہو۔ مذکورہ چاروں کالج ترکی کی یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ ان کا نظم ونسق اور معیار وہی ہے جو یونیورسٹیوں کے دوسرے کالجوں کا ہے۔ تعلیمی پہلو سے یہ اُن سے فائق تر ہیں۔

۳۔ الٰہیات کالج۔ صرف انقرہ میں اس نام کا ایک کالج ہے۔ اور انقرہ یونیورسٹی کے تابع ہے۔ اس میں ۴۸۳ طلبہ پڑھ رہے ہیں۔ اس کے فارغ شدگان کو بھی وہی سہولتیں حاصل ہیں جو مذکورہ بالا چاروں کالجوں کے فارغ شدگان کو حاصل ہیں۔ یعنی یہ بھی مفتی بن سکتے ہیں یا مدارس امام وخطیب میں معلم۔ اب

تک تقریباً ۲۰۶ لڑکے اس کالج سے ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔

۴۔ مدارس حفظِ قرآن۔ حفظِ قرآن کے مدرسے پورے ترکی میں پھیلے ہوتے ہیں۔ اور ہر مسلمان کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ اس وقت ان مدرسوں کی تعداد ۴ ہزار ۴ سو ۴۰ ہے۔ اور ان میں ایک لاکھ ۴۰ ہزار لڑکے اور لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ پرائمری پاس طلبہ ان میں داخلہ لیتے ہیں۔ اور قرآن کریم حفظ کرتے ہیں۔ اکثریت تجوید کے ساتھ قرآن حفظ کرتی ہے۔ ائمہ مساجد پانچوں نمازوں کے درمیانی وقفوں میں بھی ان مدرسوں میں استاذ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ترکی کی جتنی مساجد ہیں ان میں مؤذن کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کا مکمل حافظ ہو۔ یا اس کا بیشتر حصّہ اُس نے یاد کر رکھا ہو۔ لہٰذا محکمہ دینی امور کی طرف سے مؤذن کے لیے یہ پابندی ہے کہ وہ مدرسہ حفظِ قرآن سے فارغ ہو چکا ہو۔

دینی تعلیم کا یہ پُورا انتظام جس کا ذکر ہم نے اُوپر کیا ہے ترکی کی وزارت تعلیم کے ماتحت ہے۔ اس کا بجٹ بیشتر حد تک وزارت تعلیم کے بجٹ میں شامل ہے۔ البتہ مدارس حفظ قرآن کے مصارف میں محکمہ امور مذہبی بھی حصّہ لیتا ہے اور ترکی کی خیراتی انجمنیں بھی ان کی امداد کرتی ہیں۔ اسی طرح مدارس امام و خطیب کے قیام میں بھی عوام کا حصّہ ہے۔ اکثر و بیشتر جگہوں پر عوام الناس نے خود یہ مدرسے قائم کر دیئے اور بعد میں انہیں وزارتِ تعلیم کی تحویل میں دے دیا۔ محکمہ امور دینی ان مدارس اور کالجوں سے فارغ ہونے والوں کو خدمتِ دین اور افتاء اور ترقیٔ مساجد کے مختلف کام سرانجام دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ گویا ایک طرف دینی تعلیم کا انتظام وزارتِ تعلیم کرتی ہے اور دوسری طرف اس تعلیم سے آراستہ

ہونے والوں کے لیے کام اور روزگار کی فراہمی کا فرض محکمہ امور دینی سرانجام دیتا ہے۔ محکمہ امور دینی کا کام یہ ہے کہ وہ مفتی، خطیب، امام، مؤذنین اور دوسرا ضروری عملہ بھرتی کرے اور پھر اس کی نگرانی کرے۔ یہ بہت بڑا مشن ہے جو محکمہ امور دینی ترکی کی نشاۃ ثانیہ کے اس مرحلے میں ادا کر رہا ہے۔

مفتی اور اس کے فرائض

مفتی کیا کام سرانجام دیتا ہے؟ میں نے شیخ یشار تونا گور سے پوچھا۔ موصوف نے فرمایا: مفتی کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ اپنے حلقے میں مساجد کے ائمہ، خطباء، واعظین اور مؤذنوں کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ اور حسبِ ضرورت اُن کی ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیلی عمل میں لاتا ہے۔ اور ان کی ترقی یا تنزّل تجویز کرتا ہے۔ مسلمانوں کو ان کے شخصی مسائل میں شرعی حکم سے آگاہ کرتا ہے۔ یعنی فتوے جاری کرے۔ مفتیوں کے موجودہ نظم کے متعلق شیخ یشار نے بتایا کہ ترکی کے جملہ اضلاع کی تعداد ۶۷ ہے اور ان اضلاع کے تحت چھ سو تحصیلیں ہیں۔ ہر ضلع کے لیے ایک ضلعی مفتی اور ایک ضلعی معاون مفتی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر تحصیل کے لیے ایک تحصیل کا مفتی ہوتا ہے۔ شیخ یشار کے بیان کے موجب اس وقت پورے ترکی میں ۶۳۸ مفتی ہیں، ۶۷ معاون مفتی ہیں۔ اور ۱۵۰ واعظ ہیں۔

مساجد اور ائمہ مساجد

ترکی کی بستیوں کی تعداد ۳۵۶۲۵ ہے۔ ہر بستی میں کم از کم ایک مسجد ہے اور ہر مسجد میں ایک امام۔ اس وقت محکمہ امور مذہبی کے تحت جو امام خدمتِ امامت سرانجام دے رہے ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۳ ہزار ہے۔

یہ تمام امام محکمہ سے تنخواہ لیتے ہیں۔ ترکی کی مجموعی مسجدوں کی نسبت ان ائمہ کی تعداد کم ہے۔ اور محکمہ مزید امام بھرتی کر کے اس کمی کو پورا کرے گا۔ ترکی میں مسجدوں کی تعداد ۶۳ ہزار ہے۔ ان میں ۳۵ ہزار مسجدیں دیہات میں ہیں۔ اور ان ۶۳ ہزار مسجدوں میں سے اس وقت حکومت کی تحویل میں ۲۸ ہزار مسجدیں ہیں۔ بقیہ مسجدوں کو حکومت آہستہ آہستہ اپنی تحویل میں لیتی رہے گی۔ حکومت اپنی تحویل میں لی جانے والی مساجد کی دیکھ بھال محکمہ اوقاف کے ذریعہ کرتی ہے۔ مسجدوں کی تعمیر و مرمت اور دوسرے مصارف محکمہ اوقاف کے ذمہ ہیں اور ائمہ و خطباء اور مؤذنین اور خدّام کے مصارف محکمہ امور مذہبی کے ذمہ ہیں۔ محکمہ کے جملہ ملازمین کی تعداد ۵۲ ہزار، ۷ سو ۱۱ ہے۔

ائمہ، خطبا اور مؤذنین کی تنخواہیں

خاکسار استنبول، انقرہ، قونیہ اور بعض دوسرے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ترکی کے مفتیوں، اماموں، واعظوں اور مؤذنوں کو دیکھ چکا ہے۔ ان کا لباس نہایت وضعدار اور صاف ستھرا ہوتا ہے۔ اور بدحالی اور پراگندہ روئی جو پاکستان کے اماموں اور مؤذنوں میں ملتی ہے وہ ان میں نظر نہیں آتی۔ خاکسار نے شیخ لیشار تونا کور سے ان حضرات کی تنخواہوں کے گریڈ معلوم کیے۔ تفصیل یہ ہے:

مؤذن (جسے مدرسہ حفظ قرآن اور ابتدائی مدرسے سے فارغ ہونا چاہیے):

ابتدائی تنخواہ ۴۰۰ سو ترکی پونڈ۔ آخری گریڈ ۷۰۰، ۱ ترکی پونڈ

امام و خطیب (جسے مدرسہ امام و خطیب کا فارغ ہونا چاہیے):

پہلا گریڈ ۴۸۲ ترکی پونڈ آخری گریڈ ۲۳۶۲ ترکی پونڈ

مفتی، معاون مفتی اور واعظ (انہیں الٰہیات کالج یا ہائی اسلامک انسٹی ٹیوٹ کا فارغ ہونا چاہیے)

پہلا گریڈ ۷۰۶ ترکی پونڈ۔ آخری گریڈ ۲۷۰۰ ترکی پونڈ

علاوہ ازیں ضلعی مفتی کو ۲۵۰ ترکی پونڈ اور تحصیل کے مفتی کو ۱۵۰ ترکی پونڈ ایک ماہانہ الاؤنس ملتا ہے جسے "نمائندگی کا الاؤنس" کہا جاتا ہے۔ میں نے شیخ یشار سے عرض کیا کہ اگر آنجناب کو ناگوار نہ ہو تو میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ صدر محکمہ کی کیا تنخواہ ہے اور ان کے نائب کی کیا ہے؟ —— شیخ یشار مسکرا دیئے اور بتانے لگے کہ:

صدر محکمہ کا پہلا گریڈ ۲۷۰۰ ترکی پونڈ۔ ایک کار اور "نمائندگی کا الاؤنس" ایک ہزار ترکی پونڈ ماہانہ۔

نائب صدر کا پہلا گریڈ ۲۳۶۵ ترکی پونڈ۔ ایک کار اور ۶ سو ترکی پونڈ نمائندگی کا الاؤنس۔

شیخ یشار نے بتایا کہ ہر سال تمام ائمہ، واعظین اور مفتی محکمہ کے خرچ پر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ۱۵ دن یا ۲۵ دن تک محکمہ کی طرف سے جاری کردہ ریفریشر کورس میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ گویا ان کے لیے محکمہ نے تربیت کا انتظام کر رکھا ہے۔ مختلف گروپوں کو مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں جمع کر لیا جاتا ہے، اور تربیت گاہوں کی بدولت انہیں حُسنِ اخلاق، حُسنِ معاملہ، احساسِ ذمہ داری، خدمتِ دین اور اخلاص و امانت کی تربیت دی

جاتی ہے۔ علمی و دینی معلومات میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے۔ شیخ یشار نے بڑے تمتماتے ہوئے چہرے سے کہا کہ یہ ریفریشر کورس نہایت نتیجہ خیز برآمد ہو رہے ہیں۔ اس وقت ۳۰ ٹیپ ریکارڈ بھی اسی غرض کے لیے فراہم کیے گئے ہیں۔

عورتوں کی دینی تعلیم

شیخ یشار کی گفتگوؤں اور ترکی کے دوسرے دوستوں کی گفتگوؤں سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ ترکی میں اس وقت عورتوں کے اندر دینی تعلیم کا بڑا شوق پایا جاتا ہے۔ کثیر تعداد میں کم سن بچیاں قرآن حفظ کر رہی ہیں اور دینی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ترکی کی نامور داعیۂ اسلام شعلہ یوکسل اور زینب ملتھبا کے بارے میں یہ ذکر آچکا ہے کہ انھوں نے عورتوں کے اندر اسلام کی دعوت و تبلیغ کی مہم چلا رکھی ہے۔ اور اب شیخ یشار نے یہ حیرت انگیز انکشاف بھی کیا کہ ترکی کے اندر تین مدارس امام و خطیب صرف عورتوں کے لیے ہیں۔ ان میں تعلیم پانے والی بھی لڑکیاں ہیں اور تعلیم دینے والی بھی۔ ان مدارس سے جو لڑکیاں فارغ ہو رہی ہیں وہ لڑکیوں کے ثانوی اسکولوں میں دینیات کی ٹیچرس ہیں [1]

---

[1] اس سلسلے میں جریدہ الشہاب (بیروت) کی ایک خبر ملاحظہ ہو: اسپارٹا میں خواتین کے پہلے اسلامی مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ افتتاحی تقریب میں شوکت ڈیمرل (سابق وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل کے بھائی) اور شیخ یشار تونا گور نے تقریریں کیں۔

(۱۵ رمئی ۱۹۶۹ء)

اسلامی لٹریچر کی اشاعت

محکمہ امورِ مذہبی یشار تونا کور کی قیادت میں ایک اور اہم خدمت بھی سرانجام دے رہا ہے۔ اور وہ ہے اسلامی کتابوں کی طباعت اور نشر و اشاعت۔ اسلامی کتابوں کے لحاظ سے ترکی پچھلے ادوار میں شدید قحط کا شکار رہا ہے۔ ترکی کا تمام اسلامی لٹریچر عربی رسم الخط میں تھا۔ ۱۹۲۶ء میں عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط نافذ کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد عربی حروف کو دیس نکالا دینے کے لیے مدّت تک تشدّد و تعسّف کا زہرہ گداز دور دورہ رہا۔ یہاں تک کہ ترکوں کی نئی نسل اپنے اسلامی اور تاریخی سرمائے سے ناآشنا ہوتی گئی۔ اس وقت ترکی کے تمام شہروں میں کئی ملین ایسی کتابیں پڑی ہیں جو عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہیں۔ مگر اُن سے نوجوان ترک استفادہ نہیں کر سکتا۔ لاطینی رسم الخط میں ترکی کے اہلِ قلم نے پچھلے پچاس سالوں کے اندر کوئی قابلِ ذکر اسلامی لٹریچر پیدا نہیں کیا۔ اب ۸۔۱۰ سالوں سے بعض ترک نوجوانوں نے لاطینی رسم الخط میں اسلامی لٹریچر چھاپنے کا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ مولانا مودودی اور اخوان رہنماؤں کی کتابیں جدید ترکی میں ترجمہ ہو کر چھپ رہی ہیں۔ مگر محکمہ امورِ مذہبی اِس کمی کو شدّت سے محسوس کر رہا ہے۔ محکمہ کا ایک شعبہ اسی کام کے لیے وقف ہے۔ اُس نے اب تک اِس سلسلہ میں متعدد اسلامی کتابیں شائع کی ہیں۔ شیخ یشار نے مجھے ان کتابوں کی مکمل فہرست مہیا کر دی جنہیں اب تک محکمہ امورِ مذہبی کے شعبۂ نشر و اشاعت نے زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے۔ ان میں ترکی مؤلفین کے علاوہ غیر ترکی اہلِ قلم کی

کتابیں بھی شامل ہیں۔ قرآن کریم کی لاطینی ترکی میں تفسیر ۹ جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ صحیح بخاری کی تجرید اور امام نوویؒ کی ریاض الصالحین کا ترکی ترجمہ کیا گیا ہے۔ الغرض فقہ، اصول فقہ، تفسیر، اصول تفسیر اور حدیث اور اُصولِ حدیث اور تاریخ خلفائے اسلام اور اخلاق اسلامیہ اور دیگر اسلامی موضوعات پر تین سو سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کتابوں کے جتنے ایڈیشن نکلے ہیں اور ہر ایڈیشن جتنی تعداد میں نکلا ہے اُس کا حساب لگاتے ہوئے شیخ لیشار نے بتایا کہ اب تک محکمہ ۳۰ لاکھ سے زیادہ کتابیں چھاپ چکا ہے۔ یہ کتابیں کم قیمت پر یا مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ اور نہ صرف ترکی کے اندر ان کی تقسیم کا اہتمام کیا جاتا ہے بلکہ انگلستان اور جرمنی میں بھی جہاں جہاں ترک باشندے ملازمت، تجارت یا مزدوری کے سلسلے میں رہتے ہیں اُن کے اندر بھی اِسلامی نظریات اور اِسلامی اخلاق اور اِسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے ان کتابوں کی تقسیم کی جاتی ہے۔ محکمہ اب ایک پندرہ روزہ جریدہ اور ایک ماہانہ مجلّہ کے اجراء کا انتظام بھی کر رہا ہے۔ اور اس غرض کے لیے وہ اپنا مستقل پریس خرید رہا ہے تاکہ اِسلامی لٹریچر کی اشاعت کی رفتار تیز تر ہو سکے۔ نیز تحقیق و بحث کے لیے ایک اکیڈمی قائم کی جا رہی ہے جو نئی نئی کتابیں تیار کرے گی اور تُرک نوجوان کی جدید ضرورت کو پُورا کرے گی۔ اکیڈمی کے لیے ایک شانِ شایان عمارت تعمیر کی جائے گی۔

انقرہ میں مسجدوں کی تعمیر کی کُھلی اجازت نہیں تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ پُرانی مسجدیں ہی اپنا وجود قائم رکھ سکیں مگر نئے دَورِ انقلاب میں اب انقرہ

کا دروازہ بھی مسجدوں کے لیے کھلتا جا رہا ہے۔ شیخ بیشار سے معلوم ہُوا کہ محکمہ امورِ مذہبی انقرہ کے اندر ایک پُرشکوہ مسجد تعمیر کرائے گا۔ یہ مسجد انقرہ کے قوجہ تپہ محلہ میں بنائی جائے گی۔ اس میں ۲۰ ہزار نمازیوں کی گنجائش ہوگی۔ لاگت کا تخمینہ ۳ کروڑ ترکی پونڈ ہے۔

شیخ بیشار نے دو گھنٹہ تک اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اور میرے آگے محکمہ امورِ مذہبی سے متعلق معلومات کا انبار لگا دیا۔ میرے ساتھ استاذ صالح اوزجان بھی تھے۔ وہ بھی ہر بات پر شیخ بیشار کی تصدیق کرتے۔ بلکہ مزید وضاحت کر دیتے۔ جوں جوں شیخ بیشار اپنے محکمہ کی سرگرمیوں کو بیان کرتے جاتے میرا دل بلّیوں اُچھلتا جاتا، میری روح سرمدی کیف میں ڈوب جاتی۔ میری آنکھوں کے سامنے عجیب و غریب منظر جھلملانے لگتا اور یوں محسوس ہوتا کہ محمد الفاتح دوبارہ مسندِ خلافت پر متمکن ہو رہا ہے۔ ترکی کا "مردِ بیمار" صحت یاب ہو کر میدانِ زنگ و بو اور عرصۂ جہد و جہاد میں دوبارہ اُتر رہا ہے۔ میں بات بات پر حیرت و استعجاب میں ڈوب کر شیخ کے بیان کی توثیق مزید کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر شیخ خندہ جبینی سے اپنے بیان کو دُہرا دیتا۔

محکمۂ امورِ مذہبی کا بجٹ

ایک آخری سوال باقی رہ گیا تھا وہ بھی پُوچھے نہ بنا۔ عرض کیا کہ محکمہ کا مجموعی میزانیہ کیا ہے۔ محکمہ کی یہ تمام رونق، یہ منصوبے اور یہ سنہری عزائم پُورا کرنے کے لیے بھاری بھرکم میزانیہ کی ضرورت ہے۔ آخر وہ میزانیہ کیا ہے؟ شیخ نے بتایا: ان مہمات کو سر کرنے کے لیے دو میزانیے چل رہے ہیں۔ ایک

محکمہ امورِ مذہبی کا میزانیہ اور دوسرا اوقاف کا میزانیہ (اور یہ دونوں محکمے براہِ راست وزیرِ اعظم کے تابع ہیں)۔ دونوں محکموں کا میزانیہ یہ ہے:

محکمہ امورِ دینی کا موجودہ (۱۹۶۸ء) کا بجٹ : ۸۴۴۰۳۴۵۹ ترکی لیرے

" " " آئندہ (۱۹۶۹ء) " " : ۱۹۵۱۴۲۷۶۱ " "

محکمہ اوقاف کا سالانہ بجٹ : ۷۳۲۰۵۴۶۵ " "

محکمہ امورِ دینی کا ۱۹۶۸ء کا جو بجٹ ہے اُسے ۱۹۶۹ء میں دُگنا سے بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ اور اس اضافے کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کو زیادہ وسعت دی جا رہی ہے۔ ہائی اسلامک انسٹی ٹیوٹ مزید ملک کے اندر قائم کیے جا رہے ہیں۔ اب تک چار قائم ہو چکے ہیں اور چار مزید قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔ یہ تو وہ رقم ہے جو ترکی حکومت کی طرف سے مذہبی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے صرف کی جاتی ہے۔ مگر ترکی کے مسلمان بھی بڑے فراخدل ہیں۔ مذہب سے انہیں موروثی شغف ہے۔ ترکی میں اس وقت دس ہزار ۸ سو ۳۰ رفاہی ادارے ہیں جو عوامی عطیات سے چلتے ہیں۔ یہ ادارے بھی دینی طلبہ کی امداد اور مساجد کی تعمیر و مرمّت میں بھرپور حصّہ لیتے ہیں۔

شیخ یشار سے خاکسار کا یہ انٹرویو اختتام پر تھا کہ ایک خوش پوش نوجوان کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑے تپاک سے سلام کیا۔ شیخ یشار نے اُن کا تعارف کرایا کہ یہ اگریکلچرل انجینئر ہیں۔ اور شعبۂ زراعت و آب رسانی کے ڈائرکٹر ہیں۔ شیخ نے میرا بھی اُن سے تعارف کرا دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا

کہ میں دو گھنٹے سے انہیں پکڑ کر بیٹھا ہوا ہوں۔ اور بات پھر ترکی میں مذہبی تعلیم تک آپہنچی۔ اگریکلچرل انجینئر صاحب نے معلومات میں مزید اضافہ یہ کیا کہ محکمہ امورِ دینی کے زیرِ اہتمام عورتیں بھی بطور واعظات کام کر رہی ہیں۔ اور اس کی مثال انہوں نے یہ پیش کی کہ خود ان کی بیوی انقرہ کے الٰہیات کالج کی گریجویٹ ہے۔ اور اب وہ واعظہ ہے۔ اور مختلف تقریبوں میں، مسجدوں میں منعقد ہونے والے خواتین کے مخصوص اجتماعات میں، مدرسوں میں، اور گھروں میں جا جا کر وعظ کرتی ہے۔

مولانا مودودی کے بارے میں شیخ لیشار کے خیالات

پھر کب ترکی میں قدم رکھنا نصیب ہو۔ اور کب شیخ لیشار اور ترک اخوان سے یوں ملاقاتیں ہوں۔ دل نے چاہا کہ جتنی بھڑاس نکالی جاسکتی ہے نکال لی جائے۔ رہتے رہتے میں نے ایک اور روایتی سوال شیخ لیشار سے کر دیا کہ مولانا مودودی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کسی تفکر یا تامل میں پڑے بغیر برجستہ فرمانے لگے:

"مولانا مودودی کی تحریروں نے نہ صرف ترکی بلکہ پورے عالمِ اسلامی میں اسلامی فکر کو زندہ کر دیا ہے۔ اور اُس کے جمود کو توڑ کر اُسے حیاتِ نو بخش دی ہے۔ اُنہوں نے اسلام کی تفہیم کے لیے وہ طرز اختیار کیا ہے جو بیسویں صدی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ بلکہ اس صدی میں ایسے ہی اسلوبِ تفہیم کی ضرورت تھی۔ نوجوانوں نے مولانا مودودی کی کتابوں سے اسلامی جذبات اور اسلام

کی محبت اُنھیں کی ہے۔ مسلمان نوجوان ان کے افکار و نگارشات کی بدولت
کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظریات سے بچ گئے ہیں۔ کیونکہ اُنھیں
اسلامی نظریہ پر ہی اطمینان ہو گیا ہے۔ یہ بہت عظیم خدمت ہے
جو مولانا مودودی کی عظیم شخصیت نے عہد حاضر میں انجام دی ہے۔
آنمحترم بیسویں صدی کے واحد لیڈر رہیں جنھوں نے ملّت کو صحیح اسلامی
فکر دی ہے۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ وہ عہد حاضر کے ایک
مجدد ہیں۔"

اناطولیہ کی سطحِ مُرتفع پر

رات صالح اوزجان کے ساتھ سنجان میں گزاری ہے۔ صبح استنبول کو روانہ ہوں گے۔ صالح اوزجان نے بتایا کہ صبح استنبول کے سفر میں ہمارے ساتھ انقرہ کے اور رفقار بھی ہوں گے۔ یہ استنبول کے ائیرپورٹ پر مولانا محترم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایک خاتون بھی اس قافلے میں شامل ہو گی۔ اس کا نام زینب گنتھا ہے۔ جس طرح شعکہ یوکسل نے ترک خواتین کے اسلامی جذبات بھڑکا رکھے ہیں اسی طرح زینب گنتھا بھی زبردست جوش خطابت دکھا رہی ہے اور ترکی کی نوخیز نسل کے اندر اس نے اسلامی دعوت کی سرگرم تحریک چلا رکھی ہے۔ اب صالح اوزجان کے بچے بھی گاؤں سے آچکے ہیں۔ اس لیے پہلے کی طرح صالح اوزجان کی تیار کردہ "امام بایلدی" اور "سجق" پر اکتفار نہیں رہا بلکہ صالح کی اہلیہ نے خالصتہً "ترکی دسترخوان" سجا دیا۔ اب انواع واقسام کے کھانوں کے نام گنوانا تو مشکل ہے البتہ کام و دہن کو وہ سرور و لذت اب تک یاد ہے جو مائدۂ صالح پر اُٹھائی۔ اور اگر لذت گیری میں انسان کی نفسیات کو بھی کچھ دخل ہے تو میں بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس لیے بھی ہر چیز لذیذ محسوس ہو رہی تھی کہ نفسیاتی طور پر میرا ذہن اُس وقت سے ایک سرور عمیق اور فرحتِ بے کراں میں غرق ہے جب سے شیخ لیشارہ کی زبان سے

ترکی کی موجودہ تحریک احیائے مذہب کی تفصیلات سُنی ہیں۔

آج ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۸ء ہے۔ علی الصبح وہ تمام رفقاء صالح صاحب کے مکان پر پہنچ گئے جو ہمارے ساتھ استنبول جانا چاہتے تھے۔ ایک رفیق حمدی پاشا اپنی گاڑی لے آئے اور تجویز کیا کہ اسی سے استنبول کا سفر کیا جائے۔ صالح اوزجان نے اپنا مکان پرانی وضع کے ایک چولہے سے گرم کر رکھا ہے۔ زمین سے بھی کافی اونچا ہے۔ مگر باہر اتنی سخت سردی ہے کہ نکلنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بارش دو روز سے متواتر ہو رہی ہے۔ اس لیے سردی دوچند ہو گئی ہے۔ ہمارے ڈرویش کا مکان بھی ایسی جگہ میں ہے کہ اس کے چاروں طرف تہ در تہ کیچڑ پھیل رہی ہے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے سامان مکان سے اُتار کر دور سڑک پر کھڑی ہوئی موٹر میں رکھا گیا۔ حمدی پاشا صاحب ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ زینب مُنتہا اور ایک اور صاحبزادی پچھلی سیٹوں پر تھے۔ باقی رفقاء آ گے۔ اور یہ قافلہ استنبول چل دیا۔

مختلف سڑکوں کی گردش کرنے کے بعد، جن کے نام یاد نہیں ہیں مگر ان کے دورویہ درختوں اور پھولوں کا منظر بار بار نگاہوں میں گھومتا رہتا ہے، ہماری موٹر اس بڑی شاہراہ پر آ گئی جو استنبول کو جاتی ہے۔ انقرہ کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ یعنی لاہور کی چوتھائی کے برابر۔ اس مختصر شہر سے باہر نکلنے میں دیر نہیں لگنی چاہیئے مگر بارش کی رِم جھم سے سڑکوں کی جو حالت ہو چکی تھی اُس کی بنا پر ہم گھنٹہ بھر اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ استنبول سے انقرہ آمد کے وقت رات کی تاریکی نے دیہاتی اور کوہستانی مناظر سے محروم رکھا۔ مگر اب دن کا وقت ہے۔ رفقاء ہم سفر ہیں۔ جس چیز پر نگاہ ٹکے گی اُس کا تعارف بآسانی ہو جائے گا

اناطولیہ کی سطحِ مرتفع پر

یہ اناطولیہ ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ ترکی کے یورپی حصّہ کے سوا باقی تمام علاقہ اناطولیہ کہلاتا ہے۔ شہر سے نکلتے ہی ناہموار پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ سلسلہ درمیان میں کہیں ٹوٹ جاتا ہے اور کہیں پھر بگڑ جاتا ہے۔ راستہ میں جگہ جگہ دیہاتی آبادیاں ملتی ہیں۔ یہ کسانوں کی سرزمین ہے۔ ترکی کی تین کروڑ ۴۰ لاکھ کی آبادی میں سے کوئی پچھتر فی صد لوگ دیہات میں مقیم ہیں۔ اور ان میں سے اکثریت سطحِ مرتفع پر رہتی ہے۔ سردی اور برف باری کی وجہ سے بہت کم لوگ ہمیں راستہ میں نظر آئے۔ پہاڑوں نے برف کی سفید چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ سُرخ کھپریل کی چھتوں کے چوبی مکان بھی برف کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ کسان مکانوں کے اندر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں کہ کب برف پگھلے اور زمین کا چہرہ بے نقاب ہو اور وہ قلبہ رانی شروع کریں۔ اگر وسیع اور ناہموار سطحِ مرتفع پر دُور ایک چھوٹا سا سیاہ دھبہ نظر آئے تو سمجھ لیں کہ یہ ایک آدمی گدھے پر سوار ہے۔ یہ معلّم یا واعظ ہے۔ تعلیم دینے کی غرض سے اس گاؤں جا رہا ہے جہاں وہ معلّمی کی خدمت پر مامور ہے۔ دُور دراز دیہی آبادیوں کی ایک مشکل یہ ہے کہ ان تک جانے کی کوئی سڑک نہیں ہے۔ اس لیے ان میں مواصلات کا آرام دہ ذریعہ گدھا ہو سکتا ہے۔ دیہاتی مرد عثمانی وضع کی شلواریں پہنتے ہیں۔ عورتیں لہنگوں کے بجائے چھینٹ کے پاجامے پہنتی ہیں، کمر میں پٹکا باندھتی، چہرے پر نقاب ڈالتی ہیں اور سروں پر نہایت عمدہ یزمے (سرپوش) باندھتی ہیں۔

جُوں جُوں دن آگے بڑھتا گیا فضا میں نکھار آتا گیا۔ اور سطحِ مرتفع کے نشیب و فراز صاف جھلکنے لگے۔ ایک جگہ ہماری موٹر رُکی۔ قریب کے ایک گاؤں کی چھوٹی چھوٹی بچیاں گھریلو دستکاری کے بہت سے نمونے بیچنے کے لیے اُٹھا لائیں۔ اُن میں کچھ سن رسیدہ عورتیں بھی تھیں۔ یہ نمونے ٹوکریوں، ٹوپیوں اور گھریلو استعمال کی چھوٹی چھوٹی اشیاء کی شکل میں تھے۔ ویسے ہی نمونے جو ہم نے مراکش میں فاس اور رباط کے درمیان موٹر کا سفر کرتے وقت راستے میں بچیوں کے ہاتھ میں دیکھے تھے۔ جنہیں وہ اٹھا اٹھا کر راہ گیروں کو خریدنے کے لیے پیش کرتی تھیں۔ شکر چنجرا کے انبار بھی بکثرت جگہوں پر نظر آئے۔ بھاری بھرکم ٹرک انہیں ڈھونے میں مصروف تھے۔ شکر چنجرا بڑے سائز کے شلغموں کی طرح ہوتا ہے۔ ترک اس سے چینی تیار کرتے ہیں۔

زینب غُنتھا کے نظریات و جذبات

ہمارا ڈرائیور حمدی پاشا بیک وقت دو کام سرانجام دے رہا تھا۔ ایک ڈرائیونگ جس میں اُسے بڑی مہارت کا ثبوت دینا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ سڑک میں بارش کی وجہ سے پھسلن تھی۔ اور بعض اوقات خطرناک نشیب و فراز آجاتے تھے۔ دوسرے تُرکی نغموں کے ریکارڈ لگانا اور ایک ریکارڈ ختم ہو جانے کے بعد دُوسرا لگانا۔ کچھ ریکارڈ وہ تھے جن میں عثمانیوں کی مدح و توصیف کے قصیدے ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ اور کچھ جہاد اور نعت سے متعلق۔ مَیں نے صالح اوزجان کی وساطت سے محترمہ زینب غُنتھا سے بعض سوالات کر دیئے۔ زینب غُنتھا چونکہ انقرہ کے الٰہیات کالج میں پڑھتی ہیں جہاں اسلامی علوم اور عربی زبان پڑھائی

جاتی ہے۔ اس لیے وہ عربی سمجھ جاتی ہیں بول نہیں سکتیں۔ میرے سوالات عربی میں تھے۔ اس لیے وہ سوال براہِ راست سمجھ جاتی تھیں۔ اُن کا جواب تُرکی میں ہوتا تھا۔ اور صالح اوزجان اُس کا ترجمہ عربی میں کر دیتے تھے۔ میرے سوالوں کے جواب میں موصوفہ نے جو تفصیلات بیان کیں وہ ملاحظہ فرمائیں۔

" مغربی تہذیب نے عورت کو اپنے مقام سے گرا دیا ہے۔ مغربی تہذیب میں عورت مرد کی دُہری خدمت انجام دیتی ہے۔ بیوی کی حیثیت سے بھی اُس کا بوجھ اٹھاتی ہے اور زندگی کی دَوڑ دھوپ میں بھی وہ مرد کے برابر کام کرتی ہے۔ اس طرح سے عورت ذلیل و رُسوا ہو کر رہ گئی ہے۔ اور مرد اُسے اپنی ہوس رانی کے لیے بوقلموں فیشنوں کے چکر میں ڈالے رکھتے ہیں۔ ترکی میں عورتوں کا ایک طبقہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہو چکا ہے۔ لیکن ہماری نگاہ میں وہ حد درجہ گِرا ہوا ہے۔ اس طبقے کے مرد تو خود زندگی کے طبعی فرائض سرانجام دیتے ہیں مگر اپنی عورتوں سے طبعی اور غیر طبعی دوگونہ فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اِسلام میں عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ ماں ہے، بیٹی ہے، بہن ہے، بیوی ہے۔ اُسے انسانی نسل کا محسن سمجھا جاتا ہے۔ وہ مرد کی پرائیویٹ زندگی میں ملکہ کا کردار ادا کرتی ہے۔ وہ حیا، شرافت، عفت اور پاکیزگی کے اوصاف سے متصف ہے۔ اولاد کی تربیت یا دُوسرے معنوں میں نسل انسانی کی بہتر سے

بہتر ساخت کا فرض انجام دیتی ہے۔ فیشن پرستی جیسی غیر سنجیدہ حرکتوں سے مبرّا ہے۔ وہ زندگی کو کھیل، تفریح اور نفس پرستی کا میدان نہیں سمجھتی۔ بلکہ اسے آزمائش گاہ سمجھ کر اپنی دنیا کو بھی سنوارنے اور اپنی آخرت کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ کھلونا نہیں ہے کہ مرد پہلے اُس کے ساتھ کھیلتا رہے اور پھر اُسے نادانوں کی طرح توڑ مروڑ کر رکھ دے۔ عورت اسلام کی ممنون ہے کہ اس نے انسانی سوسائٹی کے اندر اُسے صحیح مرتبہ عطا کیا۔

مغرب زدہ عورتوں سے مجھے ملنے جلنے کا عام اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ وہ میرے لباس کو دیکھ کر پہلے حیرت و استخفاف کا اظہار کرتی ہیں مگر جب میں ان کے دل کو ٹٹولتی ہوں تو وہ اعتراف کرتی ہیں کہ وہ فیشن سے نالاں ہیں۔ لیکن اگر وہ فیشن کا لحاظ نہ کریں تو مرد سر کہ جبیں ہو جاتے ہیں اور قدامت پرستی اور بے ذوقی اور فکر ژولیدگی کا اُسے طعنہ دیتے ہیں۔

مگر مجھے ایک مسلمان اور ایک ترک ہونے کی حیثیت سے فخر ہے کہ میرا سر پوشیدہ رہتا ہے۔ اور وہ آوارہ اور اوباش نوجوانوں کی نگاہوں اور قیاس آرائیوں کا ہدف نہیں ہوتا۔ میں ساق و سینہ کی نمائش نہیں کرتی۔ اور اپنی عزت و شرافت کے عوض حریص نگاہوں کی خدمت نہیں کرتی۔ میرا دل اس پر انتہائی مطمئن ہے کہ میں نے اپنی انوثت کو آشکار نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مردوں

کی پھبتیوں اور معاشرہ کی فضول پابندیوں کا خوف نہ ہو تو میرے کالج کی تمام لڑکیاں میرے ہی جیسا لباس فوراً سلوا کر پہن لیں۔

ایسی عورتوں کی بھی خاصی تعداد ہے جن کی فطرت فی الواقع تبدیل ہو چکی ہے۔ اور وہ مغربی لباس اور مغربی اطوار پر پوری طرح ایمان لا چکی ہیں۔ اور ان کے نزدیک سر، سینہ اور ران کو بلا تکلف عریاں کر لینا کوئی قباحت کی بات نہیں بلکہ یہ انتہائی روشن فکری اور وسیع النظری ہے۔ وہ ہمیں ناتراش اور اجڈ اور تاریک خیال کہتی ہیں۔

ہند و پاک کے لوگ خالدہ ادیب خانم کو بڑی اہم شخصیت سمجھتے ہیں۔ اُس کی قدر و قیمت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اتاترک کی منظورِ نظر تھی۔ اُس کی جو داستانیں ترکی میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اگر دُہرائی جائیں تو سر شرم کے مارے جھک جائے۔ خالدہ ادیب خانم نے ہندوستان جا کر ترک مسلمانوں کے خیالات کی صحیح ترجمانی نہیں کی ہے۔

مجھے پاکستان کی عورت کا لباس بہت محبوب ہے۔ تصویریں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی لڑکیاں پورا ساتر لباس زیبِ تن کرتی ہیں۔ شلوار، قمیض اور دوپٹہ تینوں ان کے لباس کے لازمی حصّے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ پاکستانی عورت کا لباس ترکی میں متعارف کرایا جائے۔ پاکستان کی اسلامی جماعت

کو ایسی کوئی اسکیم سوچنی چاہیئے کہ کم از کم ترکی کی اسلام دوست شہری خواتین تک یہ لباس ضرور پہنچ جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے الٰہیات کالج میں اپنی مساعی کو جاری رکھا تو کالج کی بہت سی طالبات میری طرح "رجعت پسند" بن جائیں گی۔ اب تک کی کوششیں کافی حوصلہ افزا ہیں۔ اس کالج میں مختلف خیالات کے اساتذہ ہیں۔ بعض ان میں ملحد بھی ہیں۔ اور بعض نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کے حامی ہیں۔ جو استاذ تفسیر پڑھاتے ہیں وہ اگرچہ مخصوص دائرے سے باہر نہیں جا سکتے مگر نام لیے بغیر وہ بدیع الزماں نورسیؒ کے تفسیری افکار کو بیان کر دیتے ہیں۔

کالج کے باہر بھی مجھے کافی مصروف رہنا پڑتا ہے۔ مختلف شہروں میں تقریروں کے لیے جانا پڑتا ہے۔ دیہاتوں میں بکثرت دورے ہوتے رہتے ہیں۔ میرے اجتماعات میں نئی نسل کی کافی حاضری ہوتی ہے۔ جس سے میں یقین کے ساتھ یہ سمجھتی ہوں کہ ترکی کی نئی نسل کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہے۔ قصبات اور دیہات کی خواتین بالکل روایاتی طرز کی مسلمان ہیں۔ دین سے انہیں بڑا عشق ہے۔ خود ہمارے لیے شروع میں ان تک رسائی حاصل کرنا مشکل تھا۔ وہ ہم سے ڈرتی تھیں۔ جیسے سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔ مگر بعد میں بسعی بسیار جب ان پر یہ واضح ہو گیا کہ ہم اسلام کا پیغام لے کر ان کے پاس آ رہی ہیں، تو ان کی

نفرت ختم ہو گئی۔

مجھے بدیع الزماں نورسی مرحوم سے بڑی محبت ہے۔ اس شخصیت نے تاریک حالات میں بھی اسلام کی شمع جلائے رکھی ہے۔ آج اس کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد ملک کے گوشے گوشے میں پائی جاتی ہے۔ جس قدر نوجوان اس سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں اسی قدر خواتین کے اندر بھی ان کی غیر معمولی عقیدت پائی جاتی ہے۔ دَورِ آزمائش میں ان کے رسائل کم سن لڑکیاں اپنے ہاتھوں سے نقل کر کے پھیلاتی تھیں۔ اس وقت اسلام پسند خواتین کی سب سے بڑی توجہ اسلامی تعلیم و تربیت پر مرکوز ہے۔ اس وقت فکری طور پر نوجوان نسل کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ جذبات اگر اسلامی ہوں اور ذہن شعوری طور پر اسلام کے حقائق سے آگاہ نہ ہو تو خطرہ رہتا ہے کہ کوئی غلط کار جذبات سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھا لے۔

مجھے پردہ اور دوسرے نظریات سے جو عورت کے متعلق مولانا مودودی نے بیان کیے ہیں پورا اتفاق ہے۔ "پردہ" ابھی تک میں نے نہیں پڑھا لیکن مجھے مولانا محترم کے خیالات سے کسی حد تک واقفیت ہو گئی ہے۔ مولانا کا لٹریچر ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ ترکی زبان میں ان کتابوں کی اشاعت کا یہ وقت نہایت موزوں ہے۔ اُمید ہے اس لٹریچر کی اشاعت بہت اچھے اثرات پیدا کرے گی۔

شعلہ یوکسل جس کا ذکر آج کل اخبارات میں داعیۂ اسلام کی حیثیت سے آرہا ہے وہ بے شک بڑی مخلص، قابل اور پُر جوش لڑکی ہے۔ اُس نے کالج کے اندر اسلام کے مخالف اساتذہ کے ساتھ تصادم لینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ مگر میری نظر میں ابھی وہ مزید تربیت کی محتاج ہے اور جوش و خروش کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے ابھی پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ شعلہ یوکسل بعض اوقات شدید طور پر جذبات میں بہ جاتی ہے۔"

بولو

سوالات و جوابات کی یہ متحرک مجلس طویل عرصہ تک موٹر کے اندر ہی منعقد رہی۔ موصوفہ اپنے خیالات بیان کرتیں۔ صالح اوزجان ترجمہ کرتے اور خاکسار ہمہ تن گوش ہو کر انہیں ذہن کے اندر نقش کرتا جاتا۔ یہ سلسلہ شاید ابھی طُول کھینچتا مگر نماز ظہر کا وقت آگیا۔ اتنے میں ہم ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ جس کے بائیں طرف مکانات اور دائیں طرف باغات تھے۔ یہ "بولو" ہے۔ صالح اوزجان صاحب کے مشورے سے موٹر ہم گاؤں کے اندر لے گئے۔ اور ایک حافظ صاحب کے مکان کو جا دستک دی۔ حافظ صاحب نوری تحریک سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے ہمارے ناگہانی ورود کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ نماز ظہر ان کے ہاں ادا کی۔ ترکی قہوہ پیا اور ترکی حلوہ کھایا۔ اور آخر میں حافظ صاحب کی دلنشین قراءت سُنی۔ موصوف کی خواہش ہے کہ انہیں پاکستان آکر اپنا فن پیش کرنے کا موقع ملے۔ بے گماں حافظ صاحب میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کسی وقت حسنِ قراءت کے

مقابلہ میں شریک ہوں۔ اس وقت وہ اپنے گاؤں اور اردگرد کی بعض آبادیوں میں معلمّی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اور محکمہ امور مذہبی سے وابستہ ہیں۔ صالح اوزجان سے اُن کا تعارف اس وقت ہوا جب دونوں نوجی تربیت حاصل کرتے تھے۔

بولو انقرہ سے کوئی ۱۵۱ میل کے فاصلے پر ہے۔ بولو سے چلے تو ڈزک کے مقام پر جا کر سانس لیا۔ یہ جگہ بہترین تفریح گاہ ہے۔ اردگرد خوبصورت مناظر ہیں۔ بعض سیاح شہری ہنگاموں اور مصنوعی حسن و آرائش کی نسبت اس خاموش اور پُرسکون سیرگاہ کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ویسے تو اناطولیہ کا چپّہ چپّہ سیرگاہ بھی ہے اور عبرت کدہ بھی۔ مگر خاص خاص مقامات تو جنّت نگاہ ہیں۔ یہ انہی میں سے ایک ہے۔ یہاں سڑک کے کنارے ہی ایک نہایت صاف ستھرا ہوٹل ہے۔ اور ہوٹل کے ایک پہلو میں مسجد بھی۔ صالح اوزجان نے بتایا کہ راستے میں جتنے بھی پڑاؤ آتے ہیں وہاں لازمًا مسجد ہو گی۔ ہم نے یہاں موٹر روک لی۔ پہلے عصر کی نماز ادا کر لی اور پھر کھانا کھایا۔ ہوٹل اندر سے شہری ہوٹلوں کی طرح نفیس و باوقار اور بارُعب تھا۔ اس میں حسنات کے ساتھ سئیات کو بھی دخل تھا۔ جہاں عالمی سیّاح ہوں گے وہاں سئیات کا وجود ناگزیر ہے۔

آدا بازاری

موسم دھندلا ہونے لگا۔ کپکپاتے ہوئے سورج نے رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ ہمارا سفر بھی نصف سے زیادہ کٹ چکا ہے۔ حمدی پاشا نے بھی اب رفتار تیز کر لی ہے۔ تاکہ تاریک سائے پھیلنے سے پہلے ہی منزل کو جا لیں۔ چنانچہ باتوں

ہی باتوں میں "آدابازاری" آگیا۔ اور رشاد کی بیکری میں ہم یکبارگی جا اُترے۔ یہ بیکری "نوری دعوت" کا ایک اہم مرکز ہے۔ رشاد نے بتایا کہ ان کا ماضی سراسر ناقابلِ ذکر ہے۔ چوری اور ڈکیتی اور غنڈہ گردی اُن کا مشغلہ تھا۔ شہر اور مضافات کے لوگ نالاں تھے۔ نوری تحریک کے بعض افراد سے ان کا ایک مرتبہ تعارف ہو گیا۔ اور یہ تعارف بڑھتا گیا۔ ان کی معصوم سی باتیں اور پُرسوز اپیلیں اور پاکیزہ کردار دل پر اثر کرتا رہا۔ اور آخر وہ ساعت سعیدہ آگئی کہ میں نے اپنی گناہ آلود زندگی سے توبہ کر لی۔ اب اس جماعت سے باقاعدہ وابستہ ہوں۔ رسائل نور تقسیم کرتا ہوں۔ اور لوگ محوِ حیرت ہیں کہ مَیں کیا سے کیا ہو گیا ہوں۔ مَیں اُن سے کہتا ہوں کہ یہ بدیع الزماں نورسیؒ کے اخلاص کا کرشمہ ہے۔ اللہ کے فضل سے اس شہر (آدابازاری) میں ہماری دعوت کا بڑا چرچا ہے۔ بیکری کا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ رشاد صاحب نے مجھے اپنے سابقہ دَور کی ایک تصویر بھی دکھائی۔ ایک بپھرا ہوا غنڈہ جس کا عضو عضو شرارت کی غمازی کر رہا ہے۔ جو اُسے دیکھے اُس کا زہرہ آب ہو جائے۔ وہ اب ایک باریش، متواضع اور پیکرِ حیا انسان کے قالب میں ڈھل چکا ہے۔ یہ اسلامی تحریک کا حیرت انگیز معجزہ ہے۔ رشاد صاحب نے بتایا کہ چوہدری غلام محمد مرحوم سے بھی میری ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ دَورۂ ترکی کے موقع پر اس شہر میں بھی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے یہاں ایک تقریر بھی کی تھی۔ تقریر اُردو میں تھی اور عارف بیگ (ایک ترکی طالب علم جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کیا ہے) نے اُس کا ترکی ترجمہ کیا تھا۔ رشاد صاحب کے پلچے کھائے اور نمازِ مغرب ادا کی۔ اور سوئے منزل روانہ ہو گئے۔

ساحل سمندر اور موجِ دعوت

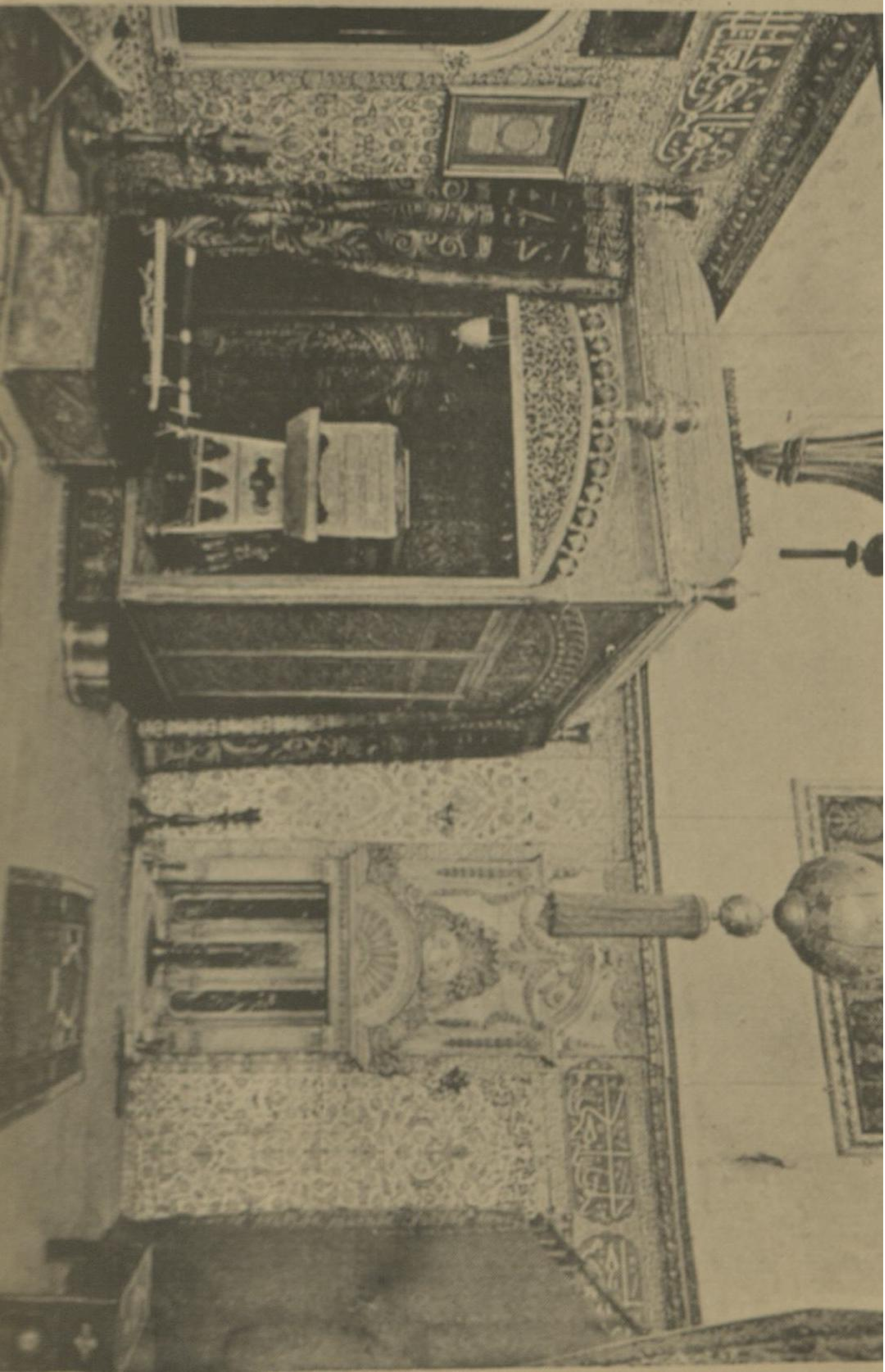
"عصمت" جہاں یونانیوں اور رومیوں کے آثار کثرت سے ملتے ہیں، ہم داخل ہوئے تو ہمارے بائیں ہاتھ، بحرِ مرمرا نے سر نکال لیا۔ اب ہمیں استنبول تک حد درجہ دلآویز مناظر ملتے جائیں گے۔ مرمرا کے ساحل سیاحوں کے دل کی دھڑکن ہیں۔ گرمیوں میں یہ پورا علاقہ باغ و بہار بنا ہوتا ہے۔ ترکی کے گوشے گوشے سے بھی ذی استطاعت لوگ یہاں دو مہینے گزار جاتے ہیں۔ مرمرا کا رنگ و روپ اور شگفتگی و دلآویزی اب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کلبہ نما مکانوں کا سلسلہ قائم ہے۔ کھپریل کی سُرخ اور سبز چھتیں ہیں جن پر برف کے تودے جم رہے ہیں۔ اونچے اونچے درختوں نے کیا بہار دکھائی ہے۔ موٹر سے جھانک کر دیکھیے تو شمشادِ دلشاد اور سروِ رواں کی قطاریں ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیں گی۔ مرمرا کا آبِ مرمریں سینۂ ترکی کے اُوپر بہتا ہوا اُترکی اور ترکوں کے دل میں ٹھنڈک پہنچا رہا ہے۔ اس کی پیچ و تاب کھاتی ہوئی لہریں اپنے مدّوجزر کا دلچسپ تماشا دکھا رہی ہیں۔ اور زبانِ حال سے یونانیوں، رومیوں اور عثمانیوں کے تہذیبی و سیاسی جوار بھاٹا کی تاریخ دُہرا رہی ہیں۔ ان کی تہ میں انسان کی کئی تہذیبوں کے عبرت ناک مرقعے پنہاں ہیں۔ صالح ازجان نے بتایا کہ جب گرمیاں آجاتی ہیں اور انسانوں کے جھنڈ کے جھنڈ مرمرا کے پانیوں میں اُتر جاتے ہیں اور سلسلۂ ساحل پر تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی، ہم اس انسانی اجتماع سے ایک اور ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صالح کی یہ بات سن کر میرا ذہن جو مرمرا کی تاریخ کی بوالعجب وادیوں میں کھو چکا تھا یکایک چونکا۔ اور صالح سے دریافت کیا کہ وہ کس نوعیت

کا استفادہ ہے جو اِس تفریح گاہ سے آپ اُٹھاتے ہیں۔

صالح نے میرے استفسار کے جواب میں کہا: مرمرا کے ساحل پر کم از کم تین ماہ تک تُرکی کے اطراف سے لوگ آکر اُتر جاتے ہیں۔ کچھ تفریح کے خیال سے، اور کچھ ارباب تفریح وسیاحت کی خدمت کے لیے اور کچھ تجارت کی گرم بازاری دیکھ کر۔ ہمارے بیشتر ساتھیوں کو بھی ان دنوں میں فراغت ہوتی ہے۔ ہم ساحل کے طول پر جگہ جگہ اپنے کیمپ لگا لیتے ہیں، جنہیں ہم تربیت گاہیں کہتے ہیں۔ ان کیمپوں میں ہم قرآن کریم کی تعلیم اور مبادیاتِ دین کی تدریس کا ایک مختصر نصاب جاری کر دیتے ہیں۔ کھیلوں کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ نماز کی عملی مشق بھی۔ لڑکیوں کے لیے الگ اور لڑکوں کے لیے الگ۔ ان کیمپوں میں کم سن بچوں اور بچیوں اور نوعمر لڑکوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو جاتی ہے۔ ساحل پر اُترنے والے تُرکی گھرانے ہماری ان تربیت گاہوں سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ تفریح آمیز تعلیم اور سیاحت بداماں تربیت بڑی کامیاب رہتی ہے۔ ہزارہا بچے اور بچیاں اور طلبہ اور طالبات روحانیت اور اخلاق کے موتیوں سے دامن بھر کر واپس لوٹتے ہیں۔ جب عام لوگوں پر مرمرا کا سحر طاری ہوتا ہے ہمارے رفقاء جنونِ دعوت سے بے حال ہو جاتے ہیں۔ ولکل فیما یعشقون مذاهب۔

دوبارہ استنبول میں

تبرکاتِ نبویؐ کا ہال، استنبول



رات کی جھلملاتی ہوئی روشنیوں میں ہم استنبول میں داخل ہوئے۔ اور پلک جھپکتے میں ہم ایشیائی ترکی سے یورپی ترکی میں قدم زن ہو گئے۔ باسفورس کو ایک اسٹیمر کے ذریعہ ہم نے بمع کار عبور کیا۔ صالح اوز جان جو ترکی تاریخ پر وسیع نظر رکھتے ہیں مجھے قدم قدم پر تاریخی عمارات سے متعارف کراتے رہے۔ جب ہم اُس عمارت کے پاس سے گزرے جس کے ساتھ ایک زمانے میں تمام عالمِ اسلامی کے دل وابستہ رہے ہیں تو صالح نے مجھے فوراً متوجہ کرتے ہوئے کہا یہ بابِ عالی ہے جہاں والیِ استنبول رہتا تھا۔ اس عمارت کے ساتھ ہی ایک بہت بڑی لائبریری ہے جو لاکھوں مخطوطات پر مشتمل ہے۔ اس لائبریری میں وہ خطوط بھی پڑے ہیں جو انگلستان اور یورپ کے حکمران بڑے عجز و نیاز اور آداب و انکساری کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کے حضور بھیجتے تھے۔ خلیفہ کا کسی خط کو پڑھ لینا اور اس جواب دے دینا ان کے لیے انتہائی شرف و سعادت کا موجب ہوتا تھا۔ دولمہ باغچہ کا مشہور قصر اور توپ کاپی قصر بھی قابلِ دید عمارات میں سے ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے تبرکات

یہاں قصر توپ کاپی کا تذکرہ خاص طور پر مناسب ہے۔ یہ قصر جو عثمانی خلفاء

کی اقامت گاہ رہا ہے اس وقت ایک میوزیم میں تبدیل ہو چکا ہے سلطان محمد الفاتح بھی اس قصر میں رہا ہے سلطان محمد الفاتح نے ۱۴۷۸ء میں ایک فرمان کے ذریعہ اس کے اندر "امانات مقدسہ" (تبرکاتِ نبویؐ) کے نام سے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ یہ کمرہ سلطان محمد الفاتح کا دیوانِ خاص تھا اور سلطان وہاں روزانہ کے امور سرانجام دیتا۔ اور زائرین سے ملاقات کرتا تھا اور خصوصی بیعت لیتا تھا۔ یہ کمرہ زلزلوں اور دوسرے حوادث کی بنا پر اپنی اصل طرز تعمیر پر قائم نہیں رہ سکا۔ بلکہ اس کی موجودہ ہیئت بعد کی ترمیموں کی بدولت وجود میں آئی ہے۔

تبرکاتِ نبویؐ کو جمع کرنے کا آغاز سلطان سلیم یاووز نے فتح مصر کے بعد کیا تھا۔ یہ تبرکات پہلے اسلحہ خانہ اور قصرِ راوان میں محفوظ کیے گئے تھے۔ یہ دونوں جگہیں بھی موجودہ کمرے سے متصل ہی ہیں۔ سلطان احمد اولؒ (۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء) نے اس کمرہ میں ایک صندوق جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے مبارک ہے، شاہی تخت کے اُوپر رکھوا دیا، اور اس سے یہ تاثر دیا کہ اس کی سلطنت مذہب کے ماتحت ہے۔ سلطان محمود دوم (۱۸۰۸ء — ۱۸۳۹ء) اس قصر کو خالی کر کے دوسرے قصر میں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد اس قصر کو تبرکات ہی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔

اس قصر میں متعدد تبرکات نبوی محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض کی نسبت محلِ نظر ہے۔ مگر عثمانی خلفاء نے عالمِ اسلامی کے مختلف حصوں سے ان تبرکات کو اہتمام سے جمع کیا اور اُسے یہاں محفوظ کر دیا۔ عام خیالات کے مطابق عثمانی خلفاء اس طریقہ سے دنیا کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو اپنی طرف مرکوز کرنا

چاہتے تھے۔ ان تبرکات کی تفصیل یہ ہے:

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط مقوقس شاہِ مصر کے نام: یہ نامۂ مبارک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۷ء میں قبطیوں کے بادشاہ مقوقس کو تحریر فرمایا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں یہ نامۂ مبارک ایک فرانسیسی شخص کو جس کا نام برشلیمے ہے۔ مصر میں قبطیوں کے ایک دَیر (عبادت گاہ) کے اندر ملا۔ اُس وقت قبطی انجیل کے ایک قدیم نسخے کے اندر یہ خط چسپاں کیا ہوا تھا۔ اس فرانسیسی عالم کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ مسلمانوں کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نامہ مبارک ہے تو اس نے اسے سلطان عبدالمجید کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سلطان نے اسے سونے کے فریم میں جڑوا دیا اور اسے سونے کے ایک مرصّع صندوقچے میں رکھوا دیا۔ یہ نامۂ مبارک کھال پر نقش ہے۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں بعض سطریں مدّھم ہو چکی ہیں۔ صندوقچے کے باہر کی جانب نامۂ مبارک کے اصل الفاظ منقش کر دیے گئے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی تلواریں: ان میں دو تلواریں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں۔ یہ چاندی کے ایک بکس کے اُوپر مخمل کے ٹکڑے میں جڑی ہوئی ہیں۔ سامنے کی جانب میں جو تلوار ہے اُس کی نیام اور دستہ سلطان احمد اوّل نے خالص سونے سے تیار کروایا اور اس پر قیمتی جواہرات مرصّع کروائے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دو مبارک تلواروں کے علاوہ اور بھی متعدد تلواریں رکھی ہوئی ہیں جو قیمتی اور مرصّع نیاموں کے اندر محفوظ ہیں۔ ان میں ایک تلوار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اور دوسری حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

کی طرف منسوب ہے۔ یہ دونوں تلواریں قدرے نیام سے باہر نکلی ہوتی ہیں۔
اسی طرح حضرت عثمانؓ اور حضرت عمرؓ کی الگ الگ تلوار بھی موجود ہے۔
تلواروں کے اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوس مبارک رکھی ہوتی ہے۔ اس
قوس کے خول کے اوپر ایک قصیدہ کندہ ہے جس میں قوس کی مدح کی گئی ہے۔
ردائے مبارک۔ یہ ردائے مبارک ایک سنہری صندوقچی میں رکھی ہوئی ہے۔
یہ صندوقچی ایک اور مرصع اور خوبصورت سنہری صندوقچے کے اندر محفوظ ہے۔
جس پر قرآن کریم کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ یہ آیات سلطان عبدالعزیز (۱۸۶۱ء۔
۱۸۷۶ء) نے کندہ کروائی تھیں۔ یہ مشہور ہے کہ یہ وہی ردائے مبارک ہے جو آنحضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن زہیر کو عنایت فرمائی تھی۔ کعب بن زہیر نے آنحضور
کی شانِ مبارک میں وہ طویل قصیدہ پیش کیا تھا جسے قصیدۂ بُردہ (چادر والا
قصیدہ) کہا جاتا ہے۔ جب کعب بن زہیر نے یہ شعر پڑھا

ان الرسول لنور یستضاء بہ

مھند من سیوف اللہ مسلول

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نور ہیں جس سے اہلِ جہاں ضو
حاصل کرتے ہیں۔ اور آپؐ اللہ کی برہنہ اور قاطع تلوار ہیں)

تو اس شعر پر آنجنابؐ مسکرا دیئے۔ اور آپؐ نے کعب بن زہیر کو اپنی چادر
مبارک عطیہ فرمائی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت کعبؓ سے یہ چادر دس ہزار
درہم کے عوض خریدنا چاہی۔ مگر حضرت کعبؓ راضی نہ ہوئے۔ حضرت کعب
کی وفات کے بعد اُن کے ورثاء نے یہ چادر بیس ہزار روپہلی دراہم کے عوض

فروخت کر دی۔ اور یہ اُموی حکمرانوں کے پاس چلی گئی۔ اور اُن سے عباسی سلاطین کو منتقل ہو گئی۔ اور عباسیوں کے ہاتھ سے نکل کر مصر تک کیسے پہنچ گئی، اس سلسلہ میں متعدد روایات منقول ہیں۔ ۱۰ فروری ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم یاووز نے مصر کو فتح کیا۔ اور دوسرے تبرکات کے ساتھ ردائے مبارک بھی اُسے پیش کر دی گئی۔ سلطان سلیم یاووز نے یہ تمام تبرکات مصر سے استنبول منتقل کر دیئے اور اُنہیں قصر توپ کاپی میں رکھوا دیا۔

ان تمام تبرکاتِ شریفہ میں سے اہم چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عَلم مبارک ہے۔ یہ وہی عَلم ہے جسے مسلمان سلاطین اور سپہ سالار جنگوں میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ یہ عَلم اب جگہ جگہ سے تلف ہو چکا ہے۔ اس لیے اُسے ایک مخصوص صندوقچے میں بند کر دیا گیا ہے۔

مُہر مبارک: یہ مُہر مبارک بڑی انگوٹھی کے سائز میں ہے۔ اور اس پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ منقش ہیں۔ اور صدیوں سے یہ تبرکات نبوی کے ساتھ محفوظ چلی آ رہی ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت قطعاً مشکوک ہے۔

دندانِ مبارک: غزوۂ احد کے موقع پر جو آپؐ کا دندان مبارک شہید ہو گیا تھا یہ اُس کا ایک حصّہ ہے۔ اور ایک مخملی ڈبیہ کے اندر محفوظ ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں اس کمرے میں موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کا ایک قدیم ترین نسخہ۔ موئے مبارک۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کا نشان۔ یہ نشان ترکی فوج کا سپہ سالار احمد بیگ طرابلس الغرب (شمالی افریقہ) سے لایا۔ اور اُس نے ۱۸۴۷ء میں سلطان مجید کی خدمت میں پیش کیا۔ اور سلطان

سے ایک لاکھ ۱۴ ہزار قرش بطور انعام پائے۔ ۱۸۷۷ء میں سلطان عبدالمجید ثانی نے اسے ایک سنہری فریم میں جڑوا دیا۔ میزابِ کعبہ۔ غلافِ کعبہ کے ٹکڑے۔ کلید بیت اللہ۔ باب کعبہ کا ایک بازو۔ ۱۵۹۲ء میں جب سلطان مراد سوم کے حکم سے بیت اللہ شریف کا دروازہ تبدیل کیا گیا تو پرانے دروازے کا ایک بازو استنبول منگوا کر اُسے اس کمرہ میں رکھوا دیا گیا۔ سلطان احمد سوم (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۳۰ء) کے ہاتھ کا لکھا ہوا کلمہ شریف۔ سلطان احمد سوم بڑا خوشنویس تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے کلمہ شریف کا یہ طغرا رقم کیا تھا۔

ان تمام تبرکات اور آثار میں سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب جو چیزیں منسوب ہیں وہ اہلِ تحقیق کے نزدیک محلِ نظر بلکہ بعض قطعاً مشکوک ہیں۔ مگر اس پہلو سے قطع نظر صرف یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عثمانی خلفاء اور سلاطین کو ایسی چیزوں سے بے حد محبت تھی اور انہیں جہاں جہاں سے ایسی چیزیں دستیاب ہوئیں انہوں نے استنبول میں محفوظ کر لیں۔ اور ان کی حفاظت اور ترصیع اور تجمیل پر غیر معمولی توجہ دی اور بڑی دولت صرف کی۔ اور ان کے لیے ایک مستقل میوزیم قائم کیا۔

سپاہی ہوٹل میں

میں اور صالح اوزجان سپاہی ہوٹل میں اُتر گئے اور دوسرے رفقاء اپنے اعزہ واحباب کے گھروں میں اُتر گئے۔ اور پروگرام یہ تھا کہ رات کو ایک رفیق کے مکان پر استنبول کے تمام رفقاء جمع ہو رہے ہیں۔ اس اجتماع میں مجھے اُن سے تبادلۂ خیالات کرنا ہوگا۔

ترکی میں میری یہ آخری رات ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اب آرام کروں۔ مسلسل سفروں اور ملاقاتوں کی وجہ سے بے حد تھکاوٹ ہو چکی ہے۔ سارا دن سفر میں گزرا ہے۔ راستہ میں کسی جگہ استراحت کا موقع نہیں ملا۔ سردی بھی عنفوانِ شباب پر ہے۔ اور باہر تو اس وقت بارش کی حکمرانی ہے۔ یہ سب کچھ ایک طرف مگر دوبارہ ایسے مواقع قسمت سے ملیں گے۔ ترکی کے احباب و اخوان کو جماعتِ اسلامی پاکستان اور مولانا مودودی مدظلّہ العالی کے متعلق مفصّل معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔ تصوّر نے جب تصویر کے اس پہلو کو دیکھا تو جسم نے ایک جھرجھری لی۔ اور تھکاوٹ کا احساس یکلخت رخصت ہو گیا۔ اب میں ذہناً اور جسماً مکمل تیار تھا کہ صالح صاحب مجھے جس اجتماع میں بھی لے جانا چاہتے ہیں لے چلیں۔ رات ہماری ہے۔ باتیں اُن کی۔

پُر پیچ اور ناہموار گلیاں

برفانی اور ظلمت آمیز رات میں ہم اس مکان کی طرف نکل گئے جہاں اجتماع قرار پایا تھا۔ صالح صاحب اصلاً انقرہ میں رہتے ہیں اس لیے انہیں رفقائے استنبول کے مکانات وغیرہ کے بارے میں اَپ ٹو ڈیٹ معلومات نہ تھیں۔ ہم استنبول کے ایک "اصلی" اور "روایتی" محلّے میں پہنچ گئے۔ گلیوں کا یہ حال کہ اِدھر اوپر چڑھے اور اُدھر نیچے لُڑھکے۔ بارش برابر برستی رہی۔ تاریکی اس پر مستزاد۔ دیر بھی کافی ہو گئی۔ لوگ اپنی اپنی آرام گاہوں میں بیٹھے بجلی کے ہیٹروں یا تیل کے قدیم طرز کے چولہوں سے اکتسابِ تپش کر رہے تھے۔ تاریکی کی دبیز چادر کے اندر بعض روشندانوں سے ہلکی اور لاغر سی روشنی جھلک رہی ہے جیسے کسی بڑھیا کا دیا سرِ شام ٹمٹما رہا ہو۔

کسی کسی مکان سے دھیمی دھیمی آواز قرآن کریم پڑھنے کی سُنائی دیتی۔ ہم نے ٹیکسی دُور سڑک پر چھوڑ دی تھی۔ اب پا پیادہ ہی منزل مطلوب کی جستجو کر رہے تھے۔ پہلے ایک مکان میں دستک دی۔ ایک خاتون دروازے پر آئی اور اُس نے بتایا کہ یہ وہ مکان نہیں ہے جس کی تمہیں تلاش ہے۔ ایک اور مکان سے بھی یہی جواب مِلا۔ میں نے دل میں سوچا کہ صالح اوزجان "تکلّف" کر رہے ہیں۔ اب کہ ثُلثِ شب گزر چکی ہے اور سردی سے دانت بج رہے ہیں رفقاء کا جمع ہونا دیسی چیز ہے۔ عملاً ممکن نہیں ہے۔ صالح صاحب سے مَیں نے اپنے قیاس کا اظہار بھی کر دیا۔ مگر انہوں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اور کہنے لگے یقیناً اجتماع ہوگا اور ہمارا اُس میں شریک ہونا لازم ہے۔ چنانچہ وہ پورے جوش و خروش اور عزم و ہمت اور پھرتی سے تلاشِ منزل میں مجھے پُر پیچ اور ناہموار گلیوں کے اندر لیے لیے پھرتے رہے۔ کافی تگ و دو کے بعد ہم ایک رفیق کے مکان پر پہنچے۔ اندر سے ایک چھریرے بدن کا نوجوان نکلا۔ اُس نے بتایا کہ جن صاحب کا آپ نام لے رہے ہیں وہ یہاں سے منتقل ہو کر ایک دوسرے مکان میں چلے گئے ہیں۔ ہماری بے بسی ہمارے چہروں سے عیاں تھی۔ اس لیے اُس نے زیادہ پُوچھ گچھ کرنے کے بجائے چہروں سے ہی تمام حکایت سمجھ لی۔ اور فوراً اندر گئے اور اپنا اوورکوٹ اوڑھ کر ساتھ پہن کر ہمارے ساتھ چل دیئے۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد ہم مکانِ اجتماع تک پہنچے۔ ہمارا گائیڈ جو ہمیں جانتا نہ تھا سیڑھیوں پر ہمیں رخصت کر کے واپس ہو گیا۔ ہم دونوں کی زبان اس کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ مگر یہ اس کا اس قدر احسانِ عظیم تھا کہ زبان بھی ادائے شکر میں قاصر ہو رہی تھی۔

مکان کے اندر قدم رکھتے وقت مَیں سوچ رہا تھا کہ دیکھیے ہم دونوں میں سے کس کا قیاس درست نکلتا ہے اور کون "ولایت" کی بازی جیتتا ہے۔ خاکسار کو قریب قریب یقین تھا کہ اپنی ہی "پیشین گوئی" سچی نکلے گی۔ مگر جب ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تو اپنی شکست پہلے ہی قدم پر واضح ہو گئی۔ دیکھا کہ پورا کمرہ بھر رہا ہے۔ اور لوگ بے تابی کے ساتھ ہمارے منتظر ہیں۔ حاضری پچاس ساٹھ سے کم نہ تھی۔ چیدہ چیدہ رفقاء ہی مدعو تھے۔ سب سے الگ الگ تعارف ہوا۔ نگاہوں نے محبت کے جاموں کا تبادلہ کیا۔ دلوں نے دھڑک دھڑک کر ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا۔ زبان کی ناآشنائی کی مشکل ترجمانوں نے حل کر دی۔ محفل میں نوجوان بھی تھے اور سن رسیدہ بھی۔ رشتۂ دعوت نے سب کو باہم ملا رکھا ہے۔ ایک نوجوان جو جرمنی میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں اور عربی زبان نہایت شُستہ، فصیح اور رواں بولتے ہیں، وہ اس محفل میں موجود تھے۔ جرمنی میں بھی وہ اسلام پسند طلبا کی تنظیم سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے خاکسار کی ترجمانی کی خدمت انجام دی۔

رفقائے دعوت سے تبادلۂ خیال

اس محفل میں میرا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے ترکی میں احیائے دین کی سرگرمیوں کی تفصیلات سے آگاہی حاصل ہو، اور حاضرین کا یہ اصرار کہ انہیں پاکستان کی اسلامی تحریک کی مکمل تفصیل بتاؤں۔ بہر حال مجھے ہی ان کے اصرار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور مَیں نے جماعت اسلامی کی تاسیس سے اب تک اس کے تمام کام کی رُوداد سُنا دی۔ انقرہ اور قونیہ کی محفلوں میں جماعت کے بارے میں مختلف تقریریں کر چکا ہوں۔ استنبول کی اس محفل میں سب تقریریں تفصیل مزید

کے ساتھ دُہرا دیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک میں یہ داستان سرائی کرتا رہا۔ اور حاضرین انہماک اور شوق سے سُنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو سوالات شروع ہو گئے اور موضوع کے جو گوشے تشنہ یا اوجھل رہ گئے تھے وہ بھی سامنے آ گئے۔ البتہ ایک سوال اس محفل میں یہ کیا گیا کہ کیا ایسی مثالیں بھی ہیں کہ لوگ جماعت میں داخل ہوئے ہوں اور انہیں جماعت میں اچھا مقام ملا ہو اور وہ پھر غیر مطمئن ہو کر جماعت کو چھوڑ گئے ہوں۔ یہ سوال مجھے خاصا معنی خیز محسوس ہوا۔ لیکن سوال کرنے والا شخص ایسا معقول اور سنجیدہ تھا کہ اسے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ سوال ازراہِ معلومات کیا گیا ہے۔ کوئی مخصوص ذہنی پس منظر اس کی تہ میں کارفرما نہیں۔ سائل جناب مصطفیٰ پولات تھے، استنبول کے ہفت روزہ اسلامی جریدہ اتحاد کے مدیرِ اعلیٰ۔ ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ ملاقات صرف اسی محفل میں ہوئی۔ میں نے پوری صراحت، اور ضروری تفصیل کے ساتھ، بتا دیا کہ لوگ جماعت میں داخل ہوتے اور نکلتے رہے ہیں۔ نکلنے والے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے ذاتی اسباب و وجوہ کی بنا پر یا جماعت سے نظری و فکری اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ سے جماعت سے ازخود مستعفی ہو جاتے ہیں اور دوسرے وہ جنہیں بوجوہ خود جماعت خارج کر دیتی ہے۔ جماعت کا باقاعدہ دستور ہے۔ جماعت میں داخل ہونے والا شخص اس دستور کی وفاداری کا عہد کرتا ہے۔ اس دستور میں رکن کے لیے دینی اور اخلاقی پابندیاں بھی واضح کر دی گئی ہیں اور نظم و ضبط کی قیود بھی۔ جو شخص ان پابندیوں اور قیود کی دانستہ خلاف ورزی کرتا ہے اور اطلاع کے باوجود اپنی اصلاح نہیں کرتا تو جماعت اُسے دلائل و حقائق کی روشنی میں خارج کر

دیتی ہے۔ یہ عمل اُس وقت سے جماعت میں جاری ہے جب سے یہ وجود میں آئی ہے۔ اس اصولی تشریح کے بعد میں نے جماعت میں سے نکلنے والے چند نمایاں اصحاب کے نام بھی بیان کیے۔ اور خاص طور پر دو گروپوں کا مسئلہ میں نے اس موقع پر صفائی کے ساتھ پیش کر دیا۔ ایک وہ گروپ جو جماعت کے آغاز ہی میں جماعت کو چھوڑ گیا تھا۔ اور دوسرا وہ بڑا گروپ جو ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ عام کے بعد نکلا ہے۔ مَیں نے نکلنے والوں کے اعتراضات و دلائل اور جماعت اور مولانا مودودی مدظلہ العالی کے مؤقف دونوں پہلوؤں کو کھول کر رکھ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض دوستوں کا یہ خیال ہو کہ ان قصّوں کی زیادہ تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ لیکن میرے دل نے یہ کہا کہ حاضرین خود ایک نظریاتی جماعت سے وابستہ ہیں۔ اجتماعی زندگی کا مزاج ہر جگہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ جہاں کوئی جمعیت منظم ہو گی وہاں لازماً اندرونی اختلافات بھی زُود یا بدیر اُبھریں گے۔ اس لیے ان پہلوؤں کو بلا تحفّظ و انشگاف کرتے رہنا مفید ہی ہوتا ہے۔ یہ موضوع ایسا چھڑا کہ اس میں سوال در سوال کا طویل سِلسلہ شروع ہو گیا اور آدھی رات تک یہ بحث ہوتی رہی۔ اس میں عہدِ حاضر کی دوسری اِسلامی تحریکوں کا ذکر بھی ہوا۔ حاضرین آپس میں بھی اپنی زبان میں مناقشہ و بحث کرتے رہے۔ اور مجھ سے بھی پوچھ گچھ ہوتی رہی۔

تحریک میں رخنہ اندازی

آخر میں مصطفیٰ پولات صاحب نے یہ عُقدہ یوں حل کیا کہ نوری تحریک کے اندر بھی اس وقت کچھ ایسے افراد نکل آئے ہیں جنہوں نے اختلافات

کھڑے کر دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو بدیع الزماں نورسی مرحوم کا اصل جانشین سمجھتے ہیں۔ اور بعض افراد تو خاص طور پر یہ خدمت انجام دے رہے ہیں کہ تلامذۂ نور کے اندر باہمی عدم اعتمادی پیدا کی جائے۔ بلکہ ایک دوست کے بیان کے مطابق ترکی کے یہودی خاص طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ یہاں اہلِ دین کے اندر مذہبی جنگ بھڑکا دی جائے کیونکہ ان کے نزدیک طوفان کی طرح اُبھرتے ہوئے اِسلامی جذبات و افکار کو روکنے کا یہی ایک راستہ ہے مصطفیٰ کمال پاشا کے عہد میں مذہبی حلقوں پر پژمردگی چھا گئی تھی۔ اور وہ مذہبی تفرقے جو دوسرے مسلمان ملکوں میں نظر آتے ہیں ترکی کی سرزمین سے رخصت ہو گئے تھے۔ اس وقت مذہب کے میدان میں ترکی کے اندر کوئی اختلاف نہیں۔ مگر اب بعض "صوفیاء" کو برانگیختہ کیا جا رہا ہے اور ان کے ذریعہ سے یہ پروپیگنڈا کروایا جا رہا ہے کہ ترکی میں جو گروہ اپنے آپ کو اسلام پسند کہتا ہے اس کا عقیدہ خراب ہے۔ وہ اولیاء اللہ کی توہین کرتا ہے اور معرفت اور طریقت کے خلاف "زبان درازی" کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ حسین حلمی عشق نامی ایک بزرگ خاص طور پر اس کام پر مامور ہیں۔ اور وہ اس موضوع کو زیادہ سے زیادہ ہوا دینے کے لیے پمفلٹ چھاپ کر تقسیم کر رہے ہیں۔ ان پمفلٹوں کے اندر مولانا مودودی، حسن البنّاء اور دوسرے اسلامی رہنماؤں کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے اور ان کے خلاف بے سر و پا باتیں اور جھوٹا پروپگنڈا کیا گیا ہے۔ ایک اور صاحب نے بتایا کہ یہاں کی اِسلامی تحریک کو زک پہنچانے کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ اِسلامی تحریک کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ایسی

تند و تیز باتیں کی جائیں جن سے یہاں کے یہود اور دونمہ اور ملاحدہ خواہ مخواہ بھڑکیں اور ان کے کان کھڑے ہو جائیں۔ اور وہ تحریک کو کچلنے کے لیے کمر کس لیں۔ ایک اچھے معقول آدمی کا نام بھی لیا گیا جو اس سازش میں ملوث ہیں۔

ایک نوجوان اُٹھا۔ اور کہنے لگا۔

"میں اور میرا والد (جو اس وقت قونیہ میں ہیں) دونوں اکٹھے جیل میں رہے ہیں۔ اور دونوں نے مل کر مصائب کو جھیلا ہے۔ میرا اسلامی شوق مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی تک پہنچائیں، اور ان سے گزارش کریں کہ وہ ایک مرتبہ ضرور ترکی تشریف لائیں اور مشتاقانِ دید کی پیاس دُور کریں۔ ہم تو مدّت سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور حال ہی میں پتہ چلا تھا کہ وہ ترکی آنے والے ہیں مگر اب صالح اوزجان صاحب کی طرف سے ہمیں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ انہوں نے سرِدست یہ دَورہ منسوخ کر دیا ہے۔ یہ ہمارے جذبات اور آرزوؤں کے خلاف فیصلہ ہوا۔ اگر اس فیصلے میں صالح اوزجان صاحب کی رائے کو دخل ہے تو وہ اس کا جواب دیں۔ اور اگر مولانا محترم نے خود اپنے کسی عذر کی بنا پر پروگرام میں یہ تبدیلی کر دی ہے تو ہم اُن سے درخواست کریں گے کہ وہ اوّلین فرصت میں اپنا یہ وعدہ پورا کریں۔ ہم اُن کی صحت اور درازیٔ عمر کی دُعا کرتے ہیں۔"

اس نوجوان کے والد کو انہی جذبات سے بھرا ہوا مَیں نے قونیہ میں دیکھا تھا۔ مَیں نے دل ہی دل میں کہا کہ اللہ کی شان ہے کہ یہ نوجوان ہزاروں میل دُور ترکی میں رہتا ہے مگر پاکستان کے اِسلامی رہنما کے ساتھ اس قدر والہانہ محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اُس کا انداز، جوش اور شرربار آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اگر اُس کا بس چلے تو وہ مولانا محترم کو کل ہی استنبول کے ہوائی اڈے سے اُتار لے۔ اور دل کی بھڑاس نکال لے۔ اب صالح اوزجان جواب دہی کے لیے اُٹھے اور بتلانے لگے کہ خود میری خواہش اور کوشش مدتوں سے یہ ہے کہ مولانا مودودی ترکی کا دَورہ کریں۔ مَیں ہر ملاقات میں اس دعوت کی تجدید کرتا رہا ہوں۔ اور مَیں خود بھی اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اُن الفاظ کی تائید کرتا ہوں جو ابھی میرے ایک بھائی نے کہے ہیں۔

دوسرے اجتماعات میں بھی اور اس اجتماع میں بھی خاص طور پر مجھ سے یہ مطالبہ دُہرایا گیا کہ جماعت اِسلامی پاکستان ہمارے رہنما بدیع الزماں نورسی کی تعلیمات کو پاکستان کے مسلمانوں تک پہنچانے کا فرض ادا کرے۔ اُن کے اس مطالبے کے پیچھے اصل محرک یہ پنہاں ہے کہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس دَور میں مصطفیٰ کمال پاشا کا ترکی میں طوطی گونجتا رہا ہے باہر کے لوگوں کا اس دَور کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ گویا پورا ترکی اُن کا ہمنوا تھا اور اُن کے خیالات و افکار اور اصلاحات و اقدامات ترکی قوم کی سو فیصد ترجمانی کر رہے تھے۔ اس لیے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مصطفیٰ کمال پاشا کے بہت سے قوانین اور اقدامات ایسے ہیں جن کی مخالفت کی گئی ہے اور جن کو بدلنے کے لیے شدید کشمکش اور جہاد

کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت تب واضح ہو سکتی ہے کہ بدیع الزماں نورسی مرحوم کی اُس دور کی تحریریں، رسالے اور پیغامات سامنے آجاتیں۔ اور اس طرح سے تُرک مسلمانوں کی کسی حد تک "آبرو" بحال ہو جائے۔ اور وہ اس الزام سے بری ہو جائیں کہ جب کمال پاشا لادینی قوانین نافذ کر رہے تھے اور اذان، نماز اور عربی زبان کو ختم کر رہے تھے تو کوئی زبان جنبش میں نہ آئی اور کسی ہاتھ نے کلمۂ حق رقم نہ کیا۔ خاکسار نے ہر جگہ نوری اخوان کے اس مطالبے کی حمایت کی اور عہد کیا کہ ہم انشاء اللہ پوری کوشش کریں گے کہ نورسی مرحوم کی تعلیمات اُردو میں منتقل ہو جائیں۔ اور خود ان کی اپنی سوانح حیات پر بھی اُردو زبان میں ایک جامع کتاب منظرِ عام پر آ جائے۔

اس اجتماع کی پُوری کارروائی ایک نوری بھائی جناب مصطفیٰ پولات[1] نے قلمبند کر لی اور پھر اُس کے ضروری حصّے ہفت روزہ اتحّاد (استنبول) میں شائع کیے۔

---

[1] مصطفیٰ پولات بڑے شکیل و وجیہ اور ذہین و فطین نوجوان تھے۔ ان کا دل اسلامی جذبات سے بے حد معمور تھا۔ اور انہوں نے اپنی پُوری زندگی اسلامی دعوت کے لیے وقف کر دی تھی۔ تُرکی کی اسلامی تاریخ کا وہ نہایت قیمتی سرمایہ تھے۔ ہفت روزہ اتحّاد کو بڑی خوش اسلوبی اور جاذبیت کے ساتھ چلا رہے تھے۔ اُسے روزنامہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کام کے لیے انہوں نے دن رات ایک کر رکھے تھے۔ مگر افسوس کہ موصوف ـــــ کار کے حادثے میں شہید ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے ـــــ خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود۔

رات سپاہی ہوٹل میں گزری۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کا سورج طلوع ہوا۔ صبح ناشتہ کے بعد سامان پوری طرح باندھ لیا تاکہ دن بھر اطمینان سے استنبول میں گھوم پھر لیں اور جب جہاز کا وقت قریب ہو جاتے تو فوراً ہوائی اڈے کی طرف چل دیں۔ دن کا زیادہ وقت ٹکٹ تبدیل کرنے اور استنبول سے کراچی تک پی آئی اے میں سیٹ بک کرانے میں گزرا۔ میرا ٹکٹ سعودی عربیہ ائر لائنز کا تھا۔ لیکن اب مجھے استنبول سے پی آئی اے کے جہاز میں سوار ہونا تھا کیونکہ مولانا محترم لندن سے اسی جہاز میں آ رہے تھے۔ چنانچہ اس ٹکٹ کو پی آئی اے کی طرف منتقل کرانے کے لیے پہلے میں اور صالح اوزجان صاحب سعودی عربیہ ائر لائنز (الخطوط الجوية السعودية) کے دفتر میں گئے۔ مدیر صاحب صالح اوزجان کے دوست تھے۔ مگر دو ڈھائی گھنٹہ کی مغز ماری کے باوجود یہ صاحب ٹکٹ کو منتقل کرنے پر راضی نہ ہوتے۔ ان کا یہ رویّہ نرالا نہ تھا۔ مجھے سعودیوں کا خوب تجربہ ہے۔ جو بات ان کے دماغ میں کسی وجہ سے نہ اترے اُسے یہ ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ ہمارے نزدیک یہ قصّہ بہت معمولی تھا۔ مگر ہم اس دفتر سے ناکام و نامراد نکلے، اور صالح اوزجان کو آخر کار میرے لیے ایک نیا ٹکٹ استنبول تا کراچی خریدنا پڑا۔

وکیل نُور کے گھر میں

دوپہر کا کھانا ایک نہایت دلچسپ دوست کے ہاں کھایا۔ ان کے نام کا پہلا جزء غالباً احمد ہے۔ اور دوسرا جزء خالصتہً ترکی جو اب ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ یہ وکالت کا پیشہ کرتے ہیں۔ اور نہایت کامیاب وکیل سمجھے جاتے ہیں۔ نوجوان ہیں، وجیہہ اور منوّر چہرہ، دُہرا جسم، تواضع اور ملنساری کے آثار چہرے سے

ہمریدا۔ ان کے گھر میں داخل ہوئے تو لپک کر صالح اوزجان اور خاکسار سے ملے۔ اور پہلی بات یہ کی کہ "مجھے افسوس ہے کہ رات کے اجتماع میں شریک نہیں ہو سکا۔ مَیں رات دیر سے پہنچا ہوں۔ اِزمیر گیا ہوا تھا۔ دو دن کے بعد رات واپس آیا ہوں۔" ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ۱۰-۱۲ نوجوانوں کی ایک جماعت پہلے سے موجود تھی جو بعض معاملات پر وکیل صاحب سے تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ صالح صاحب نے وکیل صاحب کا تعارف یہ کرایا کہ یہ "وکیلِ نُور" ہیں۔ مَیں نے "طلبۂ نُور" اور "اخوانِ نُور" کے وزن پر یہی سمجھا کہ یہ بھی نوری دعوت سے متاثر ہیں۔ اور وکالت کا پیشہ کرنے کی وجہ سے وکیلِ نُور کہلاتے ہیں۔ مگر بات اس خیال سے آگے نِکلی۔ صالح صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ موصوف پہلے ایک عام وکیل تھے۔ اور خوب کماتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ پیشتر یہ جماعتِ نُور کی دعوت سے متاثر ہو گئے۔ اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اس تحریک کے لوگ بکثرت گرفتار کر لیے جاتے ہیں اور انہیں طویل مقدمہ بازی میں اُلجھایا جاتا ہے اور جیلوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اور ان کا جُرم اس کے سوا کوئی نہیں ہوتا کہ یہ "رسائلِ نُور" (بدیع الزماں نورسی مرحوم کی تصنیفات اور خطبے) پھیلاتے ہیں۔ یہ بہت دِل گیر ہوئے اور انہوں نے اپنے آپ کو ان لوگوں کی قانونی مدد کے لیے وقف کر دیا۔ اور اب یہ صرف نُور طلبہ کے مقدمات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اپنی دوسری سرگرمیاں انہوں نے تج دی ہیں۔ اور اچھی خاصی آمدنی سے ہاتھ دھو لیے ہیں۔ اس ابتدائی تعارف کے بعد احمد صاحب نے اپنے کام کی تفصیلات بتائیں۔

ان کا ڈرائنگ روم جس میں ہم بیٹھے تھے دو طرح کی کتابوں پر مشتمل تھا، ترکی قانون کی کتابیں اور رسائل نور۔ دیواروں پر بدیع الزماں نورسی مرحوم کی تحریروں کے چارٹ آویزاں تھے۔ اور ترکی خطاطی کا ایک نہایت عمدہ کتبہ بھی زینتِ دیوار تھا جس پر یہ آیت رقم تھی کہ "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون" (جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں)۔ ایک مسلمان قانون دان اور وکالت پیشہ کے لیے یہ کتنی ضروری بات ہے کہ وہ ہر لحظہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے۔ احمد صاحب نے بتایا کہ اس وقت نوری تحریک کے مختلف افراد پر دو سو مقدمات چل رہے ہیں۔ اور یہ مقدمات ایک شہر میں نہیں ہیں بلکہ ترکی کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں دائر ہیں۔ اپنی ڈائری کے مطابق انہوں نے بتایا کہ آج اگر ایک مقدمہ استنبول میں ہے تو کل انقرہ میں، پرسوں ازمیر میں، چوتھے روز برصہ میں، پانچویں روز قونیہ میں، چھٹے روز اسپارٹا میں۔ الغرض انہوں نے تمام بڑے بڑے مقامات گِن دیئے جہاں یکے بعد دیگرے مقدمات دائر ہیں اور انہیں ان تمام جگہوں پر جانا پڑتا ہے۔ اور وہ مہینے کے اکثر ایام باہر رہتے ہیں۔ اور ایک شہر سے دوسرے شہر کا رُخ کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر مقدمات رسائل نور کی اشاعت اور تبلیغ اور ترکی دستور کی خلاف ورزی کی بنا پر قائم ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر گرفتاریاں پولیس کی رپورٹوں کے تحت ہوتی ہیں اور کچھ ری پبلکن پارٹی اور دوسرے لادینی عنصر کی شکایت اور مخبری کی بنا پر۔ باتوں باتوں میں وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرہ اُن کا اصل دارالمطالعہ ہے۔ اس میں انہوں نے متعدد چارٹ اور نقشے لگا رکھے ہیں۔ ایک نقشہ کی طرف

اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ اس میں جہاں جہاں سُرخ ٹوپیوں والے پن لگے ہوئے ہیں
یہ اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ ان جگہوں پر نئے مقدمات دائر ہو چکے ہیں۔
اور مجھے ان کی پیروی کرنی ہے۔ جہاں پیلی ٹوپیوں والے پن لگ رہے ہیں وہاں
ہم مقدمہ لڑ رہے ہیں اور کامیابی کا امکان ہے۔ سبز ٹوپیوں والے پن بتا رہے
ہیں کہ یہاں ہم مقدمہ جیت چکے ہیں۔ اور سیاہ پنوں کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے
رفقاء کو سزا مل چکی ہے اور ہمارا مقدمہ خارج ہو چکا ہے۔ ترکی کا پورا نقشہ
مختلف رنگ کی ٹوپیوں والے پنوں سے بھر رہا تھا۔ شمال، جنوب، مشرق،
مغرب جدھر نظر دوڑائیں کسی نہ کسی رنگ کا پن لگ رہا تھا اور دو تاثرات یکایک
ذہن پر مرتسم ہو جاتے تھے۔ ایک یہ کہ نوری تحریک پورے ترکی میں پھیل رہی ہے
اور ہر بڑے اور چھوٹے شہر میں اس کے نام لیوا بلکہ فدا کار موجود ہیں اور دوسرے
یہ کہ ہر جگہ ان بیچاروں پر آفت ٹوٹ رہی ہے۔ اور دار و گیر اور قید و بند سے
دوچار ہیں۔ میں تو یہ دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ میری اس پژمردگی اور سراسیمگی کو دیکھ
کر وکیل صاحب کہنے لگے۔ اس ابتلاء نے ہمارے جوانوں کو خوفزدہ نہیں کیا بلکہ
ان کے حوصلے مزید بلند ہو گئے ہیں اور جیل جانا ان کے لیے تفریح بن چکا ہے۔
ان کا کردار بھی اس صورتِ حال کی بدولت پختہ سے پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔
اور ہماری دعوت میں مزید جوش و خروش، ولولہ اور جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ دوسری
نوعیت کے چارٹ اور نقشے بھی دیکھے۔ کسی میں دعوت کی رفتار دکھائی گئی ہے
اور کسی میں مخالفت کی رفتار۔ یہ دعوت، یہ ابتلاء، یہ مقدمہ بازیاں اور اس پر
نوریوں کا یہ ولولۂ زیاد ——— یہ سب کچھ دیکھ کر دل بے اختیار گواہی دے

اُٹھا کہ ترکی میں اسلام پھر زندہ ہونے کو ہے۔

سلطان کے شیخ کے قصر میں

کھانے کے بعد دل نے چاہا کہ اس نیک نہاد اور سعادت مند وکیل کیساتھ کچھ اور ساعتیں گزاری جائیں مگر اب وقت تنگ تھا اور ایک دو جگہ جانا ضروری ہے۔ یہ صالح اوزجان کا حکم تھا جسے بادلِ نخواستہ تسلیم کرنا پڑا۔ کچھ دیر کے بعد ہم جناب خلیل ظافر صاحب کے قصر میں پہنچ گئے۔ خلیل ظافر کے والد سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے قصر کے شیخ اور دینی رہنما تھے۔ سلطان عبدالحمید خاں اُن سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ بعد کے خلفاء بھی ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے رہے۔ مگر ان کے صاحبزادے خلیل ظافر پر اِدبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ صالح اوزجان کے بتانے کے مطابق بے چارے دو وقت کی روٹی کے بھی محتاج ہیں۔ اُن کے قصر کی اندرونی دنیا ترکی کے عثمانی دَور کا عکس پیش کرتی ہے۔ ابھی تک اس قصر کے قالین، صوفے، قندیلیں اور کرسیاں وہی ہیں جب یہ قصر "شیخِ سلطان" کی قیام گاہ تھا اور بڑے بڑے وزراء اور حکام یہاں آکر عقیدت کا دم بھرتے تھے۔ قصر کی اُونچی چھتوں والے کشادہ اور چوکور کمرے، بادکشی اور حرارت خیزی کا قدیم نظام، الماریوں میں سجے ہوئے مختلف تحائف و نوادر اور مردانخانے اور زنانخانے کی پُرپیچ تقسیم یہ سب پہلو فکر و نظر پر جادو کا اثر ڈال رہے تھے۔ خلیل ظافر صاحب جن کی عمر اب ۶۰ برس کے لگ بھگ ہو گی انگریزی زبان جانتے ہیں، عربی سے بھی قدرے مس ہے، ترکی کے منجھے ہوئے ادیب ہیں۔ آج کل مولانا محترم کی تفسیر تفہیم القرآن کا ترکی ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کا ترجمہ بالاقساط

ماہنامہ "ہلال" انقرہ میں چھپتا رہتا ہے۔ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ عنقریب کتابی شکل میں چھپ رہی ہے۔ نماز عصر ہم نے اسی قصر میں ادا کی۔ خلیل ظافر صاحب کی اہلیہ نے نماز کے بعد ہمیں چائے پلائی۔ موصوفہ نے خالصتہً ترکی بلکہ عثمانی لباس پہن رکھا تھا۔ ترکی روایت کے مطابق انہوں نے پہلے ترکی قہوہ پیش کیا اور پھر چائے اور ترکی حلوہ۔ خلیل ظافر صاحب نے مولانا محترم کا تمام انگریزی اور ترکی لٹریچر پڑھ رکھا ہے۔ تفہیم القرآن کے ترجمے کے سلسلے میں وہ ترکی زبان کی تفسیریں اور انگریزی میں قرآن کریم کے تراجم کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ مگر انہوں نے تفہیم القرآن کے ساتھ اس قدر اپنی شدید گرویدگی کا اظہار کیا، بتانے لگے کہ تفہیم القرآن میں جس طرح قرآن کو پیش کیا گیا ہے اور قرآن کی دعوت کو جس قدرت کے ساتھ واضح کیا گیا ہے وہ مجھے کسی تفسیر میں نہیں ملا۔ میری یہ آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مکمل تفہیم القرآن کو ترکی زبان میں منتقل کرنے کی توفیق دے۔

دیس کی جانب

وقت کی کمی کے پیش نظر یہ مجلس مختصر کر دی گئی۔ خلیل ظافر صاحب بھی تیار ہو گئے تاکہ ہوائی اڈے پر مولانا محترم سے ملاقات کریں۔ ہم واپس سپاہی ہوٹل گئے اور سامان اٹھا کر ہوائی اڈے کو چل دیئے۔ ہوائی اڈے پر پہنچے تو ترک احباب کا ایک گروہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ یہ لوگ مولانا محترم سے ملنے آئے تھے۔ اُن میں انقرہ کے بعض احباب بھی شامل تھے۔ معلوم ہوا کہ مولانا محترم کا جہاز پہنچ چکا ہے۔ اور مولانا ائرپورٹ کی انتظار گاہ میں تشریف لا چکے ہیں۔ یہ خبر

ہوائی اڈے کے مسافروں میں فوراً اچھل گئی۔ ترک دوست ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے کہ حضرت مودودی لندن سے کامیاب علاج کرانے کے بعد واپس پاکستان مراجعت فرما رہے ہیں۔ ان کے العطش العطش کرتے چہرے، اور دلوں کی آرزوئے بیتاب اور کچھ بے ساختہ زبان پر آجانے والی التجائیں یہ چاہ رہی تھیں کہ حضرت مودودی ان کے گھر میں بھی رونق بخشیں، مگر یہ سب کچھ ایک طرف۔ دوسری طرف ان کی خوشی اس بات پر تھی کہ پاکستان میں جو خلفشار برپا ہو چکا ہے اور تحریکِ جمہوریت نے اسلام اور سوشلزم کے درمیان کشمکش کا رُخ اختیار کر لیا ہے اس موقع پر مولانا محترم کا پاکستان میں ہونا نہایت ضروری ہے۔

انتظار گاہ میں داخل ہوئے تو مولانا محترم کے چہرے پر یکایک نگاہ پڑی۔ ان کے ساتھ ہمارے لندن کے دوست جناب رشید صدیقی (سیکرٹری یو کے اسلامک مشن) بھی موجود تھے۔ مولانا محترم کو دیکھتے ہی آنکھیں خوشی کے اشکوں میں ڈوب گئیں۔ ترک احباب حسبِ عادت مولانا محترم کے دست و جبین کو بوسے دیتے رہے۔ وقفہ چند گھڑیوں سے زیادہ نہ تھا۔ اور شوق تلاطم خیز تھا۔ اتحاد استنبول کے نامہ نگار نے انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ صالح اوزجان ترجمان تھے۔ باتوں ہی باتوں میں اعلان ہو گیا کہ جہاز پرواز کرنے والا ہے۔ اور یوں "یہ فرصت یک دو ساعت" نسیمِ بہار کی اُس موج کی طرح گذر گئی جس کے انتظار میں کلیوں نے گِن گِن کر ساعتیں گزاری تھیں مگر اس کے جانے کے بعد حسرت و وارفتگی سے ان کے مُنہ کُھلے کے کُھلے رہ گئے۔

راستہ میں کویت کے ائرپورٹ پر جہاز ۴۰ منٹ کے لیے رُکا یہاں

بھی کویت کے دوستوں کا جمِ غفیر موجود تھا۔ تہائی رات گزر چکی تھی۔ بایں ہمہ جیسے جیسے اطلاع ملی وہ سیدھا ہوائی اڈے پہنچ گیا۔ یہی صورت ظہران (سعودی عرب) کے ائرپورٹ پر پیش آئی۔ وہاں بھی نصف شب ہو جانے کے باوجود الخبر اور الظہران کے پاکستانی اور عرب رفقاء چشم براہ تھے۔ چالیس پچاس کا مجمع تھا۔ ہر شخص خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب مولانا علاج کے لیے لندن روانہ ہو رہے تھے تو دھڑکتے دلوں اور غم ناک آنکھوں سے لوگوں نے آپ کو رخصت کیا تھا۔ اور عالمِ اسلام کا ہر اسلام دوست شخص سراپا دعا و التجا تھا۔ اور اب یہ ہے کہ مسرت و انبساط کی تموج آفرینی نے فضا کو رُوح پرور بنا دیا ہے۔ ہر شخص کا چہرہ کھِلکھِلا رہا ہے۔ خزاں رخصت ہوئی اور بہار آ گئی۔ شگفتگی نے پژمردگی کی جگہ لے لی۔ اور صبحدم جب ہمارا جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو انسانوں کا بحرِ تلاطم تھا۔ اور نعروں نے فضا میں ارتعاش پیدا کر رکھا تھا ——— سیّد مودودی زندہ باد ——— مفکرِ اسلام زندہ باد ——— تاریخ نے یہ منظر ۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کی صبح کو دیکھا۔

شجرۂ نسب سلاطینِ آلِ عثمان

ارطغرل

|

عثمان غازی

(۱۳۰۰ — ۱۳۲۶ء)

|

اورخان

(۱۳۲۶ — ۱۳۵۹ء)

|

مراد اوّل

(۱۳۵۹ — ۱۳۸۹ء)

|

بایزید اول

(۱۳۸۹ — ۱۴۰۲ء)

سلیمان
متنازع حکومت ۱۴۱۱ء تک

محمد اول
(۴۰۲ — ۱۴۲۱ء)

موسیٰ
متنازع حکومت ۱۴۱۳ء تک

|

مراد ثانی

(۱۴۲۱ — ۱۴۵۱ء)

|

محمد ثانی (فاتح)

(۱۴۵۱ — ۱۴۸۱ء)

بایزید ثانی
(۱۴۸۱ — ۱۵۱۲ء)

جم
متنازع حکومت ۱۴۸۲ء تک

سلیم اول
(۱۵۱۲ — ۱۵۲۰ء)

احمد
متنازع حکومت ۱۵۱۳ء تک

سلیمان اول قانونی
(۱۵۲۰ — ۱۵۶۶ء)

سلیم ثانی
(۱۵۶۶ — ۱۵۷۴ء)

مراد ثالث
(۱۵۷۴ — ۱۵۹۵ء)

محمد ثالث
(۱۵۹۵ — ۱۶۰۳ء)

احمد اول
(۱۶۰۳ — ۱۶۱۷ء)

مصطفیٰ اول
۱۶۱۷ — ۱۶۱۸ — ۱۶۲۲ — ۱۶۲۳ء

عثمان ثانی
(۱۶۱۸ — ۱۶۲۲ء)

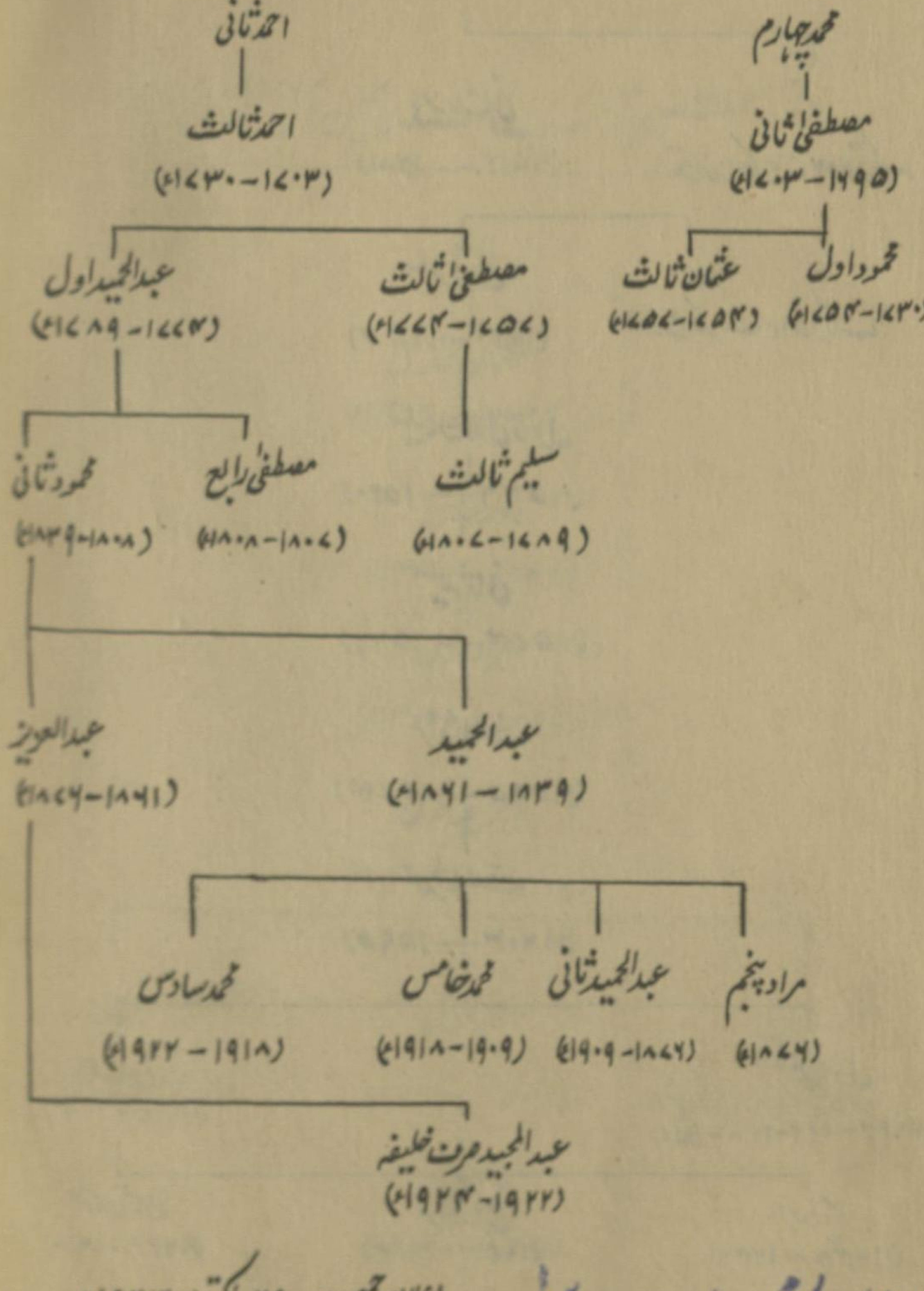
مراد رابع
(۱۶۲۳ — ۱۶۴۰ء)

ابراہیم
(۱۶۴۰ — ۱۶۴۸ء)

محمد رابع
(۱۶۴۸ — ۱۶۸۷ء)

سلیمان ثانی
(۱۶۸۷ — ۱۶۹۱ء)

احمد ثانی
(۱۶۹۱ — ۱۶۹۵ء)



اعلان جمہوریہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء

خلافت کا مکمل خاتمہ ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء